کلیاتِ حفیظ جالندھری

ترتیب و تدوین

خواجہ محمد زکریا

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

-----◇◇◇◇◇◇◇◇◇◇-----

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلیاتِ حفیظ جالندھری

کلیاتِ
حفیظ جالندھری

مرتب

خواجہ محمد زکریا

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
NEW DELHI-110002

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

کلیاتِ حفیظ جالندھری

مرتب: خواجہ محمد زکریا

صفحات: ۸۴۰ سائز: 23x36/16 قیمت: -/۳۲۰

باہتمام: محمد ناصر خان

Kulliyat-E-Hafeez Jalandhari

Compiled by:
Khawaja Muhammad Zakariya

Pages: **840** Ist Edition: 2008

Price: **Rs. 320/-**

ناشر

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2
Phones: 23247075, 23289786, 23289159 Fax: 23279998

OUR BRANCHES:

DELHI

□ Farid Book Depot (P) Ltd.
422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6 Ph.: 23256590

MUMBAI

□ 208, Sardar Patel Road, Near Khoja Qabristan,
Dongri, Mumbai-400009 Ph.: 022-23731786, 23774786

Printed at: Farid Enterprises, Delhi-2

انتساب

کلامِ حفیظ کے چار منفرد دیباچہ نگاروں
کے نام

احمد شاہ بخاری (پطرس)

ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر

پنڈت ہری چند اختر

میرزا محمد منور

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

سعدیؔ

ترتیب

مقدمہ	خواجہ محمد زکریا	۲۳

نغمہ زار

ارشادِ گرامی		۴۳
ایک اور بقلم خود		۴۴
دیباچہ	سیّد احمد شاہ بخاری پطرسؔ	۴۵
دیباچہ	ڈاکٹر ایم - ڈی - تاثیرؔ	۴۷

ترنم

عشق بھی حسن ہے	۵۹
سحر	۶۱
فرصت کی تمنا میں	۷۰
چاند کی سیر	۷۲
عصمت	۷۵
ابھی تو میں جوان ہوں	۷۶
برسات	۸۰
کرشن کنھیا	۸۶
طوفانی کشتی	۹۰
بسنتی ترانہ	۹۵
فرقتِ یار میں	۹۷
زندگی	۹۹

آزاد وادی ۱۰۱
بہشت بریں ۱۰۴
بے جا ۱۰۶
عید کا چاند ۱۰۸
تاروں بھری رات ۱۱۱
سخت گیر آقا ۱۱۵

تغزل

مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں ۱۱۷
دور سے آنکھیں دکھاتی ہے نئی دنیا مجھے ۱۱۸
حسنِ صورت میں نہیں دلبستگی میرے لیے ۱۱۹
میں کیا ہوں اس خیال سے لگتا ہے ڈر مجھے ۱۲۱
عشق کے ہاتھوں یہ ساری عالم آرائی ہوئی ۱۲۳
موت کے چہرے پہ ہے کیوں مردنی چھائی ہوئی ۱۲۴
دنیا مجھے کہتی ہے اللہ کا دیوانہ ۱۲۵
آنکھوں میں دل ہے دل میں اُمیدِ وصال ہے ۱۲۶
آ ہی گیا وہ مجھ کو لحد میں اتارنے ۱۲۸
مردہ دلوں کو حشر بھی آیا پکارنے ۱۲۹
آنے والے جانے والے ہر زمانے کے لیے ۱۳۰
یہ افتادِ بشر اندے کی موجِ بے کراں ہو کر ۱۳۲
کسی کے روبرو بیٹھا رہا میں بے زباں ہو کر ۱۳۳
اس بزم میں آخر شعراء ہیں کہ نہیں ہیں ۱۳۴
شیخ کعبے سے پلٹ آئے خدا کو دیکھ کر ۱۳۵
وہ ابر جو مے خوار کی تربت پہ نہ برسے ۱۳۷
ہم دورِ نو کو دیکھ کے خاموش ہو گئے ۱۳۹

تیر چلنے پہ نہ آنا کہ خطا ہو جانا ۱۴۱
حیران نہ ہو دیکھ میں کیا دیکھ رہا ہوں ۱۴۳
وہ ہوئے پردہ نشیں انجمن آرا ہو کر ۱۴۵
رنگ بدلا یار نے وہ پیار کی باتیں گئیں ۱۴۶
دو روز میں شباب کا عالم گزر گیا ۱۴۷
عاشق سا بد نصیب کوئی دوسرا نہ ہو ۱۴۹
جلوۂ حسن کو محروم تماشائی کر ۱۵۱
بتوں نے یا خدا نے مار ڈالا ۱۵۲
رائج یہ کہیں مذہب گفتار نہ کر دے ۱۵۳
دلِ بے مدعا ہے اور میں ہوں ۱۵۴
مٹایا تو نے مجھ کو جوشِ ایماں دیدہ خواہد شد ۱۵۵
عشق نے عقل کو دیوانہ بنا رکھا ہے ۱۵۷
امیدیں آرزوئیں کھیلتی ہیں یوں مرے دل سے ۱۵۸
حال میرا دمبدم نوعِ دگر ہوتا گیا ۱۵۹
یہ بات نہ تھی پہلے اب مجھ کو ہوا کیا ہے ۱۶۱
چلے تھے ہم کہ سیرِ گلشن ایجاد کرتے ہیں ۱۶۳
برہمن جس دن عدوئے ما و من ہو جائے گا ۱۶۵
لہو رلوا گئی سیرِ بہارِ گلستاں مجھ کو ۱۶۷
ہے قفس میں جو ازل ہی سے نشیمن میرا ۱۶۹
مضحکہ آؤ اڑائیں عشقِ بے بنیاد کا ۱۷۱
مجاز میں حقیقت ہے با مدعا کے لیے ۱۷۳
نہ جب تک جلوۂ کن واقفِ تبدیلِ امکاں تھا ۱۷۵
بہت شوریدہ سر تھا میں بہت محشر بداماں تھا ۱۷۷
ذرا انصاف کر او میری صورت دیکھنے والے ۱۷۹

شیخ کا خوف ہمیں حشر کا دھڑکا ہم کو ۱۷۹
اُلفت ہوئی ہوئی وہ ہوا بے وفا ہوا ۱۸۱
اب راز کھل رہے ہیں ضبطِ غمِ نہاں کے ۱۸۲
عشق میں چھیڑ ہوئی دیدۂ تر سے پہلے ۱۸۳
دنیائے حسن و عشق میں یہ امتیاز ہے ۱۸۵
فلک سے آج شورِ نعرۂ مستانہ آتا ہے ۱۸۶
مجھے بھی آج ان سے بات کرنے میں حجاب آیا ۱۸۸
قرینِ مصلحت ہے چند سجدے قبلہ رُو کر لوں ۱۸۹
کمبخت دل برا ہو تری آہ آہ کا ۱۹۰
یہ کیسی بجلیاں سی کوندتی ہیں میرے شیون میں ۱۹۲
مری آنکھیں ہیں ساقی پر مری نیت ہے کوثر میں ۱۹۳
اٹھ اٹھ کے بیٹھ بیٹھ گئے پھر رواں رہے ۱۹۴
بے تعلق زندگی اچھی نہیں ۱۹۶
وہ قافلہ آرام طلب ہو بھی تو کیا ہو ۱۹۷
وہ ہم نہیں کہ مریں عمرِ جاوداں کے لیے ۱۹۸
اے برہمن مجھے زنار سے کیا کام ابھی ۱۹۹
تو قریبِ رگِ جاں بھی ہے بہت دور بھی ہے ۲۰۰
کفر کی دل شکنی ہم نہیں کرنے والے ۲۰۱
حشر کے اقرار پر یا طور کے انکار پر ۲۰۲
یوں تراز و مرے دل میں ترا پیکاں ہوگا ۲۰۴
اٹھو اب دیر ہوتی ہے وہاں چل کر سنور جانا ۲۰۵
شبِ فرقت قرارِ جانِ مضطر ہو تو کیونکر ہو ۲۰۷
یار پہلو میں نہیں ویرانہ ہے میخانہ آج ۲۰۸
دوستی کا چلن رہا ہی نہیں ۲۱۰

ابھرے جو خاک سے وہ تہِ خاک ہو گئے ۲۱۱
مری بے مائیگی شرما رہی ہے اہلِ گلشن سے ۲۱۲
چلی ہے جان یادِ رفتگاں میں ۲۱۳
اگر یہ حضرتِ دل عشق سے حذر کرتے ۲۱۴
مدتوں تک جو پڑھایا کیا استاد مجھے ۲۱۵
کہا شیریں نے رو کر لاشۂ فرہاد کے آگے ۲۱۶
پھر لطفِ خلش دینے لگی یاد کسی کی ۲۱۷
چکر ہے پاؤں میں بھی سودا بھی میرے سر میں ۲۱۹

سوز و ساز

دیباچہ — پنڈت ہری چند اختر ۲۲۳
منظومات ۲۳۹
مدینے کے مسافر ۲۴۱
راوی میں کشتی ۲۴۴
شامِ رنگیں ۲۴۷
چناب ۲۵۰
ہمالیہ ۲۵۴
صبح و شام کوہسار۔ صبح - شام - شاعر ۲۵۶
شہسوارِ کربلا ۲۶۲
لاہور ۲۶۵
توبہ نامہ ۲۶۷
گیت ۲۶۹
جاگ سوزِ عشق جاگ ۲۷۰
کرشن بنسری ۲۷۳
دل ہے پرائے بس میں ۲۷۵

پرانی بسنت	۲۷۸
پریت کا گیت	۲۸۰
سپنا	۲۸۴
اُلفت کا اظہار	۲۸۵
اندھی جوانی	۲۸۷
حسن اور موت	۲۹۰
کابل کا گیت	۲۹۵
مرثیے - (چلی ہے جان یادِ رفتگاں میں)	۳۰۰
والدہ کی موت	۳۰۱
غروبِ آفتاب سخن (گرامی)	۳۰۵
ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح (محمد علی جوہر)	۳۱۱
ننھی اصغری	۳۱۸
موت کا قافلہ	۳۲۱
ایک اور شام رنگیں	۳۲۵
عصائے پیری	۳۲۷
نیندوں کی بستی	۳۲۹
ایک لڑکی شاداں	۳۳۱
ارشاد کی یاد میں	۳۳۴
حریم دل - (کوثر چکد از لبم......)	۳۳۵
عیدِ میلاد النبی	۳۳۶
ہلال عید	۳۳۹
شہیدوں کی عید	۳۴۳
ہماری عید	۳۴۵
میرا اسلام لے جا	۳۴۷

گلشنِ جنت ۳۵۱

متفرق نظمیں ۳۵۳

تین نغمے ...... ٹیگور ...... اقبال ...... حفیظ ۳۵۴

جوہرِ ذاتی ۳۶۱

درۂ خیبر ۳۶۳

آخری رات ۳۶۶

رقاصہ ۳۶۹

کنجوس سرمایہ دار ۳۷۳

رومان ۳۷۵

عرفان ۳۸۰

تکیہ ۳۸۳

غزلیات - (زخمہ برتارِ رگِ جاں میزنم) ۳۸۴

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کردے ۳۸۵

ایسا سبق مرے رفقا دے گئے مجھے ۳۸۷

وفاداریاں سخت نادانیاں ہیں ۳۸۸

حسن نے سیکھیں غریب آزاریاں ۳۸۹

مل جائے مے تو سجدۂ شکرانہ چاہیے ۳۹۰

میرے خیال و خواب کی دنیا لیے ہوئے ۳۹۱

نہ کر دل جوئی اے صیاد میری ۳۹۲

خردمندو! خرد سے دُور ہوں میں ۳۹۳

نہ دردِ محبت نہ جوشِ جوانی ۳۹۴

گنہ کے بعد بشر عجز اختیار کرے ۳۹۵

نگاہِ آرزو آموز کا چرچا نہ ہو جائے ۳۹۶

نا آشنا نہیں رہ و رسمِ جہاں سے ہم ۳۹۷

زندگی کا لطف بھی آ جائے گا ۳۹۸
اُمیدیں مٹ گئیں آخر ہجومِ یاس وحرماں میں ۳۹۹
اے دوست مٹ گیا ہوں، فنا ہو گیا ہوں میں ۴۰۱
مٹنے والی حسرتیں ایجاد کر لیتا ہوں میں ۴۰۲
ہے ازل کی اس غلط بخشی پہ حیرانی مجھے ۴۰۳
محبت کی دنیا میں سب کچھ حسیں ہے ۴۰۴
اُس شوخ نے نگاہ نہ کی ہم بھی چپ رہے ۴۰۵
سمجھا ہوا ہوں شوئی دستِ دعا کو میں ۴۰۶
ابھی چاہتا ہوں بہت روز جینا ۴۰۷
کل ضرور آؤ گے، لیکن آج کیا کروں ۴۰۸
ملا بھی درد بھرا دل تو کیا، ملا نہ ملا ۴۰۹
اُن کو جگر کی جستجو اُن کی نظر کو کیا کروں ۴۱۰
حیاتِ جاوداں والے نے مارا ۴۱۱
چاند اور ستاروں کا یہ سماں کیا دلکش اور سہانا ہے ۴۱۲
جب سے دیکھا ہے جل مرنا ننھی جانوں کا ۴۱۳
کیا ہو گئیں وہ عہدِ فراغت کی مستیاں ۴۱۴
دل کو ویرانہ کہو گے مجھے معلوم نہ تھا ۴۱۵

تلخابۂ شیریں

غزلیات

تو ہی بھروسا، تو ہی سہارا ۴۲۰
ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے ۴۲۱
جوانی کے ترانے گا رہا ہوں ۴۲۲
جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں ۴۲۳
مرے مذاقِ سخن کو سخن کی تاب نہیں ۴۲۴

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے ۴۲۶
یا عقل کی افتاد سے دیوانہ بنا دے ۴۲۸
وفا جس سے کی بے وفا ہو گیا ۴۳۰
اب ساز گار کیا مجھے نا ساز گار کیا ۴۳۱
اب وہ نوید ہی نہیں صورتِ ہزار کیا کرے ۴۳۲
دل ابھی تک جوان ہے پیارے ۴۳۳
او دل توڑ کے جانے والے دل کی بات بتاتا جا ۴۳۴
کوئی دوا نہ دے سکے مشورۂ دعا دیا ۴۳۶
لب شکر چارہ ساز کا نغمہ لیے ہوئے ۴۳۸
کیوں ہجر کے شکوے کرتا ہے کیوں درد کے رونے روتا ہے ۴۴۰
آخر ایک دن شاد کرو گے ۴۴۱
حسن پابند رضا ہو مجھے منظور نہیں ۴۴۲
اپنے ہی دل کو مار لیا مار مار کے ۴۴۴
مجھے شاد رکھنا کہ ناشاد رکھنا ۴۴۶
کبھی زمیں پہ کبھی آسماں پہ چھائے جا ۴۴۷
میری کوئی خطا نہیں مجھ پر خفا نہ ہو ۴۴۸
ذکر بیدادِ بتاں پیش خدا کیا ہو گا ۴۵۰
بتوں کی کوئی بات سچی نہ مانیں ۴۵۲
نہ چلے گی حشر کے دن یہ تری سخن طرازی ۴۵۳
حسینوں کو ہم اپنے قتل میں شامل سمجھتے ہیں ۴۵۵
بہت ہی مختصر ہے داستانِ گمرہی اپنی ۴۵۷
عشق نے حسن کی بیداد پہ رونا چاہا ۴۵۹
نہ پیتا ہوں نہ پینا چاہتا ہوں ۴۶۱
جن کا ظہور ہو نہ سکا مہر و ماہ میں ۴۶۲

ان گیسوؤں میں شانۂ ارماں نہ کیجیے ۴۶۳
ناکامیِ عشق یا کامیابی ۴۶۵
رُت سنگیت ۴۶۶
تیری منزل دور ۴۶۷
منجدھار ۴۸۱
درشن درشن ۴۸۵
بسنت رُت ۴۸۷
گھر پھونک تماشا ۴۹۱
منتر ۴۹۳
افرنگ کی دنیا ۴۹۵
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے ۴۹۶
نیرنگِ فرنگ ۵۰۸
محض بہرِ مضحکہ ۵۱۹
شکاری اور شکار ۵۲۱
شیروں کو آزادی ہے…… ۵۲۲
عزمِ آدم ۵۲۸
دیوانہ بکار…… ۵۳۰
اب خوب ہنسے گا دیوانہ - گرم جوشی ۵۳۱
اب خوب ہنسے گا دیوانہ - سرد مہری ۵۳۶
کدھر جاتا ہے دیوانے ۵۴۱
رُومان و عرفان ۵۴۲
نغمۂ تصویر ۵۴۳
نعرۂ تکبیر ۵۴۵

میری جوانی ۵۴۷
کیا ہوں میں ۵۵۳
میرا کلام بہتریں ۵۵۵
بکوشید ۵۵۹
میری شاعری ۵۶۰
یارانِ تیز گام ۵۶۷
وفات کی برات ۵۶۸
آغا حشر ۵۷۰
سر سید راس مسعود ۵۷۳
اقبال - زندگی میں ۵۷۵
اقبال کی خبر مرگ ۵۸۰
اقبال کے مزار پر ۵۸۱
ہم سفر ۵۸۳
تعمیر و تخریب ۵۸۴
بنجارہ پربت ۵۸۵
ایک مہذب شہر ۵۹۱
تقدیر کشمیر ۵۹۳
تصویرِ کشمیر ۵۹۴
خون کے چراغ ۶۱۱
لبیک ۶۱۵
غرور ۶۱۶
عجز ۶۱۷

چراغ سحر

انتساب		۶۲۱
مقدمہ-	مرزا محمد منور	۶۲۳
دیباچہ (منظوم)	حفیظ جالندھری	۶۵۳
غزلیات		۶۵۵
مجھ سے برتر بھی تو بندوں میں گنہگار بتا (حمدیہ)		۶۵۶
یہ کیا مقام ہے وہ نظارے کہاں گئے		۶۵۸
کیا پوچھتے ہو آج سے پہلے کہاں رہے		۶۶۰
اب تو کچھ اور بھی اندھیرا ہے		۶۶۱
کوئی چارہ نہیں دُعا کے سوا		۶۶۲
سمٹ آئے ہیں گھروں میں ویرانے		۶۶۳
دوستی، دوست، یار، یارانے		۶۶۴
اگر موج ہے نہ بیچ دھارے چلا چل		۶۶۵
عرضِ ہنر بھی وجہِ شکایات ہو گئی		۶۶۶
جس کو مجھ میں بھی کوئی بات نظر آتی ہے		۶۶۸
خدا پر دیکھ کر میری نگاہیں		۶۷۱
یہ اور دور ہے اب اور کچھ نہ فرمائے		۶۷۲
ان تلخ آنسوؤں کو نہ یوں منہ بنا کے پی		۶۷۳
دور یہ ہے کہ دورے بھی نہیں		۶۷۴
غم موجود ہے آنسو بھی ہیں کھا تو رہا ہوں پی تو رہا ہوں		۶۷۵
آسماں بیداد ہی کرتا رہا		۶۷۶
آخر مجھے یہ کام بھی کرنا ہی پڑے گا		۶۷۷
وابستۂ شجر ہوں اسی انتظار میں		۶۷۸

زندگی سے نباہ مشکل ہے	۶۷۹
ترے دل میں بھی ہیں کدورتیں ترے لب پہ بھی ہیں شکایتیں	۶۸۰
اس دلدہی کا مقصد اے خیرخواہ کیا ہے	۶۸۱
آہ بیداری کو بھی خوابِ پریشاں کردیا	۶۸۳
جھگڑا دانے پانی کا ہے دام وقفس کی بات نہیں	۶۸۴
تجھ پہ قربان ہو ایمان یہ ناممکن ہے	۶۸۶
شکستِ شیشہ وساغر کا رنج کیا ساقی	۶۸۷
مشاعرہ ہو تو سب شیخ وشاب پیتے ہیں	۶۸۸
محتسب کیفیتِ پیرِ مغاں کھلتی نہیں	۶۸۹
اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی	۶۹۱
دوستانہ تعلقات کی بات	۶۹۳
توبہ ہے آہ میری توبہ ہے	۶۹۴
ہے خزاں بھی دم بخود رنگِ گلستاں دیکھ کر	۶۹۵
قولاً تو ہم بھی مے کے لیے ہاں نہ کر سکے	۶۹۶
عطا ہوا یہ شرف بزمِ دوستاں سے مجھے	۶۹۸
دل سے ترا خیال نہ جائے تو کیا کروں	۷۰۰
شگفتن سے فسردن کم نہیں ہے	۷۰۲
ہوں زمیں پر حیات باقی ہے	۷۰۳
ہماری طرف اب وہ کم دیکھتے ہیں	۷۰۴
میں جو آماجگاہ بن بیٹھا	۷۰۶
یہ ملاقات ملاقات نہیں ہوتی ہے	۷۰۷
اس نئے دن کو ہوں میں رات سمجھنے والا	۷۰۹
پناہِ زندگانی ڈوب مرنے کے سوا کیا تھی	۷۱۲

جرس کی ہر صدا اب رائگاں ہے ۷۱۴
تلاشِ مدعا ہے اِدّعا کو چھوڑ آیا ہوں ۷۱۵
ہم جس مقام پر ہیں وہاں سب مزے میں ہیں ۷۱۷
کیسے بند ہوا میخانہ اب معلوم ہوا ۷۱۹
دوست بن جاتے ہیں کیوں اعدائے دوست ۷۲۱
نہ پوچھو کہ انسان کیا چاہتا ہے ۷۲۳
پار اُترا ہوں کس قرینے سے ۷۲۴
سوجھی کیوں تھی پیش و پس کی ۷۲۵
خون بن کر مناسب نہیں دل بہے ۷۲۶
جان قربان کیوں نہ ہو جائے ۷۲۷
تلخی کا سبب میری سمجھ میں نہیں آتا ۷۲۸
شاعر لوگ ہیں کیوں دیوانے یہ فرزانے کیا جانیں ۷۳۰
یہ اندھیرا گھر یہ تنہائی مری ۷۳۱
کچھ مزا آنے لگا اب دوستو ۷۳۲
دریچے (تین تین شعر) ۷۳۳
آویزے (دو دو شعر) ۷۳۴
آئینے (فردیات) ۷۳۸
باب نظمیات ۷۳۹
اصنافِ نظم۔ چند وضاحتیں۔ (حفیظ) ۷۴۰
سلام اور پرنام ۷۴۳
ترانۂ پاکستان ۷۴۴
معجزہ ۷۴۶
نئے دور میں ۷۴۹

نصرتِ پروردگار آ ہی گئی ۷۵۲
آزادی کی اوّلیں عید الفطر ۷۵۳
زندہ باد پاکستان ۷۵۴
خطبۂ صدارت ۷۵۵
اے قائدِ اعظم ۷۶۱
ترانۂ آزاد کشمیر ۷۶۶
آزادی کی اوّلیں عیدِ قرباں ۷۶۷
ہم قسم کھاتے ہیں ۷۶۹
ترانۂ جہانہ ۷۷۱
نشاط زدگان ۷۷۵
روز روشن رات کے آغوش میں (رحلتِ قائدِ اعظم) ۷۷۶
مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ ۷۷۹
سقوطِ حیدر آباد — بے اثر فریاد ۷۸۰
جزیرے ۷۸۲
فرعونِ بے ساماں ۷۸۴
حبشنوں کا ثقافتی ناچ ۷۸۵
مرگِ تاثیر کلام ۷۸۸
گفتار و کردار ۷۸۹
بے اثر ابوالاثر ۷۹۱
کیا ہوں میں ۷۹۳
ارشادِ ہمزاد ۷۹۴
سبز گنبد سے اِک صدا آئی ۷۹۶
سبز گنبد کا مکیںؐ ۷۹۸

اے وجدان	۷۹۹
جس کی یہ تصویر ہے	۸۰۰
جواں اقبالوں کا اقبال	۸۰۱
حمید نظامی	۸۰۲
نوائے وقت	۸۰۴
اسلام کا احسان فراموش نہیں میں	۸۰۵
تیرے لیے اے پاکستان	۸۰۶
ہے کوئی ؟	۸۰۸
وفاتِ شیخ سر عبدالقادر	۸۰۹
محسن زبانِ پاکستان	۸۱۳
عطاء اللہ شاہ بخاری	۸۱۴
پاکستانی ترانہ اور عدالتِ عالیہ	۸۱۵
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ	۸۱۷
پابہ زنجیر	۸۲۲
سات تاریخی شیر	۸۲۵
اندھیرے اُجالے	۸۲۶
اِک دن ہم بھی جیتیں گے	۸۲۷
شہری لہری زنخے	۸۲۸
ہر سخنور تنہا	۸۲۹
ناتمام افسانے	۸۳۰
اشاراتِ فتح خود شکستن	۸۳۶
بشارات	۸۳۸
آخرکار	۸۴۰

مقدمہ

علامہ اقبال نے اُردو کی پابند نظم کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا تھا۔ ان کے نوجوان معاصرین نے اس کے افقی پھیلاؤ میں حصہ لیا۔ حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی نے اپنے اپنے انداز میں پابند نظموں کو مقبول بنایا۔ حفیظ اور جوش کا آغاز رومانی شاعری سے ہوا لیکن بعد ازاں انھوں نے بہت سے دیگر موضوعات پر نظمیں لکھیں اور ہیئتوں کے نئے تجربات بھی کیے۔ اختر شیرانی کا آغاز و انجام رومانی شاعر کے طور پر ہوا۔ اقبال کے آخری دور میں نمایاں ہونے والے یہ تینوں شاعر اہل ادب ہی میں نہیں، عوام میں بھی بہت مقبول ہوئے اور ان میں سے ہر ایک کا نام کسی بھی مشاعرے کی کامیابی کا ضامن سمجھا جاتا تھا۔

حفیظ جالندھری کی اوّلیں اہمیت ان کے متعدد شعری تجربات کی وجہ سے ہے۔ ان تجربات سے ان کے نوجوان معاصرین متاثر ہوئے۔ میرا جی، فیض اور راشد جیسے اہم شعرا نے ان سے متاثر ہونے کا اقرار کیا ہے۔ رفتہ رفتہ انگریزی شاعری کے اثرات اُردو شاعری پر بڑھتے چلے گئے۔ آزاد نظموں کا رجحان پھیلتا چلا گیا لیکن حفیظ نے اس رجحان پر ایک آدھ بار نگاہِ غلط انداز ڈالی اور پھر اپنے پرانی روش پر گامزن ہو گئے۔ حفیظ کا انتقال 1982ء میں ہوا۔ ان کا آخری شعری مجموعہ 1972ء میں مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد انتقال تک انھوں نے بہت کم لکھا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ان کی قابلِ ذکر شاعری کا آغاز 1920ء کے اردگرد ہوا اور تقریباً پچاس سال تک جاری رہا۔ جو دعویٰ انھوں نے انتقال سے کئی سال پہلے اپنے ایک شعر میں کیا، وہ بالکل بجا ہے:

تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی حفیظؔ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

حفیظؔ کی زندگی کا ابتدائی حصہ چنداں خوشگوار نہیں گزرا۔ وہ 14 جنوری 1900 کو جالندھر (موجودہ بھارتی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کی اپنی تحریروں کے مطابق ان کا تعلق راجپوتوں سے ہے۔ ان کے بزرگ مغل بادشاہ فرخ سیر کے دورِ حکومت (1713ء تا 1719ء) میں مسلمان ہو گئے تھے۔ بادشاہ نے انھیں جالندھر میں جاگیر عطا کی جو حفیظؔ کے اپنے بیان کے مطابق 1857ء میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم میں ضبط کر لی گئی۔ حفیظؔ کے دادا مہر الدین اسلحے کا کاروبار کرتے تھے اور ان کے بیٹے شمس الدین (حفیظ کے والد) کاروبار میں اپنے والد کی مدد کرتے تھے۔ شمس الدین نے دو شادیاں کیں۔ حفیظؔ ان کی دوسری بیوی بتول کی پہلی اولاد تھے۔ سوتیلے بہن بھائی بھی موجود تھے۔ گھر کے حالات ناخوشگوار تھے۔ ایک بے اولاد رشتہ دار خاتون نے انھیں متبنیٰ بنا لیا۔ انھوں نے پہلے مسجد میں قرآن ناظرہ اور ابتدائی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ دو سال کے بعد انھیں امریکی مشن اسکول میں داخل کرایا گیا لیکن وہاں دل نہ لگا۔ یکے بعد دیگرے کئی اسکول تبدیل کیے مگر تعلیم میں دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔ آخر ساتویں جماعت کا امتحان دے کر سلسلہ تعلیم منقطع کر دیا۔

چند سال تک مختلف کام کیے۔ ریلوے میں ٹائم کیپنگ، خیاطی، عطر فروشی، مزدوری وغیرہ کی مگر مستقبل کا یہ شاعر ان کاموں سے مطمئن نہ ہو سکا۔ 1917ء میں خالہ زاد کے ساتھ شادی ہوئی۔ گزر اوقات کے لیے فوجی وردیاں بنانے کا ٹھیکہ لیا۔ اس کے بعد اوکاڑہ میں سنگر مشین کمپنی کے اہلکار کے طور پر کام کیا مگر کامیابی ہنوز دور تھی۔

اس کے بعد ان کی ادبی صحافت سے وابستگی کا دور شروع ہوا۔ انھوں نے سب سے پہلے جالندھر سے رسالہ ''اعجاز'' جاری کیا جو پانچ شماروں سے زیادہ نہ چل سکا۔ 1922ء میں حفیظ لاہور آئے اور پھر یہیں بس گئے۔ پہلے ماہنامہ ''شباب اُردو'' میں ملازم ہوئے۔ پھر ''ہزار داستان'' اور ''نونہال'' سے وابستہ ہوئے مگر کہیں بھی چند ماہ سے زیادہ نہ رہ سکے۔

دارالاشاعت پنجاب لاہور کے سید ممتاز علی (پدرِ امتیاز علی تاج) نے عورتوں کے لیے رسالہ ''تہذیبِ نسواں'' اور بچوں کے لیے اخبار ''پھول'' جاری کر رکھے تھے' ان کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہاں بھی قیام عارضی ثابت ہوا۔ 1926ء میں سر عبدالقادر نے ''مخزن'' ان کے سپرد کر دیا۔ 1930ء میں ہفت روزہ ''کارزار'' نکالا۔ اس سے پہلے انجمن حمایت اسلام کے اخبار ''حمایتِ اسلام'' کی ادارت بھی کر چکے تھے۔ اگرچہ حفیظ صحافت سے تادیر وابستہ نہ رہ سکے لیکن چند سال اخبارات و جرائد میں کام کرنا ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ شہرت ملی' شاعری کو پذیرائی حاصل ہوئی اور بہت سے اہم لوگوں سے تعلقات قائم ہوئے۔

حفیظ نے شعر گوئی گیارہ سال کی عمر سے شروع کر دی تھی۔ سترہ سال کی عمر میں جالندھر اور اس کے گرد و نواح کے مشاعروں میں مقبول ہونے لگے تھے۔ اس زمانے کے مقبول ترین شاعر داغ دہلوی تھے جن کے انتقال کو ابھی چند سال ہی گزرے تھے۔ ان کے بے شمار شاگرد اور مقلدین پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ حفیظ نے بھی داغ کے انداز میں غزل گوئی شروع کر دی۔ 1918ء میں فارسی کے مشہور شاعر گرامی سے جالندھر میں ان کی ملاقات ہوئی اور وہ گرامی کے شاگرد بن گئے۔ گرامی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اُردو میں انھوں نے چند اشعار سے زیادہ نہیں کہے۔ غالباً حفیظ نے بھی ان سے باقاعدہ بہت کم اصلاح لی لیکن ان کی عمومی ہدایات سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ گرامی نے انھیں ہدایت کی کہ داغ کی تقلید بے فائدہ ہے۔ اس سے تم زیادہ سے زیادہ دوسرے درجے کے داغ بن جاؤ گے۔ ''اپنے اندر جو کچھ ہے اسے باہر نکالو'' ''اپنا کلام خود ہی بار بار ناقدانہ نظروں سے دیکھا کرو''۔ چنانچہ حفیظ نے اس پر عمل کیا اور رفتہ رفتہ ان کی انفرادیت ظاہر ہونے لگی۔

لاہور میں ان دنوں کثرت سے مشاعرے ہوتے تھے۔ حفیظ مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور جلد ہی اتنے مقبول ہوئے کہ مشاعروں کی ناگزیر ضرورت بن گئے اور ملک بھر کے مشاعروں میں مدعو کیے جانے لگے۔ ان دنوں حسرت موہانی' اصغر گونڈوی' فانی بدایونی' جگر مراد آبادی' یاس یگانہ چنگیزی' فراق گورکھپوری' آرزو لکھنوی' احسان دانش' بیخود دہلوی' سیماب اکبر آبادی' جوش ملیح آبادی' پنڈت کیفی' آنند نرائن ملا' نوح ناروی' سائل

دہلوی اور اثر لکھنوی جیسے شعرا مشاعروں میں باقاعدہ شرکت کیا کرتے تھے۔ بیشتر شعراء ترنم سے کلام پڑھتے تھے۔ حفیظ کی آواز قدرتی طور پر بہت سریلی تھی چنانچہ وہ مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ پھر مشہور اور مقبول شعراء کی مسابقت نے بھی ان میں بہتر سے بہتر شعر کہنے کی خواہش پیدا کی۔ غزل گوئی میں اپنی صلاحیتیں دکھانے کے بعد انھوں نے مترنم اور دلنشین نظمیں لکھنی شروع کیں جو ان کی غزلوں سے زیادہ کامیاب ہوئیں۔ ان کے پہلے مجموعے ''نغمہ زار'' میں اس قسم کی متعدد نظمیں درج ہیں جن میں سے ''ابھی تو میں جوان ہوں'' مقبولیت کے لحاظ سے سب میں بازی لے گئی اور اَسی سال کی عمر میں بھی ان سے بالاصرار سنی جاتی تھی'

1925ء میں دوسرا مجموعہ نغمہ زار شائع ہوا اور چھپتے ہی مقبول ہوگیا' اسی سال خیر پور (سندھ) کے نواب نے انھیں اپنا درباری شاعر مقرر کیا مگر ان کی ایک منظورِ نظر طوائف کے بارے میں ایک ہجویہ نظم ''رقاصہ'' لکھنے پر ریاست بدر ہوئے اور لاہور واپس آ گئے۔ ان دنوں لاہور علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ تاجور نجیب آبادی اور ان کے بے شمار شاگرد تو موجود ہی تھے' مختلف ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں جگر مراد آبادی' اصغر گونڈوی' یاس یگانہ چنگیزی' اختر شیرانی' سیماب اکبر آبادی وغیرہ بھی یہاں مقیم تھے۔ اقبالؔ مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے لیکن وہ سب کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے۔ حفیظ نے اس فضا میں بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ لکھا یہاں تک کہ انھیں ایک اہم شاعر تسلیم کرلیا گیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے ''شاہنامہ اسلام'' لکھنے کا آغاز کیا۔ اس کی پہلی جلد کی مقبولیت نے انھیں مالی طور پر بہت سہارا دیا۔

نواب بہاولپور تک شاہنامے کی شہرت پہنچی۔ نواب کے دربار میں حفیظؔ کو عیدین اور دیگر تقریبات میں مدعو کیا جاتا رہا۔ 1935ء میں نواب صاحب حفیظؔ کو حج پر اپنے ہمراہ لے گئے۔ 1937ء میں نظام حیدر آباد نے تین سال کے لیے تین سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کردیا۔ 1938ء میں سر عبدالقادر کے ساتھ انگلستان گئے۔ وہاں تقریباً آٹھ ماہ گزارے' اس دوران چند دن کے لیے فرانس بھی گئے۔ قیامِ انگلستان کے دوران ان کی

ملاقات ایک انگریز خاتون انیلا سے ہوئی۔ وہ 1939ء میں ہندوستان آئی اور حفیظ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئی اور تقریباً بارہ سال کے بعد طلاق لے کر واپس چلی گئی۔

دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو محوری طاقتوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور ہندوستانیوں کو فوج میں بھرتی کی ترغیب دینے کے لیے حکومت نے ایک محکمہ ''سانگ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ'' کے نام سے قائم کیا۔ حفیظ 1941ء میں اس کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس سلسلے میں حفیظ نے بہت سے گیت لکھے اور لکھوائے جو ریڈیو سے نشر ہوا کرتے تھے۔ 1935ء میں انھیں ''خان صاحب'' اور 1946ء میں ''خان بہادر'' کے خطاب ملے۔

1918ء کے لگ بھگ کپورتھلے کے ایک مشاعرے میں بہت سی داد و تحسین حاصل کرنے پر گرامی حفیظ کو ''ابوالاثر'' کا لقب دے چکے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد حفیظ انگریزی خطابات کی بجائے اپنے نام کے ساتھ ابوالاثر کا لقب درج کرنا پسند کرتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے وقت حفیظ شملے میں تھے۔ ستمبر 1947ء میں لاہور پہنچے۔ اکتوبر 1948ء میں افواجِ پاکستان کا حوصلہ بڑھانے (Morale boosting) کے لیے انھیں آزاد کشمیر میں ملازمت دی گئی۔ وہ اخبار ''آزاد کشمیر'' کے مدیر بھی رہے۔ اس دوران آزاد کشمیر کا خوبصورت ترانہ ''وطن ہمارا آزاد کشمیر'' لکھنے کی سعادت بھی انھیں حاصل ہوئی۔ 1953ء سے 1957ء تک حفیظ پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں مقیم رہے جہاں وہ دیہات سدھار (Village Aid) کے محکمے میں ڈائریکٹر تھے۔ اس دوران 1954ء میں پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا تو 1955ء میں انھوں نے ایک ریڈیو آرٹسٹ ''خورشید'' سے شادی کرلی خورشید حفیظ ماڈل ٹاؤن لاہور میں مقیم ہیں۔

1958ء میں حفیظ پاکستانی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے تاشقند میں ''افریشیائی رائٹرز کانفرنس'' میں شریک ہوئے۔ فیض بھی اس وفد میں شامل تھے۔ انھوں نے کانفرنس کے بعد باکو، طفلس، ماسکو، لینن گراڈ (اب سینٹ پیٹرز برگ) اور سائبریا کی بھی سیاحت کی۔ 73-1972ء میں انھوں نے اس سفر کے تاثرات کئی قسطوں میں ''سیارہ ڈائجسٹ'' لاہور میں چھپوائے جن میں بعض جگہ ''تخیل کی کارفرمائی'' دکھائی دیتی ہے۔

صدر ایوب کا مارشل لاء لگا تو حفیظؔ محکمہ تعمیر نو میں مشیر مقرر کیے گئے۔ چند سال اس عہدے پر کام کیا پھر کوئی باقاعدہ ملازمت نہیں کی اور بقیہ عمر ماڈل ٹاؤن لاہور میں گزار دی۔

پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کی عزت و سعادت حفیظؔ کو حاصل ہوئی۔ حفیظؔ نے پہلے ایک ترانہ لکھا' اس کی دھن بنائی اور ریکارڈ کرا کر حکومت کو منظوری کے لیے پیش کیا مگر اس کو یہ کہہ کر منظور نہ کیا گیا کہ دوسرے شعراء بھی ترانہ لکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد احمد جی چھاگلہ کی بنائی ہوئی دھن منظور کر لی گئی اور اس پر ترانے لکھوائے گئے۔ حفیظؔ کے بقول کل سات سو بائیس ترانے مقابلے میں پیش ہوئے جن میں حفیظؔ کا ترانہ قبول ہوا جسے اگست 1954ء میں حتمی طور پر منظور کر لیا گیا۔ یہی موجودہ ترانہ پاکستان ہے۔

عمر کے آخری چند برسوں میں وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ دسمبر 1982ء میں طبیعت بہت بگڑ گئی۔ سروسز ہسپتال لاہور میں زیر علاج رہے۔ جہاں 21 دسمبر کو وفات پائی۔ پہلے ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں امانتاً دفن ہوئے۔ بعد میں مینارِ پاکستان کے زیر سایہ آسودہ ہوئے جہاں حکومت پاکستان نے مزار تعمیر کرایا ہے۔

حفیظؔ نرینہ اولاد سے محروم رہے۔ تینوں شادیوں سے ان کے ہاں سات یا آٹھ بیٹیاں تولد ہوئیں۔ جن میں سے بعض کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی ایک بیٹی تسنیم حفیظؔ شاعرہ تھیں وہ حفیظؔ کے انتقال سے کئی سال پہلے وفات پا گئی تھیں۔ پہلی بیوی سے غالباً چھ بیٹیاں ہوئیں' دوسری اور تیسری بیوی سے ایک ایک بیٹی پیدا ہوئی۔

تصنیفات و تالیفات:

حفیظؔ کا دعویٰ تھا کہ انھوں نے گیارہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ اس پر شک نہیں ہونا چاہیے۔ متعدد شعراء کی شاعری کا آغاز اس عمر میں ہو جاتا ہے۔ تاہم انھوں نے اپنے پہلے شعری مجموعے نغمہ زار میں سولہ سال اور اس کے بعد کا کلام شامل کیا ہے۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ بہت سی نثر بھی لکھی ہے۔ ان کی شعری اور نثری تصنیفات حسب ذیل ہیں:

شاعری

انھوں نے اپنی غزلوں، نظموں، گیتوں اور دیگر شعری اصناف کے چار مجموعے شائع کیے۔ بچوں کی نظموں کے چار پتلے پتلے مجموعے بھی ان کی یادگار ہیں۔ شاہنامہ اسلام کی چار جلدیں مکمل کیں مگر چوتھی جلد اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ بعدازاں انھوں نے اس کی تکمیل کی طرف توجہ نہیں کی۔ بچوں کے لیے ایک کتاب ''ہندوستان ہمارا'' بھی لکھی اور قیامِ پاکستان کے بہت بعد ''بزم نہیں - رزم'' شائع ہوئی۔

ان کتابوں کا مختصر تعارف:

نغمہ زار (1925ء)

شاہنامۂ اسلام کے بعد حفیظ کی مقبول ترین کتاب یہی ہے۔ اب تک اس کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ متعدد نظمیں اپنے انداز و اسلوب کی وجہ سے ''گیت'' قرار دی جا سکتی ہیں۔ غزلیات زیادہ تر روایتی اشعار پر مشتمل ہیں۔ تقلیدِ داغ کا احساس ہوتا ہے۔ انفرادیت ہے مگر کم۔

سوز و ساز (1933ء)

غزلوں، نظموں اور گیتوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں حفیظ کی چند اہم تخلیقات شامل ہیں۔ اس کتاب میں پہلی دفعہ ''گیت نگار'' کے طور پر نمایاں ہونے کی کوشش ملتی ہے۔

تلخابۂ شیریں (1947ء)

اس سال کے شروع میں یہ مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ اس میں غزلیات کے بعد ضرب الامثال اشعار کے علاوہ بہت سی کامیاب نظمیں اور گیت شامل ہیں۔ بعض مؤثر شخصی مرثیے بھی اس مجموعے کا سرمایہ ہیں۔

چراغِ سحر (1973ء)

اس مجموعے میں کچھ کلام آزادی سے پہلے کا مگر بیشتر بعد کا ہے۔ غزلیں بہت اچھی ہیں۔ نظموں میں متعدد تجربات ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات کی عکاسی اکثر

تخلیقات میں موجود ہے۔ پاکستان کا قومی ترانہ' نامنظور کردہ ترانہ (جس کا ذکر سطورِ بالا میں ہو چکا ہے) اور آزاد کشمیر کا ترانہ بھی اس مجموعے میں شامل ہیں۔

شاہنامہ اسلام

حفیظ کو بچپن میں مسدسِ حالی سننے اور پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کا نعتیہ حصہ ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' خصوصاً بہت مقبول تھا۔ غالباً انھیں ''شاہنامۂ اسلام'' لکھنے کا خیال مسدس ہی سے آیا جس کے اثرات شاہنامے پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ 1927ء سے 1947ء تک یعنی بیس برسوں میں انھوں نے اس کی چار جلدیں شائع کیں۔ اس کا آغاز ''قطب الدین ایبک'' کے مزار کی خستگی سے ہوتا ہے جس سے شاعر کو یہ خیال آتا ہے کہ اسلام کے بڑے بڑے خدمت گزار بھلا دیے گئے ہیں چنانچہ وہ ارادہ کر لیتا ہے کہ خدمتِ اسلام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے گا۔

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمتِ اسلام کر جاؤں

اس کام کو شروع کرنے سے پہلے حفیظ نے قرآنِ مجید (اور اس کے تراجم) کتب حدیث و سیَر اور اسلامی تاریخوں کا مطالعہ کیا۔ ''شاہنامے'' میں عرب کے دورِ جاہلیت سے شروع کر کے آنحضور کی ولادتِ باسعادت کا بیان کیا گیا ہے۔ آپ کی تشریف آوری سے عرب کی کایا پلٹ جانے کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور پھر آنحضور کی بعثت سے غزوۂ احزاب تک کی تاریخ تفصیل سے بیان کی گئی ہے مگر شاہنامہ اس سے آگے نہیں چل سکا۔ اسے نامکمل چھوڑنے کی وجہ معلوم نہیں۔ موجودہ صورت میں شاہنامے کے اشعار کی تعداد دس ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔

بچوں کی شاعری

حفیظ لاہور آئے تو انھیں بچوں کے اخبار ''پھول'' کی ادارت کا موقع ملا۔ انھوں نے بچوں کی نفسیات کو مدِنظر رکھ کر متعدد نظمیں لکھیں جو زیادہ تر 1922ء اور 1926ء کے دوران لکھی گئیں۔ پہلے ''بہار کے پھول'' اور ''پھول مالا'' کے زیرِ عنوان دو مجموعوں میں

نظمیں شائع ہوئیں اور بعد ازاں ''حفیظ کے گیت اور نظمیں'' کے زیرعنوان چار جلدوں میں یکجا کر دی گئیں۔

ہندوستان ہمارا (1927ء)

چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے بچوں کے لیے نصابی کتاب کی حیثیت سے لکھی گئی۔ اس میں ہندوستان کی تاریخ کے مختلف ادوار کی اہم شخصیات پر چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ شخصیات میں ہر مذہب و مسلک کے لوگ شامل ہیں۔

بزم نہیں - رزم (1973ء)

اس مجموعے کی بیشتر نظمیں کشمیر کی جدوجہد آزادی پر مبنی ہیں۔ ان میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو قبل ازیں ان کے بعض دوسرے مجموعوں میں آ چکی ہیں۔

نثر نگاری!

حفیظ کی بنیادی حیثیت شاعر کی ہے لیکن ادبی صحافت سے وابستہ رہنے کی وجہ سے انھیں نثر میں بھی طبع آزمائی کرنی پڑی۔ ان کی مطبوعہ نثری تصانیف درج ذیل ہیں:

ہفت پیکر (1929ء)

حفیظ کے سات افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے کتابی صورت میں یکجا ہونے سے پہلے مختلف رسائل میں 1927ء سے قبل طبع ہو چکے تھے۔

معیاری افسانے (1933ء)

اٹھارہ افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ مختلف زبانوں کے مشہور افسانوں کا اخذ و انتخاب ہے۔ کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے یہ افسانے ''مخزن'' میں شائع ہوئے تھے۔

بقلم خود

حفیظ کے تین شعری مجموعوں یعنی نغمہ زار، سوز و ساز اور تلخابۂ شیریں کے جو ایڈیشن قیامِ پاکستان کے بعد شائع ہوئے ان میں پس منظر کے طور پر اس دور کے عام ادبی ماحول

اور اپنی ذات کے بارے میں بعض نمایاں واقعات شامل کردیے گئے ہیں۔ انھیں ایک نامکمل ''خودنوشت'' کہا جاسکتا ہے۔

حفیظ-تاشقند میں

سطور بالا میں بتایا جا چکا ہے کہ حفیظ 1958ء میں افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کے لیے روس گئے تھے جہاں انھیں روس کے متعدد دیگر شہروں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ پندرہ سال بعد یہ سفرنامہ چند قسطوں میں سیارہ ڈائجسٹ میں شائع ہوا لیکن کتابی شکل میں کبھی نہیں چھپا۔

چیونٹی نامہ (1973ء)

اس کتاب میں مشاہدے اور علم حیاتیات کی مدد سے بتایا گیا ہے کہ چیونٹیوں کی سوسائٹی کس طرح کام کرتی ہے اور چیونٹیاں پیدائش سے موت تک کن مراحل سے گزرتی ہیں۔

نثرانے (1976ء)

انشائیوں اور تاثراتی تحریروں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ (راقم السطور کے لیے یہ بات باعث فخر ہے کہ کتاب کا انتساب اس کے نام ہے)۔

بچوں کے لیے کتابیں

حفیظ نے طلسم ہوش ربا اور الف لیلہ سے بعض کہانیاں اخذ کر کے آسان اُردو میں بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ عمرو عیار (1926ء - نظرثانی شدہ اشاعت: 1982ء)

شہزادہ صنم اور جنوں کا بادشاہ (1982ء)' شہزادہ خداداد اور شہزادی دریا باد (1982ء) اور بدر شہزادہ - جواہر شہزادی (1982ء) اب تک مجھے مل سکی ہیں۔ ہوسکتا ہے اس طرح کی کچھ اور کتابیں (کتابچے) بھی لکھی گئی ہوں۔

متفرق نثر

احباب کو حفیظ خطوط لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے دیباچے اور انٹرویوز بھی موجود ہیں۔ ''جنگ'' کراچی میں کچھ عرصہ وہ کالم بھی لکھتے رہے۔ ان متفرق نثری تحریروں

کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔

علاوہ ازیں انھوں نے ''دیوانِ حالی'' کا انتخاب مع مقدمہ بھی شائع کرایا ہے۔

حفیظ کا مقام

حفیظ کی نثر ان کی شاعری کی وجہ سے زندہ ہے جبکہ شاعری اپنے بل پر زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ حفیظ نے غزل، نظم اور گیت کی اصناف میں زیادہ شاعری کی ہے۔ علاوہ ازیں کامیاب ترانے اور پُر تاثیر شخصی مرثیے لکھے ہیں۔ شاہنامۂ اسلام ایک طویل ''ایپک'' ہے جو مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ بچوں کے لیے انھوں نے ایسی نظمیں لکھی ہیں جنھیں بچے دلچسپی سے پڑھتے ہیں کیونکہ وہ ان کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

بیسوی صدی کے ابتدائی چند برس اور انیسوی صدی کے آخری چند سال داغؔ اور ان کے انداز کی غزل گوئی کی مقبولیت کا نقطۂ عروج تھے۔ حفیظ بھی اس انداز اور اسلوب سے متاثر ہوئے مگر جلد ہی گرامی کی صورت میں انھیں ایک خضرِ راہ میسر آ گیا جس نے انھیں انفرادیت کی تلاش کے راستے پر ڈال دیا۔ چنانچہ وہ غزل میں اپنے تجربات اور احساسات کو آسان زبان اور دلنشیں اسلوب میں بیان کرنے لگے۔ وہ بالعموم فارسی تراکیب اور مشکل الفاظ سے گریز کرتے ہیں اور کہیں شوخی اور کہیں طنز سے دلچسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

لگایا آئینہ اس نے یہ کہہ کر روزنِ در میں
کہ اپنا منہ تو دیکھیں میری صورت دیکھنے والے

....

کوئی دوا نہ دے سکے مشورۂ دعا دیا
چارہ گروں نے اور بھی درد کا دل بڑھا دیا

....

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لیے ہوئے دامِ وفا کو میں

....

بازار نیا گاہک بھی نئے اب جنسِ وفا کی قدر نہیں
بے سود نمائش رہنے دے اے دل یہ مال پرانا ہے

....

شیخ کے منہ سے تو نکلی ہیں مزے کی باتیں
ہم یہ سمجھے تھے بجز نامِ خدا کیا ہو گا

وہ اشعار کی ساخت اور مصرعوں کی چستی پر بڑی محنت کرتے ہیں مگر آورد کا تاثر پیدا نہیں ہونے دیتے۔ ان کے بہت سے اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر کے زبان زدِ خاص و عام ہو چکے ہیں اور متعدد اشعار میں ضرب المثل بن جانے کی صلاحیت موجود ہے۔

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمھیں بھلا سکے

....

وفا جس سے کی بے وفا ہو گیا
جسے بت بنایا خدا ہو گیا

....

ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

....

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

....

نظر آتی ہی نہیں صورتِ حالات کوئی
اب یہی صورتِ حالات نظر آتی ہے

....

رندانِ مے پرست یہ مست ہی سہی
اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیے

ان کی غزل کے اکثر اشعار بڑے رواں دواں، مترنم اور آمد کا تاثر لیے ہوئے ہیں۔ موضوع خواہ عشقیہ ہو، سیاسی ہو یا سماجی۔ بالعموم سادگی اور پرانے استعارات و علامات کو نئے معنوں میں استعمال کر کے تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ (ان کی غزل گوئی کے تفصیلی مطالعے کے لیے میری کتاب ''چند۔ اہم جدید شاعر'' ملاحظہ کیجئے۔)

حفیظؔ نے غزل گوئی میں چند سال مشق کرنے کے بعد نظم گوئی کا آغاز کیا۔ جب وہ جالندھر سے لاہور آئے تو انھوں نے نظمیں لکھنی شروع کیں۔ اس وقت علامہ اقبال کی نظمیں بے حد مقبول تھیں، ٹیگور کی نظموں کی اُردو تراجم بھی لوگوں کو متوجہ کر رہے تھے۔ چکبستؔ، نادرؔ کاکوروی، سرورؔ جہاں آبادی، محرومؔ، خوشی محمد ناظرؔ اور اس قبیل کے دوسرے شعراء کی نظمیں رسائل میں متواتر شائع ہو رہی تھیں۔ اندریں حالات حفیظؔ نے بھی نظم گوئی کا آغاز کیا۔ نغمہ زار سے تلخابہ شیریں تک کی نظموں کے ارتقا پر نظر ڈالیں تو موضوعات کی رنگارنگی کے ساتھ ساتھ ہئیت و بحور کے بے شمار تجربے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک رجحان منظریہ نظموں کا ہے جس میں قصیدوں کی روایتی تشبیب کی منظر نگاری کے برعکس گہرے مشاہدے پر مبنی مناظر کی تصاویر پیش کی گئی ہیں۔ طلوع و غروب آفتاب و ماہتاب، ستارے ابر و برق و باد، مختلف موسم خصوصاً بہار -- دریا، پہاڑ، وادیاں --- غرض مناظر کی ایک وسیع دنیا ان نظموں میں موجود ہے، چونکہ ان کی بنیاد مشاہدے پر ہے اس لیے ان میں مقامی رنگ کی بھی فراوانی ہے۔

دوسری رَو مذہبی اور اخلاقی نظموں کی ہے جو نغمہ زار سے شروع ہو کر سوز و ساز میں ارتقا سے گزرتی ہوئی اور تلخابہ شیریں سے ہوتی ہوئی چراغِ سحر تک چلی جاتی ہے۔

تیسری لہر سماجی اور سیاسی نظموں کی ہے جو ابتدائی تین مجموعوں میں بھی موجود ہے لیکن چراغِ سحر میں تیز تر ہو جاتی ہے، بعض نظمیں اپنے موضوعات کے اعتبار سے ترقی پسند شعراء کی نظموں سے مختلف نہیں ہیں اور طبقاتی تضادات اور غریبوں کے استحصال کے خلاف

زوردار احتجاج سے پُر ہیں۔ بہت سی نظمیں متفرق موضوعات پر ہیں جنھیں کسی ایک عنوان کے تحت شمار کرنا ممکن نہیں' ادھیڑ عمر میں حفیظ طویل نظموں کی طرف بھی مائل ہوئے ہیں۔ ''اقبال' ٹیگور' حفیظ''، ''تصویرِ کشمیر''، ''نیرنگ فرنگ'' اور ''اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے'' اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ حفیظ نے معریٰ اور آزاد نظم کو بہت ہی کم اختیار کیا ہے۔ پابند نظموں میں کلاسیکی ہیئتوں یعنی قطعہ' مثنوی' مسمط وغیرہ کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ نئی ہیئتوں کے بھی بہت سے تجربات کیے ہیں جو کامیاب ہیں۔

نقادوں نے ان کے گیتوں اور گیت نما نظموں کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ نغمہ زار میں ''ابھی تو میں جوان ہوں''، ''سحر'' اور ''برسات'' وغیرہ گیت نما نظمیں ہیں۔ مصرعوں کے ارکان میں کمی بیشی نہیں کی گئی لیکن ہلکے پھلکے رومانی جذبات' سبک بحور اور ترنم ریز الفاظ کی وجہ سے ان کی روح گیت کی ہے۔

گیتوں کا عروج ''سوز و ساز'' اور ''تلخابۂ شیریں'' میں دکھائی دیتا ہے۔ ''جاگ سوزِ عشق جاگ''، ''دل ہے پرائے بس میں''، ''پریت کا گیت''، ''تیری منزل دور''، ''درشن درشن میرا''، ''بسنت رُت'' وغیرہ اعلیٰ درجے کے گیت ہیں۔ بقول ہری چند اختر:

> ''اُردو شاعری میں حفیظ اس صنفِ سخن کا موجد ہے اور کامیاب موجد ہے۔ اس کے گیتوں نے اُردو شاعری میں ایک نئی لذت اور ایک نیا رس پیدا کر دیا ہے''۔

حفیظ کے گیتوں میں ٹیپ کی بامعنی اور مترنم تکرار' ٹکڑوں کی متناسب تقسیم اور حسبِ ضرورت ہندی' اُردو اور فارسی الفاظ کے استعمال نے ان میں گہرا جذباتی تاثر پیدا کر دیا ہے اور یہ اپنی ''سپرٹ'' میں تھیٹر کے گیتوں سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ ان کے گیت ہندی گیتوں کے برعکس اُردو گیت نگاری کے کامیاب تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسماعیل میرٹھی کے بعد غالباً بچوں کے سب سے کامیاب شاعر حفیظ ہیں۔ عبدالمجید سالک ان کی ان نظموں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''میرے نزدیک زبان کی سادگی' مطالب کی سلاست اور ادبی افادے کے اعتبار سے حفیظ کی ان نظموں کا پایہ بہت ہی بلند ہے جو بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں''۔

شاہنامۂ اسلام کی چار جلدوں کا سرسری ذکر سطورِ بالا میں کیا جاچکا ہے۔ اگرچہ بعض نقادوں نے اس کی ادبی حیثیت کے بارے میں تحفظات کے ساتھ رائے زنی کی ہے لیکن اس بات کو تقریباً سب نقاد تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے متعدد حصے بیانیہ اور رزمیہ شاعری کے عمدہ نمونے ہیں۔

دراصل طویل نظموں میں بلند و پست مقامات معمول کی حیثیت رکھتے ہیں اور دنیا کی بہترین طویل نظمیں بھی اس اصول سے مبرا نہیں ہیں۔

مجموعی طور پر حفیظؔ اقبال کے بعد اُبھرنے والی چند نمایاں آوازوں میں شامل ہیں۔ اقبالؔ نے پابند نظم کو جس بلندی تک پہنچا دیا تھا ان کے بعد آنے والے شعراء اسی صورت میں نمایاں ہو سکتے تھے جب وہ نئے تجربات کریں۔ حفیظؔ کی ذہانت نے انھیں نوجوانی ہی میں یہ بات سجھا دی تھی کہ تقلید داغؔ کی ہو یا اقبالؔ کی' اس سے کوئی شاعر اہم شاعر نہیں بن سکتا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی انفرادیت نمایاں کی۔ ان کی ہلکی پھلکی مترنم نظمیں اور گیت ایسے نہ تھے کہ توجہ سے محروم رہتے۔ غرض حفیظؔ نے اقبالؔ کی زندگی ہی میں اپنا شعری مقام منوالیا تھا اور غزل' نظم اور گیت تینوں اصناف میں اہمیت اختیار کر لی تھی۔ شاہنامۂ اسلام کی تصنیف نے ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ کیا اور وہ لوگ بھی ان کے حلقۂ اثر میں شامل ہو گئے جن کے لیے شاعری ایک بامقصد فن ہے۔ پھر ترانۂ پاکستان کے خالق ہونے کی وجہ سے وہ ایسی منفرد حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ان کے کسی دوسرے ہمعصر کے حصے میں نہ آسکی۔

یہ کلیات کیوں؟

حفیظؔ کا انتقال 1982ء میں ہوا۔ وفات سے ربع صدی پہلے انھوں نے نغمہ زار' سوز و ساز اور تلخابۂ شیریں کے نئے ایڈیشن چھپوائے تھے مگر ان کا طباعتی معیار اچھا نہیں تھا اس پر مستزاد متن میں بہت سی اغلاط کا در آنا تھا۔ چراغِ سحر ان کی وفات سے تقریباً دس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ اس میں بھی کتابت کی بہت سی اغلاط تھیں اور معیارِ طباعت معمولی تھا۔ بعد میں یہ کبھی شائع نہیں ہوئی۔ حفیظؔ اپنی تمام دیگر تصانیف پر ان چار مجموعوں (یعنی نغمہ زار'

سوز و ساز، تلخابہ شیریں اور چراغِ سحر) کو ترجیح دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری میں ان کا عمومی مقام انھی مجموعوں کی وجہ سے ہے لیکن تقریباً نصف صدی سے نایاب ہونے کی وجہ سے یہ قارئین کی دسترس میں نہیں رہے بلکہ کتب خانوں سے بھی غائب ہو چکے ہیں اس لیے نئی نسلوں سے حفیظ کے مقام کو متعارف کرانے کے لیے ان کی اشاعتِ نو کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

میں نے حفیظ کے تمام کلام کو دو جلدوں میں شائع کرانے کا منصوبہ بنایا۔ چونکہ ''شاہنامہ اسلام'' الگ حیثیت رکھتا ہے اور دستیاب بھی ہے اس لیے فی الحال اسے اس میں شامل نہیں کیا۔ وہ جب بھی شائع ہوا تو اسے کلیاتِ حفیظ کی تیسری جلد شمار کیا جائے گا۔ جلد اوّل میں مذکورہ بالا چاروں مجموعے شامل ہیں اور جلد دوم میں ''بچوں کی نظمیں'' اور ''رزم نہیں بزم'' کی شمولیت کا ارادہ ہے۔ ''ہندوستان ہمارا'' بھی دراصل بچوں ہی کے لیے لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اور وہ بھی اسی جلد دوم میں شامل ہوگی۔

کلیاتِ حفیظ کی زیرِ نظر جلد کو ترتیب دیتے ہوئے چاروں مجموعوں میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی۔ حفیظ اپنے کلام کو بار بار بناتے رہتے تھے اس لیے ان کی زندگی میں شائع ہونے والے تمام مجموعوں میں متن کی تبدیلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ لفظی تبدیلیوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے لیکن پورا پورا شعر یا مصرع بھی ترمیم و تنسیخ کے مراحل سے گزرا ہے۔ متعدد غزلوں میں اشعار کے اضافے بھی ملتے ہیں اور اس قسم کے اضافے سب سے زیادہ ''نغمہ زار'' میں ہیں۔ بعض مقامات پر تکرار کلام بھی موجود ہے اور نئی نظموں یا غزلوں کے اضافے بھی ہیں۔ اس کلیات کا متن زیادہ تر آخری اشاعتوں کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ اضافہ شدہ کلام کو ہر مجموعے کے آخر میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی البتہ ایک سے زیادہ بار آنے والے کلام کو ایک بار اپنے مناسب مقام پر شامل کر کے باقی جگہوں سے اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ بعض اغلاط جو تمام نئی اور پرانی اشاعتوں میں در آئی تھیں، درست کر دی گئی ہیں۔

حفیظ نے نغمہ زار کے ابتدائی ایڈیشنوں میں غزلیات پر عنوانات نہیں دیے لیکن بعد

کی اشاعتوں میں ہر غزل پر عنوان بھی درج کیا ہے جو بالعموم اس غزل کے کسی مصرع کا ٹکڑا ہے یا ردیف کا کوئی حصہ ہے۔ اس قسم کے عنوانات بعد کے تینوں مجموعوں کی غزلیات پر بھی موجود ہیں لیکن اس اشاعت میں ان کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ مرتب کے نزدیک ان کی کوئی افادیت نہیں ہے۔

حفیظؔ نے اپنے کلام کو ترتیب دیتے ہوئے بعض جگہ سنین کا اندراج کیا ہے مگر متعدد مقامات پر انھیں درج کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ کلیات حفیظ کو زمانی ترتیب دینا فی الحال تقریباً ناممکن ہے کیونکہ پون صدی پہلے کے متعدد رسائل کی فائلیں اب دستیاب نہیں ہیں اس لیے جہاں سنین موجود ہیں انھیں برقرار رکھا گیا ہے لیکن جہاں مجموعے خاموش ہیں' وہاں میں نے بھی تخمین وظن سے کام لینے کی بجائے ''خاموشی'' اختیار کی ہے البتہ جہاں کہیں سنین واضح طور پر غلط ہیں' ان کی تصحیح کر دی گئی ہے اور فٹ نوٹ میں اس کی وضاحت بھی کر دی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد شائع ہونے والی اشاعتوں میں نغمہ زار' سوز و ساز اور تلخابۂ شیریں میں ''بقلم خود'' کے زیرِ عنوان حفیظؔ نے اپنے کلام کا پس منظر آپ بیتی کے انداز میں تحریر کیا ہے۔ کلیات کو زیادہ بوجھل نہ بنانے کے خیال سے اس خودنوشت کا الگ شائع کیا جانا مناسب سمجھا گیا ہے اور ان شاء اللہ اسے بھی مستقبل قریب میں شائع کیا جائے گا جس میں اس قبیل کی دوسری تحریروں کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

خواجہ محمد زکریا

نغمہ زار

ارشادِ گرامی

فخرِ ایشیا ملک الشعراء حضرت استاد مکرم مولانا شیخ غلام قادر صاحب گرامی[1] (قدس سرہ) نے ذیل کے اشعار آبدار اس عاجز کے کلام کے متعلق ارشاد فرما کر ذرّے کو آفتاب بنا دیا تھا ورنہ منہ آنم کہ من دانم، ان اشعار کو پڑھتا ہوں اور شرمندہ ہوتا ہوں کہاں گرامی شہنشاہ اقلیم سخن اور کہاں حفیظ گدائے گوشہ نشین اور عامی کج مج زباں، ہاں گرامی کی نسبت نے اس کو گرامی کر دیا۔ ؎

گرچہ خوردیم نسبتے ست بزرگ　　ذرّہ آفتابِ تابانیم

فصاحت مجسم ، بلاغت مصور　　کلامِ حفیظ است اللہ اکبر
معانی دلآویز ، الفاظ دلکش　　کلامِ حفیظ است یا سلکِ گوہر
معانی در آغوشِ الفاظ پنہاں　　بآب ست ماہی بآتش سمندر
معانی در الفاظ پنہاں و پیدا　　بہم کردہ فکرش مگر شیر و شکر
فصیحِ معظم بلیغِ مکرم　　حفیظِ سخن گو ، حفیظِ سخنور
بہ فہرست معنیت نامش مقدم　　بہ بزمِ گرامی کلامش موٌخر
چہ نسبت بود داغ را با حفیظم　　موخر مقدم مقدم موخر
بطرز آفرینی طبعِ بلندش　　بود آسماں کارگاہِ محقر

گرامی سحر گفت سالک بگوشم
زبانِ حفیظ است یا موج کوثر

---

[1] گرامی (۱۸۵۶ء-۱۹۲۷ء) فارسی زبان کے عمدہ شاعر، علامہ اقبالؒ کے عزیز دوست اور حفیظ جالندھری کے استاد (مرتب)

"ایک اور بقلمِ خود"

۲۶ نومبر ۱۹۵۷ء کا بقلم خود آپ پڑھ چکے ہیں[1] اس میں کہا گیا تھا کہ شاید ہی آئندہ زندگی میں اس کتاب کی کوئی اور اشاعت دیکھنا میرے نصیب میں ہو۔ مگر یہ خیال خواب ہو گیا۔ آج ۱۳ ستمبر ۱۹۷۴ء ہے سانس لے رہا ہوں یہ اشاعت بھی میری ہی نگرانی میں کتابت ہوئی۔ تمنا ہے کہ طباعت کے بعد آپ کے سامنے آنے تک موت کو دھتا بتا تا رہوں تا کہ جو کچھ چند سطور میں اس بقلم خود کے ذریعے کہہ رہا ہوں اس کا تاثر نظر آئے۔

اولین بقلم خود میں اس دور کی جھلک تھی جب میں نے شعر کا آغاز کیا تھا۔ بعد ازاں جو مجموعے "سوز و ساز" اور "تلخابۂ شیریں" شائع ہوئے ان میں ماحول بتدریج جس طرح بدلتا گیا میں کوئی پتھر نہیں تھا کہ مجھ پر اثر نہ ہوتا۔ معاشرت کے ہر زاویے کی ترجمانی میرے احساسات نے مسلسل (اپنی بساط بھر) کر دی تا آنکہ پاکستان کی تحریک نے تسخیر اور تعمیر کے مراحل طے کیے اور جو کچھ اس ایوانِ ملت کی تعمیر کے لیے ہوا میں اس میں شامل تھا۔ اس لیے ۱۹۷۳ء میں ایک چہارم مجموعہ غزلیات اور نظمیات پاکستان ہی کے بارے میں ہے۔ ہر غزل ہر نظم ہر گیت ہر ترانہ ہر رجز ملت کے سفر اور سفر کے دوران رہزنوں اور ٹھگوں نے جو معاملات جو سلوک فرمائے سب کے تاثر میں نے اپنی طبع پر آزمائے اور بیان کر دیے۔

یہ سطور اس لیے بحالت علالت لکھ دی ہیں تا کہ اگر یہ کتاب جس کو نغمہ شباب کہا گیا ہے آپ پڑھیں تو شیب تک پہنچنے کا حال نیز خود اپنی چال ڈھال کو دیکھنا ہو تو نوجوان تو کم از کم اس سے مستفید ہو سکیں۔

حفیظ

[1] حفیظ نے "بقلم خود" کے عنوان سے اپنے تین مجموعوں (نغمہ زار، سوز و ساز اور تلخابہ شیریں) میں جو کچھ لکھا اسے الگ کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ (مرتب)

دیباچہ

(از سید احمد شاہ بخاری پطرس)

جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ مدت سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویر بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔

ساون رُت گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی' موروں کی جھنکار' پپیہوں کی پکار' برسات کی ٹھنڈی ہوا۔ ہوا میں اڑتے ہوئے آنچل آنکھوں میں تمنائے دید اور فراق کے آنسو، دل کو انتظار کی دھڑکن — یہ ایک مست کیف شاعر کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے۔ جب اس کا دل بھر آتا ہے تو وہ آنسو بہا دیتا ہے جب اس کے دل میں ایک ہوک اُٹھتی ہے تو وہ اونچے سروں میں الاپتا ہے اور سننے والوں کا کلیجہ مسل دیتا ہے۔

یہ اس کے کلام کا مجموعہ ہے چند ورق ہیں۔ خشک طبیعتوں کو جا بجا اس میں ''فن'' کے نقائص اور بے عنانیاں نظر آئیں گی اہل ذوق دیکھیں اور جانیں گے کہ ایک وارفتہ عاشق مزاج عشق کے اتھاہ سمندر میں خود بھی کس طرح ڈگمگاتا ہے اور دوسروں کے دل بھی کس طرح ہلاتا ہے! حفیظ ایک شاعر ہے جس کے قدم پامال رستے سے اِدھر اُدھر جا پڑتے ہیں لیکن یہ ایک راہ گم کردہ کی آوارگی نہیں ایک مست کی لغزشیں ہیں۔ نشے میں چور کیف میں سرشار جو پیتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ پیالے میں بھی بھر کر دیتا ہے اور یوں بھی لنڈھاتا ہے۔ ایک آزاد جوگاتا

ہے اور الفاظ اس کی زبان پر ناچتے ہیں۔

ہمارے شاعر برسوں سے ترک شیرازی پرست ہیں۔ایک ایسی شراب طہور سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں جو نہ خود پی سکتے ہیں نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔شاعری ایک فریب ہے لیکن اس تصنع کا کیا نام ہے جو کسی کو دھوکا نہ دے سکے؟

حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلھن پر ہے اور وہ ترک شیرازی کی غلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوا اور اس کو کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے یہ بے وفائی آخر کب تک؟ عاشق کہ نظرباز؟

پطرس

۱۹۲۴ء

دیباچہ

(از-ڈاکٹر تاثیر پی ایچ ڈی)

حفیظ کی شاعری امید افزا ابتداء سے تکمیل تک جا پہنچی مگر میرے دل میں جو جگہ ''نغمہ زار'' کی نظموں کے لئے ہے وہ کسی اور نظم کے لئے نہیں ''نغمہ زار'' کے بعد حفیظ نے جو کچھ لکھا ہے وہ فن اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے بلند تر ہے اور پختہ تر ہے متانت اور علو تخیل، لطافت الفاظ سے اس طرح ممتزج ہوئے ہیں کہ ادبیات میں ان کا مقام جاودانی ہے مگر جو سبک سیری جو فرحت فزائی نغمہ زار کے الفاظ معانی اور بحور[1] میں ہے وہ اور کہیں نہیں ملتی۔ نغمہ زار حفیظ کا شباب ہے اور اس میں شباب کی جملہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں اور جب تک اس عجوزہ دہر پر شباب مسلط ہے اس کا سکہ جواں ہمت دلوں پر جمار ہے گا۔

کسی ایک نظم یا غزل کو دیکھو وہی شباب کی سرشوری استغنا اور انانیت نظر آتی ہے۔ ''کرشن کنھیا'' اس نام سے کس قدر عقیدت وابستہ ہے مگر شاعر نے اس عقیدت کو طوقِ گردن نہیں بنایا اور شاعرانہ سربلندی سے طرب وغنا کی مسرتوں کی آرزو کی ہے۔

بت خانے کے اندر
خود حسن کا بت گر
بت بن گیا آکر

وہ گوپیوں کے ساتھ ہاتھوں میں دیئے ہاتھ رقصاں ہوا برج ناتھ
بنسی میں جو لے ہے نشہ ہے نہ مے ہے کچھ اور ہی شے ہے
اک روح ہے رقصاں اک کیف ہے لرزاں

---

[1] حفیظ کے استعمال بحور و قوافی پر ایک مستقل مضمون درکار ہے۔ تاثیر

آنا نہ اکیلے ہوں ساتھ وہ میلے سکھیوں کے جھمیلے

ہر نظم شباب کی حسن آفرینی اور جدت پسندی کا نمونہ ہے اور اس روحِ خیال کی ترجمانی کے لئے انداز بھی تازہ ملا ہے۔ نظم کی یہ صورت یہ مسلسل قطرہ زنی جو سیلابِ مواج سے زیادہ سنگ فرسا ہے اپنے ساتھ ایک اپنا مخصوص ترنم لائی ہے۔

شعر اور نغمے کا تعلق تو شاعری کے مظہر یعنی الفاظ سے ظاہر ہے۔ الفاظ کیا ہیں؟ اصوات! ایسی آوازیں جن میں مختلف لوگوں نے مختلف معنی ڈال دیئے ہیں۔

شاعری کیا ہے؟ بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب؟ بہترین اصوات کا مجموعہ۔ یہی وجہ ہے کہ مشاہیر شعرا اپنے شاہکار روزمرہ کے سوقیانہ تجارتی لہجے کو ترک کر کے لے میں پڑھتے ہیں اگر ایران کا عارف قزوینی بربط لے کر اپنی (تصنیف) گاتا پھرتا ہے تو زبورِ عجم کا ''مصنف'' آسا کی دھن میں سامعین کے قلوب پر شعلہ ریز ہوتا ہے۔ شعرا اپنے اپنے ترنم پر ناز کرتے ہیں اور حافظ تو موسیقی کی دیوی ناہید سے صف آرا ہو جاتا ہے۔

غزل سرائی ناہید صرفۂ نبرد در آں مقام کہ حافظ برآورد آواز

شاعری تو اپنے مظہرِ صوتی یعنی الفاظ کی وجہ سے موسیقی کی دیوی ناہید سے ہم آہنگ ہے مگر یورپ کی جدید مصوری کے مدرسے تصویر کشی کو بھی موسیقی سے مماثل کرنا چاہتے ہیں۔ وسلر کی تصاویر کے نام ''آہنگ ارزق''، ''نغمہ زرد'' مشہور عوام ہیں۔ غرض شاعری اور نغمے میں فرق ہے تو شراب اور شیشے کا اور شراب صافی اور شیشۂ شفاف کا فرق ایک عرب شاعر یوں بیان کرتا ہے۔

رق الزجاج ورقت الخمر فتشا کل وتشابہ لأمر

فکأنھا الخمر ولا قدح وکأنھا القدح ولاخمر

(شفاف ساغر اور صاف شراب نے امتیاز دشوار کر دیا ہے کبھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ شراب ہے قدح نہیں کبھی یہ ہے کہ قدح ہے اور شراب نہیں ہے)

حفیظ کا مروجہ طرز اس قدر مقبول ہوا ہے کہ اسے اب مقبولیت کی مضرتیں بھی لاحق ہو گئی ہیں۔ حاسدین کہ زندگی کی دوڑ میں ان کا ہونا ضروری ہے اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں کہ

شاعری کی ہمت کو مہمیز کر دیں مگر خطرناک وہ مخلص خوشامدی ہیں جنہوں نے اپنی ستائش کو تتبع کے انداز میں پیش کیا ہے۔ شاعری اور پھر ایسی لطیف مترنم شاعری کے لئے فطری مناسبت درکار ہے ورنہ آواز تو کوئل اور مینڈک، بلبل اور جھینگر بھی نکالتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ تتبع کا یہ طوفان بدتمیزی کچھ عرصہ کے لئے اصل کے اوصاف کو بھی نہ چھپالے۔

''شباب اور نغمہ''! یہ ہے حفیظ کے اس دورِ اول کی خصوصیت جس کی بنا پر ''نغمہ زار'' کو ''نغمہ شباب'' کہا کرتا ہوں غالباً اس طرز خیال کی بہترین ترجمانی کا گیت ہے: ''ابھی تو میں جوان ہوں''

یہ آسمان یہ زمیں نظارہ ہائے دل نشیں
انہیں حیات آفریں
بھلا میں چھوڑ دوں یہیں
ہے موت اس قدر قریں مجھے نہ آئے گا یقیں
نہیں نہیں، ابھی نہیں
ابھی تو میں جوان ہوں

شباب ہر جگہ اپنا نقطۂ نظر اپنا طرز خیال پیش کرتا ہے۔ یہ ''انانیت'' نظم سے گزر کر غزل میں بھی نظر آتی ہے اور حفیظ میں (Personal touch) اس قدر نمایاں ہے کہ جہاں کہیں ردیف ''میں'' یا ''مجھے'' ہوتی ہے غزل کی سطح بہت بلند ہو جاتی ہے۔

لے جاؤ ساتھ ہوش کو اے اہل ہوش جاؤ ہے خوب اپنی بے خبری کی خبر مجھے

نا آشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست
کم بخت جانتے نہیں کیا ہو گیا ہوں میں!
قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دنیا سمجھ رہی ہے فنا ہو گیا ہوں میں
اٹھا ہوں اک جہانِ خموشی لئے ہوئے
ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا ہو گیا ہوں میں

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لیے ہوئے دام وفا کو میں

سیال جذبات کو اپنے من کی موج سے مختلف صورتوں میں ڈھال لینا مقابلتاً سہل ہے مگر یہ خودنظری ''نیچر'' کے جامد جسم کو بھی اپنی مرضی کے مطابق موڑ لیتی ہے۔ ''بسنت'' ایک موسم ہے جو ابتدائے آفرینش سے یکساں خصوصیات کے ساتھ آتا جاتا رہتا ہے مگر حفیظ اس میں خوشی اور غم دونوں قسم کے جذبات بھر دیتا ہے اور آخری بند تو گویا بسنت کا ایک مستقل مجازی نشان (Symbol) بن گیا ہے۔

اک نازنیں نے پہنے پھولوں کے زرد لہنے
ہے مگر اداس
نہیں پی کے پاس
غم و رنج و یاس دل کو پڑے ہیں سہنے
اک نازنیں نے پہنے
پھولوں کے زرد گہنے

غزل کا شعر ہے:

غنچہ غنچہ خوف سے مجھ کو نظر آیا قفس
پتے پتے پر ہوا دھوکا کفِ صیاد کا

مگر شباب خودنظری کی اس کاوش سے بہت جلد تنگ آجاتا ہے اور فکر کے بوجھ سے آزاد ہو کر مناظر کی رو میں بہنے لگتا ہے۔ ''منظر کشی'' مصوری میں ہو یا شاعری میں شباب کا آزاد مشغلہ ہے اور خالص مسرت کا نمونہ۔ اردو شاعری کے اس نئے دور میں یہ شعبہ بہت سے یورپ زدہ شعرا کا تختۂ مشق بنا رہا ہے مگر تکلف اور جبر منظر کشی میں بالخصوص سخت نازیبا ہیں اس میدان میں بھی حفیظ جملہ معاصرین سے آگے نکل گیا ہے۔

نمودِ سحر

یکا یک ایک نور کا   غبار شرق سے اٹھا
جو رفتہ رفتہ بڑھ چلا
اور آسماں پہ چھا گیا
حسینۂ نمود نے   سیہ نقاب اٹھا دیا
فسوں گرِ شہود نے   طلسمِ شب مٹا دیا
یکا یک ایک تازگی
یکا یک ایک روشنی
نگاہِ جاں میں آ گئی   حیات میں سما گئی
یکا یک ایک نور کا   غبار شرق سے اٹھا

یہ بند ٹیپ کے صحیح استعمال کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اسلوب ایسا تازہ ہے کہ ٹیپ پر تکرار کا شبہ نہیں ہوتا۔

اشنان

کنارِ گنگ برہمن   جوان و پیر، مرد و زن
چڑھا کے دیوتا کو جل
وہ جھک رہے ہیں سر کے بل
وہ اک حسین گھاٹ پر   نہا رہے ہیں گلبدن
بروئے آب سر بسر   کھلا ہوا ہے اک چمن

جھولا

آموں کے نیچے   ڈالے ہیں جھولے

مہ پیکروں نے   سیمیں تنوں نے   برق افگنوں نے

''برق افگنوں'' کی ترکیب نے گویا ساکن جھولوں کی پینگیں آسمان پر ڈال دی ہیں۔ ''رکھوالا لڑکا'' ''شب زاد نظارے'' اور ایسے متعدد نقشے اردو شاعری کا مستقل جزو بن چکے دیئے ہیں مگر یہ نیچرل شاعری ''حواسِ خمسہ'' کی شاعری ہے اور یہ ظاہری حواس بذات خود دیر پا اور عمیق نہیں ہوتے۔ اردو شاعری میں یہ طرز انگریزی کے تتبع میں مروّج ہوا مگر حفیظ اس پابندی سے آزاد رہا اور اس کے مواخذ (اگر شاعری جیسی بدیہی چیز میں ان کا ہونا ممکن ہے) یا رجحانات خالص ایشیائی ہیں۔ آزاد مرحوم جنہوں نے غالباً سب سے اوّل اس صنف کو کامیابی سے ترویج دی محض ''اجزا شماری'' کرتے ہیں اور منظر کشی میں حواسِ خمسہ کی بجائے عموماً ایک حسِ بصارت ہی کو استعمال کرتے ہیں اور عام اردو شاعروں کا یہی دستور ہے۔ مگر حفیظ عرب شاعری سے بے خبر ''منظر کشی'' میں عرب اور ایرانی شعرا کا مدمقابل ہے۔ اس کا مقصد فقط نباتات و جمادات کا گنوانا نہیں وہ اپنی آنکھوں سے آزادانہ دیکھتا ہے۔ دوسروں کی آنکھوں کے سامنے ظاہری اور دل کی آنکھوں کے سامنے ایک غیر فانی نقشہ پیش کرتا ہے جس میں جذبات اور حواس سب کا امتزاج ہے۔ یہی آزاد نگاہی ہے جو حفیظ کو یورپ زدہ شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ تم ان لوگوں کو چھوڑ دو وہ نیچرل شاعری کو محض اس لیے سراہتے ہیں کہ یورپ اسے پسند کرتا ہے اور ان کو بھی جو اپنی بے بسی پر تقلید مغرب سے تنفر کا پردہ ڈالتے ہیں۔ ان تعصبات سے بالا ہو کر دیکھو کہ نیچرل شاعری کا اصلی مقصد کیا ہے اور کیا حفیظ اس مقصد میں کامیاب ہے؟

امرؤ القیس کو لو کہ حواس ظاہری کا استعمال اس سے زیادہ خوبی سے اور کون کر سکتا تھا؟ برسات کا سماں دکھاتے ہوئے کہتا ہے۔

کَأنَّ ثَبِیْرًا فِی عَرَانِیْنِ وَبْلِهٖ   کَبِیْرُ اُنَاسٍ فِی بِجَادٍ مُزَمَّلٖ

موسلا دھار بارش میں کوہ ثبیر یوں نظر آتا ہے جیسے کوئی بوڑھا سفید دھاری والا سیاہ کمبل اوڑھے ہوئے کھڑا ہو۔

عتابی کہتا ہے:

والغیمُ کالثوب فی الأفاق منتشر

یعنی گھٹا اس طرح ہے جیسے کوئی کپڑا تنا ہوا ہو۔ پھر کہتا ہے کہ یہ کپڑا بظاہر بالکل ٹھوس

معلوم ہوتا ہے لیکن دھاریں بہنے لگیں تو خیال ہوتا ہے کہ اس میں سوراخ ہو گئے ہیں اور گرجنے لگے تو کہو گے کہ ''وہ پھٹا'' اگر بجلی چمکے تو کہو گے کپڑے میں آگ لگ گئی۔

یہ تو تھے کھلی ہوا میں رہنے والے عرب جنہیں مناظر قدرت سے خاص دلبستگی تھی۔ ایرانی شعرا کا انداز دیکھو۔

فارسی شاعری کے ابوالآباء رودکی کی غزل سنو:

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی | یادِ یارِ مہرباں آید ہمی
ریگِ آمو و درشتی ہائے اُو | زیرِ پایم پرنیاں آید ہمی

کہتے ہیں رودکی نابینا تھا اور گویا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ ہمارے شعراء کے خلاف وہ بصارت کے علاوہ قوت لامسہ، سامعہ و شامہ کو بھی استعمال کرتا ہے۔ پہلے شعر میں مولیاں کی بو یاد ہے اور دوسرے میں آمو دریا کی ریگ کے لمس کا تذکرہ ہے۔

منوچہری کہ نیچرل شاعری کا باوا آدم ہے ایک مرغ آبی کی آزادی کا نقشہ کھینچتا ہے۔

برساعتکی بط نخنے چند بگوید | درآب جہد جامہ دگربار بشوید
درآب کند گردن و درآب بروید | گوئی کہ مگر چیز کے درآب بجوید
چوں سینہ بجنباند و یک لخت بپوید | از ہر سر پرش بجہد صد در شہوار

بط پانی کی سطح پر تیرتی پھرتی دکھائی دیتی ہے!

متاخرین شعرائے قاچار میں قاآنی اس صنف کا استاد سمجھا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں وہ واقعہ بندی کا استاد ضرور ہے مگر منظر کشی کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ اس کا وہ مشہور بہاریہ قصیدہ لے لو جو اس نے میرزا تقی خاں کی شان میں لکھا ہے۔ تم دیکھو گے کہ عبارت کی روانی، لغت کی وسعت، محاکات کی درستی غرض شاعری کے حسن کا بہترین نمونہ موجود ہے۔ ہر شعر ایک مستقل تصویر ہے مگر تمام اشعار مل کر ایک متحد منظر پیش نہیں کرتے اور ایک شعر دوسرے شعر پر کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ قاآنی جملہ حواس خمسہ کو استعمال کرتا ہے مگر ان سب کو ممتزج کر کے ایک متوازن نقشہ نہیں بناتا۔

نسیم خلد می وزد مگر زجوئبار ہا
کہ بوئے مشک می دہد ہوائے مرغزار ہا
زنائے خویش فاختہ دو صد اصول ساختہ
ترانہا نواختہ چو زیروبم تار ہا

دیکھو فاختہ، ساختہ اور نواختہ کے اندرونی قوافی کس قدر مترنم ہیں۔ اگلے شعر میں یہ اثر اور بھی تیز ہو جاتا ہے۔

ز ریزشِ سحابہا برآبہا حبابہا
چو جوئے نقرہ آبہا رواں ور آبشارہا

جوئبار کی ہوائیں اور مرغزار کی خوشبو، طیور کی صدائیں اور حبابِ آبجو کے نقشے خوب ہیں مگر ان طویل جزئیات کے بعد پھر وہی۔

فرازِ سروِ بوستاں نشستہ اند قمریاں
چو مقریاں نغز خواں بہ زمردیں منار ہا

اس کی تشبیہات بھی کئی دفعہ محض بے جان رسمی صفات کا اعادہ ہوتی ہیں مثلاً ابوالمظفر محمد شاہ کی مدح میں لکھتا ہے۔

از سبزہ چمن چو روضہ رضواں
از لالہ دمن چو سینہ سینا

حضرت علی بن موسیٰ الرضاؑ کی مدح میں۔

ز فرِ لالہ و سوسن ز نورِ نور و نسترون
دمن چوں وادیٔ ایمن چمن چوں سینۂ سینا

نہایت اچھے الفاظ ہیں مگر حاصل کچھ بھی نہیں۔

قدیم اردو شعرا نے بھی اس فرسودہ طرز کا تتبع کیا۔ سودا کا پیش کردہ منظر دیکھیے ۔

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

تارِ بارش میں پروتے ہیں گہرہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
عکس گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے
کارِ نقاشیِ مانی ہے دوم وہ اوّل

اسی پر محسن کاکوروی لکھتا ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

دونوں قصیدے مردہ الفاظ کے چنگیزی مینار ہیں البتہ محسن کہیں کہیں عربی تشبیہات سے تازگی پیدا کر دیتا ہے۔

ذوق کے قصیدے بھی اسی قماش کے ہیں۔ ؎

یہ آیا جوش پہ بارانِ رحمت باری
کہ سنگ سنگ میں ہے سنگ دیدہ کی تاثیر

مرزا غالب بھی اردو میں حسن تعلیل تک ہی پہنچتے ہیں۔ ؎

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

اس بحث سے میرا مقصد یہ ہے کہ قدیم ایرانی و عرب شعراء کے بعد ایشیائی شاعری سے صحیح منظر کشی مفقود ہو گئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ بادیہ نشینی پر شہری تہذیب نے غلبہ پا لیا۔

اسی سبب سے جب لاہور کے مشاعروں میں آزاد مرحوم نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونکنی چاہی تو ان کے سامنے فقط ہولرائیڈ صاحب کے بتائے ہوئے سطحی اصول تھے اور بس۔

جب حفیظ اس قسم کے اصول سے آزاد ہو کر اس میدان میں اترا تو اس کی حالت بعینہ ان شعرا کی طرح تھی جو اپنے لیے خود مشعل راہ تھے اور ادبی روایات کی بجائے محض اپنے حواسِ خمسہ کی پیروی کرتے تھے۔

حفیظ کے مناظر اس کی آزادنگہی پر دال ہیں۔

''عتابی'' کی تشبیہہ ''الغیم کالثوب اور ابوتمام کی مشہور'' قوس قزح''

کا ذیال خود اقبلت فی غلائلٍ
مصبغةٍ والبعض اقصر من بعضٍ

یعنی قوس قزح کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوشیزہ رنگ برنگ کے باریک کپڑے پہن کر نکل آئی ہے اور ہر کپڑا دوسرے سے چھوٹا اور اونچا ہے یہ اسی آزادنگہی کے شاہکار ہیں حفیظ متقدمین سے رتبے میں کم نہیں۔ اس کا زاویہ نگاہ وہی ہے۔ ''شام'' کے ایک منظر میں حفیظ لکھتا ہے

کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو

کیسی اچھوتی تشبیہہ ہے اور اس لحاظ سے کہ اس کے بعد پنگھٹ کے جمگھٹوں کا نقشہ ہے کس قدر مناسب ہے۔

شام کے سیاہ اور سرخ رنگ ہر شاعر کی نظر میں ہوتے ہیں لیکن اردو شاعری کی کم مائیگی اور ''ڈگر پرستی'' کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہوسکتی کہ ''نیلگوں سرخی'' کا سا پیش پا افتادہ مضمون فقط حفیظ ہی کو سوجھا اس کی وجہ وہی آزادنگہی ہے۔ ایک اور نظم میں شام کے متعلق لکھتا ہے۔

وہ شفق کے بادلوں میں نیلگوں سرخی کا رنگ
اور راوی کی سنہری نقرئی لہروں میں جنگ

یہی شام کا مضمون کسی اور جگہ یوں بندھا۔

بن گیا ہے آسماں نتھرے ہوئے پانی کی جھیل
یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل

یہ شام لب دریا کی شام ہے اس لیے تشبیہہ بھی اسی انداز کی ہے۔ ''تاروں بھری رات'' میں جھیل کو ''ضوریز قندیل'' لکھا ہے مگر بڑھتی ہوئی تاریکی کا بہترین نقشہ ایک تازہ نظم میں ہے۔ ہر تشبیہہ اچھوتی اور ''مصور'' ہے۔

شام آئی ہے سکوں کے جال پھیلائے ہوئے
ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے
اس طرح اونچے پہاڑوں میں گھری ہیں وادیاں
جس طرح دیووں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں
جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چپ ہو گئیں
بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں
بے زبان خاموشیاں جاگیں صدائیں سو گئیں
شورشیں چپ ہو گئیں خاموشیوں میں کھو گئیں

دیکھو! ایک ہی مضمون کو کس قدر تنوع اور تازگی سے پیش کیا ہے۔

مگر شاعر ایک سچا شاعر ان ظاہر حواس کے تاثرات سے دیر تک مطمئن نہیں رہ سکتا۔ حفیظ پہلے ہی ان سطحی مناظر سے عمیق جذبات کو ملا دیتا ہے اور ''نغمہ زار'' کے بعد کی نظمیں تو تمام تر اسی راہ کے ارتقائی مراحل ہیں۔

مکرر آنکہ...... نیچرل شاعری کے سلسلے میں حفیظ کی ایک اور خصوصیت قابل ذکر ہے جو ہم عصر شعراء میں نادر نہیں بلکہ معدوم ہے۔ یہ ''لوکل کلر'' (مقامی رنگ) ہے مناظر قدرت کی نقل ہی میں نہیں بلکہ ان کے جذباتی ماحول میں بھی اس کا استعمال نمایاں ہے۔ ''طوفانی کشتی'' پانچ دریاؤں کے ملک کا سچا ڈرامہ ہے۔ اسی طرح پنجاب کی دیہاتی زندگی کے اور بہت سے نقشے نظر آتے ہیں۔

تاثیر

۱۹۳۳ء

ترنم

ذکر کس کا ہے رواں قلب سے تا حبلِ ورید
میرے ہم راز، مرے دوست، مرے یار بتا!

عشق بھی حسن ہے

خامہ انوار فشاں منزلِ دلخواہ میں ہے
برقِ ایمن کا اثر ایک پرکاہ میں ہے
طور مشعل لیے ہر ہر قدم اس راہ میں ہے
کبھی خورشید میں ہے فکر کبھی ماہ میں ہے
دل یہ کہتا ہے کہ ہر ذرّے کو موسیٰ کر دوں
آنکھ جس کوہ پہ ڈالوں اُسے سینا کر دوں
بادۂ صدق سے لبریز ہے مینائے سخن
چھلکی پڑتی ہے مرے جام سے صہبائے سخن
ضوفگن سینے میں ہے طورِ تجلائے سخن
آج خود محوِ تماشا ہے تماشائے سخن
کس کے دربار میں مصروفِ عقیدت ہوں میں؟
سر بسر غوطہ زنِ بحرِ محبت ہوں میں

کس کے پرتو سے پرانوار ہے چہرا میرا
کہ تماشائی ہے ہر دیدۂ بینا میرا
جس کو دیکھو وہی بے تابِ تماشا میرا
جانے کیا دیکھتا ہے دیکھنے والا میرا

عشق بھی حسن ہے ایسا نظر آتا ہے مجھے
پس پردہ کوئی بیٹھا نظر آتا ہے مجھے

سحر

(۱)

تمام ملکِ ہست پر　　بلند اور پست پر
قلمروِ حیات پر
بساطِ کائنات پر
خموشیوں کا ہے چلن　　سکوت حکمران ہے
فسونِ مرگ سکہ زن　　حیات بے نشان ہے
وہ جوشِ زندگی نہیں
ہنسی نہیں خوشی نہیں
وجود بے وجود ہے　　جمود ہی جمود ہے
تمام ملکِ ہست پر
بلند اور پست پر

(۲)

خموشیوں کا راج ہے　　نہ تخت ہے نہ تاج ہے
امیرِ کج کلاہ چپ
فقیرِ خانقاہ چپ

ہوئے خوشی سے ہم بغل　　الم نصیب نیند میں
بنے ہیں صاحب دُوَل　　کئی غریب نیند میں

نہ حسرتیں نہ خواہشیں
نہ محنتیں نہ کاہشیں

نہ رنجشیں نہ اُلفتیں　　مسرتیں نہ کلفتیں

خموشیوں کا راج ہے
نہ تخت ہے نہ تاج ہے

(۳)

فلک پر ایک کارواں　　کہاں سے آ گیا کہاں

کوئی صدائے پا نہیں
جرس نہیں درا نہیں

مسافرانِ شب مگر　　تھکن سے چور ہو گئے
نہ ختم ہو سکا سفر　　تو چلتے چلتے سو گئے

یہ انجمن کی انجمن
ہے خامشی میں غوطہ زن

سرود اس کی خامشی　　سفر نصیب زندگی

فلک پر ایک کارواں
کہاں سے آ گیا ہوں

(۴)

یکایک ایک نور کا   غبار شرق سے اٹھا
جو رفتہ رفتہ بڑھ چلا
اور آسماں پہ چھا گیا
حسینۂ نمود نے   یہ نقاب اٹھا دیا
فسوں گرِ شہود نے   طلسمِ شب مٹا دیا
یکایک ایک تازگی
یکایک ایک روشنی
نگاہِ جاں میں آ گئی   حیات میں سما گئی
یکایک ایک نور کا
غبار شرق سے اُٹھا

(۵)

چلا ستارۂ سحر   سنا کے صبح کی خبر
زمیں پہ نور چھا گیا
فلک پہ رنگ آ گیا
شرار زادگانِ شب   چمک چمک کے سو گئے
بروئے آسمانِ شب   دمک دمک کے سو گئے
چراغ سرد ہو چکے
ستارے زرد ہو چکے

وہ ٹمٹما کے رہ گئے　　　یہ جھلملا کے رہ گئے

چلا ستارۂ سحر

سنا کے صبح کی خبر

(۶)

عبادتوں کے در کھلے　　　سعادتوں کے گھر کھلے

درِ قبول وا ہوا

دعا کا وقت آ گیا

اذان کی صدا اٹھی　　　جگا دیا نماز کو

چلی ہے اٹھ کے بندگی　　　لیے ہوئے نیاز کو

صنم کدہ بھی کھل گیا

اٹھا ہے شور سنکھ کا

اٹھو پجاریو! اٹھو　　　چلو نمازیو! چلو

عبادتوں کے در کھلے

سعادتوں کے گھر کھلے

(۷)

کسان اٹھ کھڑے ہوئے　　　مویشیوں کو لے چلے

کہیں مزے میں آ گئے

تو کوئی تان اڑا گئے

یہ سرد شبنمی ہوا یہ صحت آفریں سماں
یہ فرش سبز گھاس کا یہ دل فریب آسماں
بسے ہوئے ہیں پریت میں
ہیں محو ان کے گیت میں
کہاں ہیں شہر کے مکیں وہ بے نصیب اٹھے نہیں
کسان اٹھ کھڑے ہوئے
مویشیوں کو لے چلے

(۸)

کھلا وہ حجلۂ سحر ہوا وہ حسن جلوہ گر
وہ مسکرا کے اک کرن
ہوئی افق پہ خندہ زن
وہ برق سی چمک اٹھی سحاب کے غبار میں
وہ آگ سی بھڑک اٹھی اُفق کے لالہ زار میں
وہ ذرّہ ذرّہ خاک کا
نظر فروز ہو گیا
وہ قطرہ قطرہ آب کا چمک اٹھا دمک اٹھا
کھلا وہ حجلۂ سحر
ہوا وہ حسن جلوہ گر

(۹)

اٹھی حسینۂ سحر پہن کے سر پہ تاجِ زر
لباس نور زیبِ بر
چڑھی فرازِ کوہ پر
وہ خندۂ نگاہ سے پہاڑ طور بن گئے
وہ عکسِ جلوہ گاہ سے سحاب نور بن گئے
نوائے جوئبار اٹھی
صدائے آبشار اُٹھی
ہواؤں کے رباب اٹھے خوش آمدید کے لیے
اٹھی حسینۂ سحر
پہن کے سر پہ تاجِ زر

(۱۰)

نسیم سرسرا گئی چمن میں گل کھلا گئی
کلی کو گدگدا گئی
تو پھول کو ہنسا گئی
طرب کے سیلِ نور سے جہاں کی نیند ڈھل گئی
حیات کے وفور سے خوشی کی آنکھ کھل گئی
گلوں کی نکہتیں اٹھیں
ہوا کے دوش پر چلیں

پڑی جو مہر کی نظر تو اوس بن گئی گہر
نسیم سرسرا گئی
چمن میں گل کھلا گئی

(۱۱)

پرند نغمہ ریز ہیں ہوائیں عطر بیز ہیں
ہے طائروں کی راگنی
فضاؤں میں بسی ہوئی
ہوا کی لرزشیں بڑھیں چمن کی نہر جاگ اٹھی
ضیا کی بارشیں ہوئیں ہر ایک لہر جاگ اٹھی
ترنمِ ہزار سے
گلوں کو وجد آ گئے
ترانے سن کے حمد کے درخت جھومنے لگے
پرند نغمہ ریز ہیں
ہوائیں عطر بیز ہیں

(۱۲)

کنارِ گنگ برہمن جوان و پیر، مرد و زن
چڑھا کے دیوتا کو جل
وہ جھک رہے ہیں سر کے بل

وہ اِک حسین گھاٹ پر نہا رہے ہیں گلبدن
بروئے آب سر بسر کھلا ہوا ہے اِک چمن
وہ اِک مہاتپسوی
بہت بڑا جتی ستی
ہے اور ہی جہان میں لگا ہے گیان دھیان میں
کنارِ گنگ برہمن
جوان و پیر، مرد و زن

(۱۳)

اُٹھے حسین خواب سے کہ دھوئیں منہ گلاب سے
یہ عشوہ سازیوں میں ہیں
ادا طرازیوں میں ہیں
اُدھر سے عشق بھی اٹھا مگر ہے اپنی ہانک میں
اُدھر گیا اِدھر پھرا فضول تاک جھانک میں
شباب جس کی رات بھی
نشاط و عیش میں کٹی
وہ نیند ہی کا ہو گیا اٹھا پھر اٹھ کے سو گیا
اُٹھے حسین خواب سے
کہ دھوئیں منہ گلاب سے

(۱۴)

طرب نواز جاگ اٹھے اوران کے ساز جاگ اٹھے
ہوا ہے راگ منتشر
فضا میں کھیل کھیل کر
اُمنگ کے خروش میں خیال کی ترنگ میں
سب اپنے اپنے جوش میں سب اپنے اپنے رنگ میں
اساوری کی لے اٹھی
دلوں کو مست کر گئی
ہواؤں میں سما گئی فضاؤں کو بسا گئی
طرب نواز جاگ اُٹھے
اوران کے ساز جاگ اُٹھے

فرصت کی تمنا میں

یوں وقت گزرتا ہے فرصت کی تمنا میں
جس طرح کوئی پتا
بہتا ہوا دریا میں
ساحل کے قریب آ کر
چاہے کہ ٹھہر جاؤں
اور سیر ذرا کر لوں اس عکسِ مشجر کی
جو دامنِ دریا پر زیبائشِ دریا ہے
یا باد کا وہ جھونکا
جو وقفِ روانی ہے
اِک باغ کے گوشے میں
چاہے کہ یہاں دم لوں
دامن کو ذرا بھر لوں
اس پھول کی خوشبو سے جس کو ابھی کھلنا ہے

فرصت کی تمنا میں یوں وقت گزرتا ہے

افکار معیشت کے فرصت ہی نہیں دیتے

میں چاہتا ہوں دل سے
کچھ کسبِ ہنر کر لوں
گلہائے مضامیں سے
دامانِ سخن بھر لوں
ہے بخت مگر واژوں
فرصت ہی نہیں ملتی

فرصت کو کہاں ڈھونڈوں فرصت ہی کا رونا ہے

پھر جی میں یہ آتی ہے
کچھ عیش ہی حاصل ہو
دولت ہی ملے مجھ کو
وہ کام کوئی سوچوں
پھر سوچتا یہ بھی ہوں

یہ سوچنے کا دھندا فرصت ہی میں ہونا ہے
فرصت ہی نہیں دیتے افکار معیشت کے

چاند کی سیر

عطر بیز لالہ زار نغمہ ریز جوئبار
حشر خیز آبشار
کیفِ موجِ بےقرار چاندنی میں کوہسار تھا بہار در بہار
میں یہ شانِ کردگار
دیکھتا چلا گیا

شہر اور بن خموش دشت اور چمن خموش
تن خموش من خموش
سب جہاز راں خموش کشتیِ رواں خموش بحرِ بےکراں خموش
اور میں بھی ہاں خموش
دیکھتا چلا گیا

دور اور قریب چپ ہر طرف عجیب چپ
خوشنما مہیب چپ

کائنات پرسکوت سارا خشک و ترسکوت شور کا اثر سکوت
کچھ نہیں مگر سکوت
دیکھتا چلا گیا

وہ کنارِ آب کی محفلیں شراب کی
مستیاں شباب کی
خواہشیں ثواب کی کاہشیں عذاب کی وہم اور خواب کی
زندگی حباب کی
دیکھتا چلا گیا

حسن شانِ ناز میں غرق احتراز میں
عاشقی نیاز میں
اس کی خود فروشیاں اور سخت کوشیاں اس طرف خموشیاں
صبر ، گرم جوشیاں
دیکھتا چلا گیا

پاکباز نازنیں وقفِ آہِ آتشیں
مرگ و یاس در کمیں
اِک جوانِ خود پرست بادۂ خودی سے مست شوخ اور دراز دست
میں یہ سب بلند و پست
دیکھتا چلا گیا

رنجشیں ، کدورتیں برہمی کی صورتیں
ساری آشنائیاں ظاہری صفائیاں باطنی برائیاں
صلح اور لڑائیاں
دیکھتا چلا گیا
دوست کے فراق میں جوشِ اشتیاق میں
پائے چست و چاق میں
گردشوں کو باندھ کر محوِ کلفتِ سفر ایک جوانِ بے جگر
دل بھر آیا ، مَیں مگر
دیکھتا چلا گیا
بادشاہ کا مزار جس سے عبرت آشکار
بے کسی بھی سوگوار
اور گدا کی قبر پر جمع سینکڑوں بشر میں یہ فقر کا اثر
اور مآلِ مال و زر
دیکھتا چلا گیا

عصمت

اوّلین دختر ارشاد بتول (مرحومہ) کی ولادت پر

اے کہ ہے صبحِ ازل تیرے تبسم کی ضیا
تو کرن سورج کی ہے یا کوئی ٹکڑا نور کا
تیرے چہرے سے عیاں ہے رنگِ تنویرِ حیا
کلکِ قدرت نے بنایا تجھ کو تصویرِ حیا
تو امانت صادق الوعد وامیں سے آئی ہے
تو بشارت رحمۃ للعٰلمیں سے آئی ہے
اے خوشا میں بھی امانت دار ٹھہرایا گیا
اے خوشا مجھ پر بھی یہ احسان فرمایا گیا
صورتِ عفت سراپا پیکر عصمت ہے تو
آیۂ رحمت ہے تو سرمایۂ عزت ہے تو
اے خدا احسان اٹھالینے کی طاقت دے مجھے
حق ادا کرنے کی ہمت اور لیاقت دے مجھے

ابھی تو میں جوان ہوں

ہوا بھی خوشگوار ہے گلوں پہ بھی نکھار ہے
ترنمِ ہزار ہے بہار پُر بہار ہے
کہاں چلا ہے ساقیا!
اِدھر تو لوٹ ادھر تو آ
ارے یہ دیکھتا ہے کیا
اٹھا سبو ، سبو اُٹھا
سبو اٹھا پیالہ بھر پیالہ بھر کے دے اِدھر
چمن کی سمت کر نظر سماں تو دیکھ بے خبر
وہ کالی کالی بدلیاں
افق پہ ہو گئیں عیاں
وہ اک ہجومِ مے کشاں
ہے سوئے میکدہ رواں
یہ کیا گماں ہے بدگماں سمجھ نہ مجھ کو ناتواں
خیالِ زہد ابھی کہاں

ابھی تو میں جوان ہوں

عبادتوں کا ذکر ہے نجات کی بھی فکر ہے
جنون ہے ثواب کا خیال ہے عذاب کا
مگر سنو تو شیخ جی
عجیب شے ہیں آپ بھی
بھلا شباب و عاشقی
الگ ہوئے بھی ہیں کبھی

حسین جلوہ ریز ہوں ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں تو شوق کیوں نہ تیز ہوں
نگار ہائے فتنہ گر
کوئی اِدھر کوئی اُدھر
ابھارتے ہوں عیش پر
تو کیا کرے کوئی بشر!

چلو جی قصہ مختصر تمھارا نقطۂ نظر
درست ہے تو ہو مگر
ابھی تو میں جوان ہوں

یہ گشت کوہسار کی یہ سیر جوئبار کی
یہ بلبلوں کے چہچہے یہ گل رخوں کے قہقہے

کسی سے میل ہو گیا
تو رنج و فکر کھو گیا
کبھی جو بخت سو گیا
یہ ہنس گیا وہ رو گیا

یہ عشق کی کہانیاں یہ رس بھری جوانیاں
اُدھر سے مہربانیاں اِدھر سے لن ترانیاں

یہ آسمان یہ زمیں
نظارہ ہائے دل نشیں
انھیں حیات آفریں
بھلا میں چھوڑ دوں یہیں!

ہے موت اس قدر قریں مجھے نہ آئے گا یقیں
نہیں نہیں ابھی نہیں
ابھی تو میں جوان ہوں

نہ غم کشود و بست کا بلند کا نہ پست کا
نہ بود کا نہ ہست کا نہ وعدۂ الست کا

اُمید اور یاس گم
حواس گم ، قیاس گم
نظر سے آس پاس گم

ہمہ بجز گلاس گم

نہ مے میں کچھ کمی رہے قدح سے ہمدمی رہے
نشست یہ جمی رہے یہی ہما ہمی رہے

وہ راگ چھیڑ مطربا!
طرب فزا ، الم رُبا
اثر صدائے ساز کا
جگر میں آگ دے لگا

ہر ایک لب پہ ہو صدا نہ ہاتھ روک ساقیا
پلائے جا پلائے جا
ابھی تو میں جوان ہوں

برسات

آئی ہے برسات
چھائی ہے برسات
کوہ و دمن پر دشت و چمن پر
شہر اور بن پر
دوشیزہ جوبن بے ساختہ پن
رنگیں جوانی سبز اور دھانی
گل پوش جلوے مدہوش نغمے
دل کش فضائیں
ٹھنڈی ہوائیں
اُودی گھٹائیں لائی ہے برسات
آئی ہے برسات چھائی ہے برسات
گھِر گھِر کے آیا
ہر پھر کے چھایا

تند اور دھواں دھار　　تاریک و بسیار

ابرِ　گہر　بار

بجلی　چمکنا　　آنکھیں　جھپکنا

توبہ　یہ　کڑکا　　سینوں　کا　دھڑکا

بوندوں کی بھر مار　　مینہ موسلا دھار

ہر سمت یک دم　　جل تھل کا عالم

پُر　کیف　موسم

حق　نے　دکھایا

گھر گھر کے آیا　　ہر پھر کے چھایا

بیٹھے ہیں مے خوار

نشوں　میں　سرشار

گھر بار برباد　　مے خانے آباد

بندش　سے　آزاد

جیبیں ہیں خالی　　ہمت ہے عالی

پروا نہیں ہے　　دھڑکا نہیں ہے

قرض آج ساقی　　دیتا ہے خود ہی

دریا دلی سے　　سو دلبری سے

اپنی خوشی سے

بے عذر و تکرار

بیٹھے ہیں مے خوار نشوں میں سرشار

آموں کے نیچے

ڈالے ہیں جھولے

مہ پیکروں نے سیمیں تنوں نے

برق افگنوں نے

گیت انکے پیارے میٹھے رسیلے

ہلکی صدائیں سادہ ادائیں

گل پیرہن ہیں غنچہ دہن ہیں

خود مسکرانا خود منہ چڑانا

پھر جھینپ جانا

الھڑپنے سے

آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھولے

اٹھلا رہی ہیں

اترا رہی ہیں

خوبانِ ہندی حورانِ ارضی

شمعیں گھروں کی

نازک دوپٹے رنگین ہلکے
سر پر سنبھالے شانوں پہ ڈالے
مینہ لاکھ برسے جی لاکھ ترسے
نکلیں نہ گھر سے شوہر کے ڈر سے
اپنی نظر سے
شرما رہی ہیں
اٹھلا رہی ہیں اترا رہی ہیں
بے فکر آزاد
خوش باش دلشاد
نادان انجان کرتی ہیں سامان
پکتے ہیں پکوان
نوخیز کم سن ہم عمر ہم سن
ننھے فرشتے اور ناطے رشتے
گڑیا کی شادی مل کر رچا دی
ڈھولک بجانا
مل مل کے گانا
سب کچھ بھلانا ماں بھی نہیں یاد

بے فکر آزاد　　خوش باش دِلشاد
گلشن کی دنیا
ہے مست صہبا
جوشِ نمو سے　　رنگ اور بو سے
حق سرہٗ سے
کوئل کی آواز　　مستی کی غماز
ہر برگ مے نوش　　ہر شاخ مدہوش
پھولوں کی بستی　　ہے غرقِ مستی
مے کش پپیہے
ہیں مست پی کے
بلبل کے نغمے　　مستی سراپا
گلشن کی دنیا　　ہے مست صہبا
زاہد کی گھاتیں
بے کار باتیں
عقبےٰ کے جھگڑے　　جنت کے قصے
پینے کے طعنے
یہ بھی رہا خوب　　واللہ کیا خوب

رِند اور ہٹ جائیں! ہم اور پلٹ جائیں!
مے خانہ چھوڑیں! شیشوں کو توڑیں!
دل پر کریں جبر! عشاق اور صبر!
یہ رُت ہو یہ ابر
یہ دن یہ راتیں!
زاہد کی گھاتیں بے کار باتیں

کرشن کنھیا

اے دیکھنے والو اس حسن کو دیکھو اس راز کو سمجھو
یہ نقشِ خیالی یہ فکرتِ عالی
یہ پیکرِ تنویر یہ کرشن کی تصویر
معنی ہے کہ صورت صنعت ہے کہ فطرت
ظاہر ہے کہ مستور نزدیک ہے یا دُور یہ نار ہے یا نور

دنیا سے نرالا یہ بانسری والا گوکل کا گوالا
ہے سحر کہ اعجاز کھلتا ہی نہیں راز
کیا شان ہے واللہ کیا آن ہے واللہ
حیران ہوں کیا ہے اِک شانِ خدا ہے
بت خانے کے اندر خود حسن کا بت گر بت بن گیا آ کر

وہ طرفہ نظارے　　یاد آ گئے سارے　　جمنا کے کنارے

سبزے کا لہکنا　　پھولوں کا مہکنا

گھنگھور گھٹائیں　　سر مست ہوائیں

معصوم اُمنگیں　　الفت کی ترنگیں

وہ گوپیوں کے ساتھ　　ہاتھوں میں دیے ہاتھ　　رقصاں ہوا برج ناتھ

بنسی میں جو لے ہے　　نشہ ہے نہ مے ہے　　کچھ اور ہی شے ہے

اک روح ہے رقصاں　　اک کیف ہے لرزاں

اِک عقل ہے مے نوش　　اِک ہوش ہے مدہوش

اِک خندہ ہے سیّال　　اِک گریہ ہے خوشحال

اک عشق ہے مغرور　　اِک حسن ہے مجبور　　اک سحر ہے مسحور

دربار میں تنہا　　لاچار ہے کرشنا　　آ شیام اِدھر آ

سب اہلِ خصومت　　ہیں در پئے عزت

یہ راج دُلارے　　بزدل ہوئے سارے

پردہ نہ ہو تاراج　　بیکس کی رہے لاج

آ جا میرے کالے　　بھارت کے اجالے　　دامن میں چھپا لے

وہ ہو گئی اَن بن وہ گرم ہوا رَن غالب ہے دریودھن
وہ آ گئے جگدیش وہ مٹ گئی تشویش
اُرجن کو بلایا اُپدیش سنایا
غم زاد کا غم کیا استاد کا غم کیا
لو ہو گئی تدبیر لو بن گئی تقدیر لو چل گئی شمشیر

سیرت ہے عدو سوز صورت نظر افروز دل کیفیت اندوز
غصے میں جو آ جائے بجلی ہی گرا جائے
اور لطف پہ آئے تو گھر بھی لٹائے
پریوں میں ہے گلفام رادھا کے لیے شیام
بلرام کا بھیا متھرا کا بسیّا بندرا میں کنھیا

بن ہو گئے ویراں برباد گلستاں سکھیاں ہیں پریشاں
جمنا کا کنارا سنسان ہے سارا
طوفان ہیں خاموش موجوں میں نہیں جوش
لَو تجھ سے لگی ہے حسرت ہی یہی ہے
اے ہند کے راجا اک بار پھر آ جا دکھ درد مٹا جا

ابر اور ہوا سے   بلبل کی صدا سے   پھولوں کی ضیا سے

جادُو اثری گم!   شوریدہ سری گم!

ہاں تیری جدائی   متھرا کو نہ بھائی

تو آئے تو شان آئے   تو آئے تو جان آئے

آنا نہ اکیلے

ہوں ساتھ وہ میلے

سکھیوں کے جھمیلے

طوفانی کشتی

دریا چڑھاؤ پر ہے　　　اور بوجھ ناؤ پر ہے
پہنائے آب سارا
ہے کوچ کا اشارا
ہوش آزما نظارا
موجوں کے منہ میں کف ہے　　　اک شور ہر طرف ہے
مرگ آفریں ہے دھارا
اور دور ہے کنارا
کوئی نہیں سہارا
تیغ آزما ہیں لہریں　　　تیغیں ہیں یا ہیں لہریں
توبہ ہوا کی تیزی
موجِ فنا کی تیزی
ہے کس بلا کی تیزی

تدبیر ناخدا کیا   چپو کا آسرا کیا
گرداب پڑ رہے ہیں
کشتی سے لڑ رہے ہیں
تختے اکھڑ رہے ہیں

نغموں کا جوش خاموش   سب ناؤ نوش خاموش
ہے یہ برات کس کی
نوشاہ اور براتی
لوٹے ہیں لے کے ڈولی

مایوس ہیں نگاہیں   رقصاں لبوں پر آہیں
ڈولی میں حور پیکر
کیا کانپتی ہے تھر تھر
لیکن ہے مہر لب پر

دولھا کے سر پہ سہرا   لیکن اداس چہرا
عشرت کی آرزو تھی
الفت کی جستجو تھی
اُمید روبرو تھی

یہ انقلاب کیا ہے   آغوشِ مرگ وا ہے
کیا ہو گیا الٰہی!

کیوں آ گئی تباہی
قسمت کی کم نگاہی

دل سرد ہو رہے ہیں ‏ ‏ رُخ زرد ہو رہے ہیں
اس محشرِ بلا میں
اس لجۂ فنا میں
اس سیل بادپا میں

سب اہل یاس گم ہیں ‏ ‏ ہوش و حواس گم ہیں
کچھ محو ہیں دعا میں
کچھ نالہ و بکا میں
کچھ شکوۂ خدا میں

بیٹھی ہے ایک بیوہ ‏ ‏ ہے صبر جس کا شیوہ
دل ہاتھ سے دبائے
بچہ گلے لگائے
تیرِ امید کھائے

یہ باپ کی نشانی ‏ ‏ سرمایۂ جوانی
اک دن جوان ہو گا
اماں کا مان ہو گا
حق مہربان ہو گا

اِک نوجواں بداختر بھاگا ہے گھر سے لڑ کر
چھوڑے تھے باپ ماں بھی
بیوی بھی اور مکاں بھی
اب چھوڑتا ہے جاں بھی
اے کاش میں نہ آتا اے کاش لوٹ جاتا
اے طبعِ خود سر افسوس
اے طیش تجھ پر افسوس
افسوس یکسر افسوس
یہ دیو زاد فوجیں یہ بد نہاد موجیں
آیا پھر ایک ریلا
کشتی بنی ہے تنکا
بس ہو چلا صفایا
تدبیر رو رہی ہے تقدیر سو رہی ہے
ملاح تیر نکلے
دریا میں پیر نکلے
افسوس غیر نکلے

طوفانِ غم بپا ہے فریاد کی صدا ہے
ہے کون جو سنبھالے
کشتی ترے حوالے
یا رب تو ہی بچا لے
اے نوح کے کھوّیا لگ جائے پار نیّا
بندوں کا تو خدا ہے
اور تو ہی ناخدا ہے
تیرا ہی آسرا ہے

بسنتی ترانہ

لو پھر بسنت آئی   پھولوں پہ رنگ لائی
چلو بے درنگ   لبِ آبِ گنگ   بجے جل ترنگ
من پر امنگ چھائی   پھولوں پہ رنگ لائی
لو پھر بسنت آئی

آفت گئی خزاں کی   قسمت پھری جہاں کی
چلے مے گسار   سوئے لالہ زار   مئے پردہ دار
شیشے کے در سے جھانکی   قسمت پھری جہاں کی
آفت گئی خزاں کی

کھیتوں کا ہر چرندہ   باغوں کا ہر پرندہ
کوئی گرم خیز   کوئی نغمہ ریز   سبک اور تیز
پھر ہو گیا ہے زندہ   باغوں کا ہر پرندہ
کھیتوں کا ہر چرندہ

دھرتی کے بیل بوٹے   اندازِ نو سے پھوٹے
ہوا بخت سبز   ملا رخت سبز   ہیں درخت سبز
بن بن کے سبز نکلے   اندازِ نو سے پھوٹے
دھرتی کے بیل بوٹے

پھولی ہوئی ہے سرسوں بھولی ہوئی ہے سرسوں
نہیں کچھ بھی یاد یونہی بامراد یونہی شاد شاد
گویا رہے گی برسوں بھولی ہوئی سرسوں
پھولی ہوئی ہے سرسوں

لڑکوں کی جنگ دیکھو ڈور اور پتنگ دیکھو
کوئی مار کھائے کوئی کھلکھلائے کوئی منہ چڑائے
طفلی کے رنگ دیکھو ڈور اور پتنگ دیکھو
لڑکوں کی جنگ دیکھو

ہے عشق بھی جنوں بھی مستی بھی جوشِ خوں بھی
کہیں دل میں درد کہیں آہ سرد کہیں رنگ زرد
ہے یوں بھی اور یوں بھی مستی بھی جوشِ خوں بھی
ہے عشق بھی جنوں بھی

اِک نازنین نے پہنے پھولوں کے زرد گہنے
ہے مگر اداس نہیں پی کے پاس غم و رنج ویاس
دل کو پڑے ہیں سہنے اِک نازنین نے پہنے
پھولوں کے زرد گہنے

فرقتِ یار میں

(ایک خالص پنجابی دھن میں)

جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں
جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں
جی نڈھال ہے اے میرے دوستو
مجھے لے چلو ہاں مجھے لے چلو
یا نشاط میں یا شالامار میں
جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں

عندلیب کے نغمے فضول سے
رنگِ زخم عیاں پھول پھول سے
ہیں خزاں کے طریق بہار میں
جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں

میرے بخت کی یہ نامرادیاں
دامن سست اُداس ہیں وادیاں
چھائی غم کی گھٹا کہسار میں
جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں

چشمہ صورتِ چشم پُر آب کیوں
ندی ماہی مثال بے تاب کیوں
کیوں قرار نہیں آبشار میں
جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں
ساحل آئینہ وار خموش ہے
اور موج کو حیرت کا جوش ہے
کیف نغمہ نہیں جوئبار میں
جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں
جاؤ پاس میرے کوئی آؤ نا
مجھے چھیڑو نہ مجھ کو ستاؤنا
میں ہوں آج کسی انتظار میں
جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں
یہ تو جانتا ہوں کہ وہ آئیں گے
میرے دوست ضرور اُنھیں لائیں گے
ہائے صبر نہیں دلِ زار میں
جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں
جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں
جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں

زندگی

جز بلب بستن نہیں تابِ بیانِ زندگی
ہے فنا تمہیدِ شرحِ داستانِ زندگی
جستجو سے یہ ملا آخر نشانِ زندگی
چند قبریں نقش پائے رہروانِ زندگی
اے مصور ایک تصویر اس طرح سے کھینچ دے
بارِ دوشِ بے کسی کوہِ گرانِ زندگی
ہیں خیالی صورتیں ہنگامہ آرائے وجود
محشرستانِ توہم ہے جہانِ زندگی
ہے مثالِ دُود اپنا عالمِ بود و نبود
یعنی شاخِ شعلہ پر ہے آشیانِ زندگی
صرفِ گلشن ہے بجائے آب خونِ آرزُو
یہ بہارِ زندگی ہے یا خزانِ زندگی
زندگی مردار اور اس زندگی کے واسطے
کشمکش میں ہیں سگانِ استخوانِ زندگی
آرزو ، پھر آرزو کے بعد خونِ آرزو
ایک مصرع میں ہے ساری داستانِ زندگی

دانۂ گندم کے بدلے آدمی کو پیس ڈال
او زمینِ زندگی او آسمانِ زندگی

پھر سبق کچھ اور ہے بعد نصابِ زندگی
ہے فقط دیباچۂ عبرت کتابِ زندگی

یہ عدم والوں کی خاموشی نے ثابت کر دیا
تھا عذابِ قبر سے بدتر عذابِ زندگی

مطربانِ زندگی نے رنگ بدلے نو بنو
ایک ہی دھن پر رہا تارِ ربابِ زندگی

ہے طلوعِ صبحِ پیری تک فقط اس کی نمود
قطرۂ شبنم ہے گویا آفتابِ زندگی

ہے تری بنیاد ہی میں اختلافِ باد و آب
کس بھروسے پر ابھرتا ہے حبابِ زندگی

محو رویائے غم و شادی ہیں دو خوابیدہ ہوش
کامیابِ زندگی ناکامیابِ زندگی

حرفِ باطل ہی لکھا دیکھا اس اندیشے کے بعد
یعنی خوابِ زندگی تعبیرِ خوابِ زندگی

جستجو اک بوالفضولی ہے سکندر گھر میں بیٹھ
خضر کی مانند ہے ناپید آبِ زندگی

(۱۹۲۳ء)

آزاد وادی

(کشمیر سے بھی آگے تنہا سیاحت - استھان مرگ کا منظر)

شہر سے دور شہر یار سے دُور
ساری دنیائے آشکار سے دور
گرمیِ عیشِ بے ثبات سے دور
سردیِ خونِ بے حیات سے دور
دور شیطاں کی شاہراہ سے دور
دور انسان کی نگاہ سے دور
ایک وادی ہے کوہساروں میں حسن کے فطرتی نظاروں میں
شانِ حق آشکار چار طرف
ایک خود رُو بہار چار طرف
چیل اور دیودار چار طرف
قدرتی لالہ زار چار طرف

نعرہ زن آبشار چار طرف
ندیاں بے شمار چار طرف
پھوٹتے ہیں ہزارہا چشمے   سرد ، شفاف ، خوشنما چشمے
پٹ رہی ہے زمین پھولوں سے
بن گئی نازنین پھولوں سے
سرخ پھولوں سے زرد پھولوں سے
اور کہیں لاجورد پھولوں سے
بیلیں کیا تن رہی ہیں پھولوں سے
دلھنیں بن رہی ہیں پھولوں سے
جھاڑیاں ہیں تمام پھول ہی پھول   نہیں کانٹے کا نام پھول ہی پھول
ہیں زمین اور آسماں آزاد
تیر آزاد ہے کماں آزاد
ہیں وحوش و طیور سب آزاد
آتش و خاک و نور سب آزاد
آب آزاد ہے ہوا آزاد
بندے آزاد ہیں خدا آزاد
بلبل آزاد اور گل آزاد   یعنی فطرت کا جزو و کل آزاد

اس طرف کوہ کی نچان کے پاس
ہے مرا جھونپڑا چٹان کے پاس
چشمۂ بادۂ طہور کے پاس
نغمۂ سادۂ طیور کے پاس
گرم رو جوئے تابدار کے پاس
نرم رو بوئے خوشگوار کے پاس
کنج سا ہے جو اس ڈھلان کے پاس
میرا کاشانہ ہے چٹان کے پاس
ہو گیا ہوں یہاں پناہ گزیں   مل گیا ہے مجھے بہشت بریں

بہشتِ بریں

یہ بہشتِ بریں ، زمیں پر ہے　　آسماں پر نہیں زمیں پر ہے
ہاں یہیں ہاں یہیں زمیں پر ہے　　امن کی یہ زمیں ، زمیں پر ہے
ہر جگہ ہر کہیں زمیں پر ہے　　دل میں ہے دل نشیں زمیں پر ہے

برزخِ آب و گل ہے یہ وادی
میرا اپنا ہی دل ہے یہ وادی

یہ بہشتِ بریں ، یہ جانِ بہار　　کردیے دور جس نے سب آزار
میں نے پایا یہ گلشنِ بے خار　　لیک بعد از خرابیِ بسیار
داخلہ اس میں ہے بہت دشوار　　اس کو گھیرے ہوئے ہے حلقۂ نار

یہ بہشت بریں یہ وادیٔ نور
ہے جہنم کی آگ سے محصور

اس کے چاروں طرف اُجاڑ اُجاڑ　　شعلہ ہائے ہوس پہاڑ پہاڑ
شیر، ہاتھی ، دہاڑ اور چنگھاڑ　　بھیڑیے ، اژدہے ، لتاڑ پچھاڑ
ہر زماں بر زباں بگاڑ بگاڑ　　رہزنی مار دھاڑ اکھاڑ پچھاڑ

ہر کوئی ہر کسی کی تاک میں ہے
آدمی آدمی کی تاک میں ہے

میں بھی جنگل سے ہو کے نکلا ہوں　　اسی دنگل سے ہو کے نکلا ہوں
نفس کی زد میں رہ کے نکلا ہوں　　ہر نفس ضرب سہ کے نکلا ہوں
مر کے نکلا ہوں بھر کے نکلا ہوں　　ہار تسلیم کر کے نکلا ہوں
نکل آیا ہوں بس غنیمت ہے
فتح سے بڑھ کے یہ ہزیمت ہے

اِن عوارض سے اب گزند نہیں　　دل کی وادی انھیں پسند نہیں
حسن کاری کا ان کو ذوق نہیں　　جز شکم اور کوئی شوق نہیں
نغمۂ روح سے لگاؤ نہیں　　اس بہشتِ بریں کا چاؤ نہیں
مجھ کو بھی ان سے کوئی رنج نہیں
رحم کھاتا ہوں شکوہ سنج نہیں

نکل آیا ہوں ان کی حد سے دور　　ہوس و کینہ و حسد سے دور
مکر سے دور ہوں ریا سے دور　　بے وفائی کی ہر ادا سے دور
نفسِ شیطاں کی دسترس سے دور　　سانپ کے آتشیں نفس سے دور
اب پناہِ خدا میں بستا ہوں
دامنِ مصطفیٰؐ میں بستا ہوں

۱۹۲۳ء

نہ پیتا ہوں نہ پینا چاہتا ہوں   سخن کا اک قرینا چاہتا ہوں

پیے جا

شراب خانہ ہے بزمِ ہستی   ہر ایک ہے محوِ عیش و مستی
مآل بینی و مے پرستی   ارے یہ ذلت! ارے یہ پستی
شعارِ رندانہ کر پیے جا
اگر کوئی تجھ کو ٹوکتا ہے   شراب پینے سے روکتا ہے
سمجھ اسے ہوش میں نہیں ہے   خرد کے آغوش میں نہیں ہے
تو اس سے جھگڑا نہ کر پیے جا
خیالِ روزِ حساب کیسا   ثواب کیسا عذاب کیسا
بہشت و دوزخ کے یہ فسانے   خدا کی باتیں خدا ہی جانے
فضول سوچا نہ کر پیے جا
نہیں جہاں میں مدام رہنا   تو کس لیے تشنہ کام رہنا
اٹھا اٹھا ہاں اٹھا سبو کو   تمام دنیا کی ہاؤ ہو کو
غریقِ پیمانہ کر پیے جا

کسی سے تکرار کیا ضرورت فضول اصرار کیا ضرورت
کوئی پیے تو اسے پلا دے اگر نہ مانے تو مسکرا دے
ملال اصلا نہ کر پیے جا

تجھے سمجھتے ہیں اہلِ دنیا خراب خستہ ذلیل رسوا
نہیں عیاں اُن پہ حال تیرا کوئی نہیں ہم خیال تیرا
کسی کی پروا نہ کر پیے جا

یہ تجھ پر آوازے کسنے والے تمام ہیں میرے دیکھے بھالے
نہیں مذاق ان کو مے کشی کا یہ خون پیتے ہیں آدمی کا
تو ان کا شکوا نہ کر پیے جا

(۱۹۲۳ء)

عید کا چاند

جیتی رہو مگر مجھے آتا نہیں نظر
بیٹی! کہاں ہے چاند؟ مجھے بھی دکھا، کدھر؟
افسوس اب نگاہ بھی کمزور ہو گئی
نعمت خدا نے دی تھی بڑھاپے میں کھو گئی
مینارِ خانقاہ کے اوپر کہاں، کہاں؟
کچھ بھی نہیں، کوئی بھی نہیں، ہے وہاں کہاں!
ہاں ڈالیوں کے بیچ میں ہو گا وہیں کہیں
وہ ہے جہاں پہ ابر کی سرخی کہیں کہیں
اب ہو چکی ہے عمر بھی نو اور ساٹھ سال
گزرے ترے خسر کو بھی گزرے ہیں آٹھ سال
نغمے خوشی کے اور وہ ترانے گزر گئے
وہ دن گزر گئے وہ زمانے گزر گئے
تیری طرح سے میں بھی کبھی ہاں جوان تھی
وہ دن بھلے تھے اور بھلی ان کی شان تھی

ہر اک سے پہلے دیکھتی تھی میں ہلالِ عید
دس بیس دن سے رہتا تھا ہر دم خیالِ عید
یہ ان دنوں کی بات ہے وہ بات اب کہاں
وہ شام و صبح اور وہ دن رات اب کہاں
اب دن تمھارے، وقت تمھارا، تمھاری عید
بیٹی تمھاری عید سے ہے اب ہماری عید
ہے لاکھ شکر خدائے کریم کا
کرتی ہوں روز ورد کلامِ حکیم کا
عینک بغیر معنی و تفسیر پر مگر
افسوس ہے کہ میری ٹھہرتی نہیں نظر
صدقے کہاں ہے چاند؟ مجھے بھی ذرا دکھا
میں بھی تو چاند دیکھ لوں عینک مری اٹھا
ہاں ہاں وہ ہے وہ تار سا بیشک وہی تو ہے
مجھ کو نظر نہ آیا تھا اب تک وہی تو ہے
صد شکر چاند دیکھ لیا ، آ دُعا کریں
اور چل کے پھر فریضۂ مغرب ادا کریں
یارب ترے حضور میں حاضر کھڑی ہوں میں
عاصی گناہ گار تو بے شک بڑی ہوں میں

لیکن مرے گناہ و خطا پر نگہ نہ کر
یا رب تو اپنی شانِ کریمی پہ رکھ نظر
اللہ میرے چاند کی ، نورِ نظر کی خیر
میرے کماؤ ، میرے مسافر پسر کی خیر
اللہ ! مجھ کو گھر کا اجالا نصیب ہو
بیٹا بہو کو ، اور مجھے پوتا نصیب ہو
بے کس کے عجز کو ملے رتبہ قبول کا
سن لے مری دعاؤں کو صدقہ رسول کا

(۱۹۲۴ء)

تاروں بھری رات

بحر اور بر میں   خشک اور تر میں   خاموشیاں ہیں   ہر رہگزر میں
نیندوں کے ماتے   سوتے ہیں گھر میں   تالے لگے ہیں   قلب و نظر میں
نورِ خدا سے   رخ پوشیاں ہیں   مدہوشیاں ہیں   غافل بشر میں
یہ کون دیکھے   یہ کون جانے
یہ کون سمجھے   یہ کون مانے
تاروں   بھری   رات
نیلم   پری   رات
جلوؤں سے معمور   آتی ہے کیونکر   نزدیک اور دور   چھاتی ہے کیونکر
بیدار دل پر   مانندِ لشکر   لاتی ہے کیونکر
غارت   گری   رات
تاروں   بھری   رات

(۲)

دنیائے انساں   شہرِ خموشاں   دیکھے بھلا کون   رنگِ گلستاں
ہنستے ہیں غنچے   کھلتی ہیں کلیاں   ہر شاخ رقصاں   ہر پھول خنداں
سبزے میں ساری   اک روح جاری   پتوں پہ طاری   اک کیف لرزاں

ہر برگ گل پہ　　موتی جڑے ہیں
موتی ہی موتی　　بکھرے پڑے ہیں
قدرت کی ہر شے
گویا دلھن ہے
باریک ململ　تاریک آنچل　چہرے پہ ڈالے　گھونگھٹ نکالے
شب کی ردا میں　دھندلی ضیاء میں　اپنی حیا میں
چپ ہے مگن ہے
گویا دلھن ہے

(۳)

رکھوالا لڑکا　کھیتوں کا دولھا　مینڈوں پہ کیسا　پھرتا ہے تنہا
سیٹی بجانے　گانے کا رسیا　ہاتھوں میں بنسی　پیروں سے ننگا
البیلے پن میں　سادہ پھبن میں　گوکل کے بن میں　جیسے کنھیا
بنسی کی لے میں　گم ہیں فضائیں
پھرتی ہیں مدہوش　ٹھنڈی ہوائیں
یہ راز کیا ہے
کس کی صدا ہے؟
کوہ و بیاباں　کھیت اور میداں　باہوش بیہوش　سب خود فراموش
کیوں او گلے باز　تیرا یہ انداز　یہ سوز یہ ساز

تجھ کو پتا ہے
کس کی صدا ہے؟

(۴)

دلکش نظارے شب زاد سارے ندی کی تہ میں رقصاں ہیں تارے
گاتی ہیں لہریں گیت لیے پیلے چپ دم بخود ہیں دونوں کنارے
ہر سمت سبزا سرمست صہبا لیٹا ہے کیسا پاؤں پسارے
یہ سرسراہٹ سرگوشیوں کی
ہر گام آہٹ خاموشیوں کی
ندی کا پانی
محوِ روانی
چلتا مچلتا پہلو بدلتا بہتا بہاتا کچھ گنگناتا
تاروں کا دفتر سینے کے اندر رہ رَو زمیں پر
ضو آسمانی
ندی کا پانی

(۵)

دامانِ کہسار اک خامشی زار چیل اور دیودار دیو ہیں کہ اشجار
توبہ درندے بے رحم خونخوار لیکن یہاں بھی شب ہے طرحدار
پانی کی رو میں ہر برگِ نو میں شبنم کی ضو میں تارے نمودار

یہ سرزمیں ہے تاروں کی دنیا
دیدہ وروں کے پیاروں کی دنیا
کشف و کرامات
تاروں بھری رات

ہر ایک وادی گلزار زادی ہر چشمہ ہر جھیل ضوریز قندیل
ہر سنگ ہے طور ہر قرب ہر دور نورٌ عَلٰی نور
شاعر کے جذبات
تاروں بھری رات

(۱۹۲۴ء)

سخت گیر آقا
(ایک بے تکی نظم)

آج بستر ہی میں ہوں
کر دیا ہے آج
میرے مضمحل اعضا نے اظہارِ بغاوت برملا
میرا جسمِ ناتواں، میرا غلامِ باوفا
واقعی معلوم ہوتا ہے تھکا ہارا ہوا

اور میں
اک سخت گیر آقا...... (زمانے کا غلام)
کس قدر مجبور ہوں
پیٹ پوجا کے لیے۔
دو قدم بھی اٹھ کے جا سکتا نہیں۔
میرے چاکر پاؤں شل ہیں
جھک گیا ہوں ان کمینوں کی رضا کے سامنے
سر اٹھا سکتا نہیں
آج بستر ہی میں ہوں۔

تغزل

مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں
دیکھو تو ہوش ہے بھی کسی ہوشیار میں

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ
پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں

وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

اللہ بات کیا ہے کہ دیوانگی مری
دیوانگی نہیں نظرِ ہوشیار میں

جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ جاؤ جاؤ
جاؤ کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں

ہوں وادیِ حیات میں اس طرح سست گام
جیسے ہو پا شکستہ کوئی خار زار میں

اب وہ سکونِ یاس نہ وہ اضطرابِ شوق
سینے میں دل ہے یا کوئی لاشہ مزار میں

اب خاک اڑائیے نہ ہمارے مزار کی
اب خاک بھی نہیں ہے ہمارے مزار میں

تنہائیِ فراق میں اُمید بارہا
گم ہو گئی سکوت کے ہنگامہ زار میں

وہ عندلیبِ گلشنِ معنی ہوں میں حفیظ
سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

(۱۹۲۴ء)

○

دور سے آنکھیں دکھاتی ہے نئی دنیا مجھے
گلشنِ ہستی نظر آتا ہے اِک صحرا مجھے

عقل کی وادی میں ہوں گم کردۂ مقصودِ عشق
ڈھونڈتا ہوں اور نہیں ملتا کوئی رستا مجھے

یہ بھی اک دھوکا تھا نیرنگِ طلسمِ عقل کا
اپنی ہستی پر بھی ہستی کا ہوا دھوکا مجھے

شوق میرا طالبِ دیدار ہو جاتا اگر
دیکھتا موسیٰ مجھے' سینا مجھے' جلوا مجھے

شاعری کیا کفش بردارِ گرامی ہوں حفیظ
بے کمالی کے سوا کوئی نہیں دعویٰ مجھے

(۱۹۲۲ء)

○

حسنِ صورت میں نہیں دلبستگی میرے لیے
عشق کا مفہوم ہے کچھ اور ہی میرے لیے

سازِ بے آواز کے آہنگِ رنگارنگ نے
باندھ رکھا ہے طلسمِ زندگی میرے لیے

یہ گل و بلبل کی بازی، شمع و پروانہ کا کھیل
دل لگی تیرے لیے، دل کی لگی میرے لیے

دستِ تقدیر اور نقشِ مدعا باندھے غلط!
بت شکن کرنے لگے کیوں بت گری میرے لیے

ہائے دشمن کے لیے تجھ کو بظاہر دشمنی
او وفا دشمن فریبِ دوستی میرے لیے

رونے والوں نے مسیحا کو کیا جھک کر سلام
لائے تھے حضرت نویدِ زندگی میرے لیے

توبہ توبہ شیخ جی توبہ کا پھر کس کو خیال
جب وہ خود کہہ دے کہ پی تھوڑی سی پی میرے لیے

کس قدر نا آشنا تھے میری قسمت سے حفیظ
کر گئے جو وضع رسمِ عاشقی میرے لیے

(۱۹۲۲ء)

○

میں کیا ہوں اس خیال سے لگتا ہے ڈر مجھے
کیوں دیکھتے ہیں غور سے اہلِ نظر مجھے

لے جاؤ ساتھ ہوش کو اے اہلِ ہوش جاؤ
ہے خوب اپنی بے خبری کی خبر مجھے

ہے خوابِ مرگ زندگیِ تازہ کی دلیل
یہ شام دے رہی ہے نویدِ سحر مجھے

بدلی ہوئی نگاہ کو پہچانتا ہوں میں
دینے لگے پھر آپ فریبِ نظر مجھے

لو وہ تو آ کے بیٹھ گئے میرے سامنے
اٹھنا پڑے نہ بزم سے دل تھام کر مجھے

گم ہو گیا ہوں بیخودیِ ذوقِ عشق میں
اے عقل جا کے لا تو ذرا ڈھونڈ کر مجھے

ہوتا ہے کون موت کا طالب مرے سوا
سوجھا نہ یہ فریب کسی کو مگر مجھے

اے روشنیِ طبع تو برمن بلاشدی
پھر یہ نہیں تو کھا گئی کس کی نظر مجھے

میں اپنی زندگی کو برا کیوں کہوں حفیظؔ
رہنا ہے اس کے ساتھ میاں عمر بھر مجھے

(۱۹۲۳ء)

○

عشق کے ہاتھوں یہ ساری عالم آرائی ہوئی
عشق کے ہاتھوں قیامت بھی ہے اب آئی ہوئی

اللہ اللہ کیا ہوا انجامِ کارِ آرزو
توبہ توبہ کس قدر ہنگامہ آرائی ہوئی

کیا ہے میرا حاصلِ گل چینیِ باغِ جمال
آرزو کی چند کلیاں وہ بھی مرجھائی ہوئی

چھوڑ بھی یہ سلسلہ او نامرادِ انتظار
موت بیٹھی ہے ترے بالیں پہ اکتائی ہوئی

شہرِ مایوسی میں اک چھوٹی سی امیدِ وصال
اجنبی کی شکل میں پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

کر لیا ہے عقد اُردوئے معلّٰی سے حفیظؔ
قلعۂ دہلی سے آئی تھی یہ ٹھکرائی ہوئی

(۱۹۲۳ء)

○

موت کے چہرے پہ ہے کیوں مردنی چھائی ہوئی
دیکھنا کون آ گیا کیوں ٹل گئی آئی ہوئی

کوئی بدلی تو نہیں ابھری افق پر دیکھنا
پھر فضائے توبہ پر ہے بیدلی چھائی ہوئی

سیکھ دنیا ہی میں زاہد حور سے ملنے کے ڈھنگ
ورنہ روئے گا کہ جنت میں بھی رسوائی ہوئی

خانۂ دل میں کسی پردہ نشیں کی آرزو
آرزو کیا ہے دلھن بیٹھی ہے شرمائی ہوئی

عشق ہے اپنی وفاؤں سے بھی شرمایا ہوا
عقل ہے اپنی خطاؤں پر بھی اترائی ہوئی

کاش اس مصرع کا تم کو پاس ہوتا اے حفیظؔ
یہ بہار آئی ہوئی ایسی گھٹا چھائی ہوئی

(۱۹۲۴ء)

○

دنیا مجھے کہتی ہے اللہ کا دیوانہ
صورت ہے فقیرانہ انداز ہیں شاہانہ

آمادۂ کج بحثی عاشق بھی ہے ناصح بھی
اک عشق کا سودائی اک عقل کا دیوانہ

توحید پہ ناز ایسا، دل محوِ ایاز ایسا
توڑا نہ گیا تجھ سے محمود یہ بت خانہ

زندان کی دیواریں، ہیں مانعِ آزادی
ہاں اے سرِ شوریدہ! ہاں ہمت مردانہ

ایمان شکن، آنکھیں دل میں ہیں دل آنکھوں میں
بت خانے میں کعبہ ہے کعبے میں ہے بت خانہ

جذبات ہنر کرتے ہیں جلووں کی نمائش سے
ہے شمع سے وابستہ سوزِ دلِ پروانہ

اب میری خطاؤں پر کہہ دیتے ہیں وہ ہنس کر
سودائی ہے سودائی، دیوانہ ہے دیوانہ

محشر کا تماشا ہے اک نقل جوانی کی
گزرا ہوا ہنگامہ، بھولا ہوا افسانہ

بنتے تھے حفیظ ایسے ہم جان گئے ان کو
یہ طرزِ غزلخوانی، یہ شیوۂ رندانہ

(۱۹۲۱ء)

○

آنکھوں میں دل ہے دل میں امیدِ وصال ہے
تم دیکھتے نہیں مری صورت سوال ہے

کیوں ہاتھ کانپتے ہیں گرہ کھولتے ہوئے
تمہیدِ وصل ہے کہ نویدِ وصال ہے

مے کش چلا ہے دامنِ رحمت کو ڈھونڈنے
مخمورِ بادۂ عرقِ انفعال ہے

اک نسخہ یاد ہے مجھے شیخ الرئیس کا
پینا نہ ہو نصیب تو جینا محال ہے

عبرت فزا ہے گورِ غریباں کی بے کسی
میری نظر کے سامنے میرا مآل ہے

مجھ کو زوال کی بھی ترقی نہیں پسند
سنتا ہوں آسمان عدوئے کمال ہے

بازارِ حسن میں نہ وفا کو تلاش کر
اس نعمت خدا کا خدائی میں کال ہے

ناکامیاں پیامبرِ مرگ ہی نہ ہوں
کیوں اے امیدِ زیست ترا کیا خیال ہے

ہے کس قدر غرور شکن راہِ زندگی
جس سر کو دیکھتا ہوں وہی پائمال ہے

گلزار آرزو میں ہیں رنگینیاں بہت
کچھ بھی نہیں حفیظ فریبِ خیال ہے

(۱۹۲۲ء)

○

آ ہی گیا وہ مجھ کو لحد میں اتارنے
غفلت ذرا نہ کی مرے غفلت شعار نے

او بے نصیب دن کے تصور سے خوش نہ ہو
چولا بدل لیا ہے شبِ انتظار نے

اب تک اسیرِ دامِ فریبِ حیات ہوں
مجھ کو بھلا دیا مرے پروردگار نے

نوحہ گروں کو بھی ہے گلا بیٹھنے کی فکر
جاتا ہوں آپ اپنی اجل کو پکارنے

دیکھا نہ کاروبارِ محبت کبھی حفیظؔ
فرصت کا وقت ہی نہ دیا کاروبار نے

(۱۹۲۲ء)

○

مردہ دلوں کو حشر بھی آیا پکار نے
آواز دی نہ ایک بھی سنگ مزار نے

سب کیفیت بہشت کی رندوں پہ کھول دی
کوثر کے ایک ساغرِ ناخوشگوار نے

برسوں فریبِ عشق دیا اک حسین کو
اس دل نے ہاں اسی دل ناکردہ کار نے

اغیار سے بھی کرنے لگے وعدہ ہائے حشر
عادت بگاڑ دی ہے مرے اعتبار نے

نازک مزاج پھول کا منہ سرخ ہو گیا
چٹکی سی ایک لی تھی نسیمِ بہار نے

بے بال و پر بھی مائل پرواز تھے یہاں
رخ ہی ادھر کیا نہ ہوائے بہار نے

غالب رہی حفیظؔ حقیقت مجاز پر
کعبے سے مجھ کو کھینچ لیا کوئے یار نے

(۱۹۲۳ء)

○

آنے والے جانے والے ہر زمانے کے لیے
آدمی مزدور ہے راہیں بنانے کے لیے

زندگی فردوسِ گُم گَشتہ کو پا سکتی نہیں
موت ہی آتی ہے یہ منزل دکھانے کے لیے

میری پیشانی پہ اِک سجدہ تو ہے لکھا ہوا
یہ نہیں معلوم ہے کس آستانے کے لیے

ان کا وعدہ اور مجھے اس پر یقیں اے ہم نشیں
اک بہانہ ہے تڑپنے تلملانے کے لیے

جب سے پہرہ ضبط کا ہے آنسوؤں کی فصل پر
ہو گئیں محتاج آنکھیں دانے دانے کے لیے

آخری اُمید وقتِ نزع ان کی دید تھی
موت کو بھی مل گیا فقرہ نہ آنے کے لیے

اللہ اللہ دوست کو میری تباہی پر یہ ناز
سوئے دشمن دیکھتا ہے داد پانے کے لیے

نعمت غم میرا حصہ، مجھ کو دے دے اے خدا
جمع رکھ میری خوشی سارے زمانے کے لیے

نسخۂ ہستی میں عبرت کے سوا کیا تھا حفیظؔ
سرخیاں کچھ مل گئیں اپنے فسانے کے لیے

(۱۹۲۰ء)

○

یہ افتادِ بشر اٹدے گی موج بے کراں ہو کر
یہ کوہِ غم پھٹے گا ایک دن آتش فشاں ہو کر

خدا کی کارسازی کا نیا اک دور آیا ہے
کہ بندے چیخ اٹھے ہیں شاکیِ جورِ بتاں ہو کر

قیامت ڈھائے گا جوشِ جنوں ابنائے دانش کا
اڑے گا دامنِ دنیا کسی دن دھجیاں ہو کر

یہ کس کی تفرقہ پردازیوں پر شور واویلا
اٹھا ہے دیر سے ناقوس مسجد سے اذاں ہو کر

حفیظؔ اس سینہ کاوی سے تمھیں حاصل یہی ہو گا
کہ حاصل کچھ نہ ہو گا شاعرِ رنگیں بیاں ہو کر

(۱۹۱۹ء)

○

کسی کے روبرو بیٹھا رہا میں بے زباں ہو کر
میری آنکھوں سے حسرت پھوٹ نکلی داستاں ہو کر

خدا حافظ کسی کے رازِ الفت کا خدا حافظ
خیال آتے ہی اب تو دل دھڑکتا ہے فغاں ہو کر

پیا آبِ بقا اے خضر، اب تاثیر بھی دیکھو
قیامت تک رہو پابندِ عمرِ جاوداں ہو کر

یکایک وہ مریضِ غم کی صورت کا بدل جانا
وہ رو دینا کسی نامہرباں کا مہرباں ہو کر

کتابِ دہر کا دلچسپ ٹکڑا ہے مری ہستی
مجھے دیکھو کہ بیٹھا ہوں مجسم داستاں ہو کر

سنا ہے اس طرف سے بھی جنابِ عشق گزریں گے
مری ہستی نہ اُڑ جائے غبارِ کارواں ہو کر
(۱۹۱۹ء)

○

اس بزم میں آخر شعرا ہیں کہ نہیں ہیں
انداز مرے سب سے جدا ہیں کہ نہیں ہیں

زاہد سے نہیں حسن کی سرکار سے پوچھو
ہم بندۂ تسلیم و رضا ہیں کہ نہیں ہیں

جلووں کی طلب ، پیرویِ حضرت موسیٰ
گمراہ مرے راہنما ہیں کہ نہیں ہیں

آ تجھ کو دکھا دوں کہ ستاروں سے بھی آگے
انسان کے نقشِ کفِ پا ہیں کہ نہیں ہیں

ہاں میں تو لیے پھرتا ہوں اک سجدۂ بے تاب
ان سے بھی تو پوچھو وہ خدا ہیں کہ نہیں ہیں

(۱۹۲۴ء)

○

شیخ کعبے سے پلٹ آئے خدا کو دیکھ کر
مطمئن ہیں اب بتانِ خوش ادا کو دیکھ کر

کیا گراں خاطر ہے رنجِ انکشافِ رازِ دوست
سینہ پھٹ جاتا ہے غنچے کا صبا کو دیکھ کر

جز غلامی کوئی بھی منزل نظر آتی نہیں
مسلکِ اربابِ تسلیم و رضا کو دیکھ کر

یہ بھی دیکھا ہے عموماً بن گئے ناآشنا
آشنا طرزِ سلوکِ آشنا کو دیکھ کر

انتہائے گمرہی یہ ہے کہ ہنستے ہیں ہم
رہنما مجھ کو اِدھر میں رہنما کو دیکھ کر

وقتِ پیدائش جو گریہ تھا بدستور اب بھی ہے
ابتدا ہی سے چلے ہیں انتہا کو دیکھ کر

کوششِ ناکام کو جانے بھی دے اے چارہ گر
بوالعجب، تاثیر ہنستی ہے دوا کو دیکھ کر

صورت و سیرت تو ہیں سب بعد کی باتیں حفیظؔ
ہم نہ جانے مر مٹے تھے کس ادا کو دیکھ کر

(۱۹۲۲ء)

○

وہ ابر جو میخوار کی تربت پہ نہ برسے
کہہ دو کہ خدارا کبھی گزرے نہ اِدھر سے

اتنا تو ہوا آہِ شبِ غم کے اثر سے
فطرت کا جگر پھوٹ بہا چشمِ سحر سے

اُمید نے بھی یاس کے مردوں کو پکارا
آئی کوئی آواز نہ دل سے نہ جگر سے

ناصح کو بلاؤ مرا ایمان سنبھالے
پھر دیکھ لیا اس نے اسی ایک نظر سے

خورشیدِ قیامت کی ادا دیکھ رہا ہوں
ملتی ہوئی صورت ہے مرے داغِ جگر سے

ایک ایک قدم پر ہے جہاں خندۂ تقدیر
تدبیر گزرتی ہے اسی راہ گزر سے

اے خندۂ گلشن یہ ہے انجامِ شبِ عیش
گل روتے ہیں منہ ڈھانپ کے دامانِ سحر سے

کچھ شانِ کریمی نے اس انداز سے تولا
بھاری ہی رہا دیدۂ تر دامنِ تر سے

خطرے میں ہیں کچھ دن سے حفیظؔ اہلِ دو عالم
ہر شب مرے نالوں کی لڑائی ہے اثر سے

(۱۹۲۴ء)

ہم دورِ نو کو دیکھ کے خاموش ہو گئے
کم ظرف ناچنے لگے مدہوش ہو گئے

ارمان فرطِ ضبط سے پرجوش ہو گئے
آخر یہ فتنے محشرِ خاموش ہو گئے

او بے نصیب حشر کے وعدے کا حشر دیکھ
وہ رفتہ رفتہ وعدہ فراموش ہو گئے

اُن کی نگاہ موت بھی تھی زندگی بھی تھی
ہشیار ہو گئے کبھی بے ہوش ہو گئے

ہم خیر خواہِ بازوئے تیغ آزما رہے ،
وہ خوش نصیب تھے جو سبکدوش ہو گئے

سامانِ ضبط ہی نہ رہا پردہ دارِ دل
حسرت فروشِ غم لبِ خاموش ہو گئے

دل میں ہجومِ یاس ہے بیٹھے ہیں دم بخود
اب ہم بھی ایک محفلِ خاموش ہو گئے

لِلّٰہ پھیر لے اسے اے قاسمِ ازل
دل لے کے ہم تو فتنہ در آغوش ہو گئے

بے موسمی کا شغل تھا اپنی نماز بھی
فصلِ بہار آ گئی مے نوش ہو گئے

بے ربطیٔ فسانہ کا اب تذکرہ ہی کیا
خاموش تم نے کر دیا خاموش ہو گئے

طوفاں اٹھائے پھرتے تھے ہوش و خرد حفیظؔ
دیکھی جنوں کی شکل تو خاموش ہو گئے

○

تیر چلنے پہ نہ آنا کہ خطا ہو جانا
لب تک آتے ہوئے شکوے کا دعا ہو جانا

یاد ہے اس بتِ کافر کا خفا ہو جانا
اور مرا بھول کے مائل بہ دعا ہو جانا

حیرت انگیز ہے نقاشِ ازل کے ہاتھوں
میری تصویر کا تصویرِ فنا ہو جانا

دستِ تقدیر میں شمشیرِ جفا دینا ہے
خود بخود بندۂ تسلیم و رضا ہو جانا

اس کی افتاد پہ خورشید کی رفعت قرباں
جس کو بھایا ترا نقشِ کفِ پا ہو جانا

رونقِ بزم ہے شیون سے تو شیون ہی سہی
ہمصفیرانِ چمن پھر نہ خفا ہو جانا

داورِ حشر کا انصاف اشارے ان کے
بس یہی ہے کسی بندے کا خدا ہو جانا

(۱۹۲۴ء)

○

حیران نہ ہو دیکھ میں کیا دیکھ رہا ہوں
بندے تری صورت میں خدا دیکھ رہا ہوں

وہ اپنی جفاؤں کا اثر دیکھ رہے ہیں
میں معنیٔ تسلیم و رضا دیکھ رہا ہوں

دزدیدہ نگاہوں سے کدھر دیکھ رہے ہو
کیا بات ہے! یہ آج میں کیا دیکھ رہا ہوں

ہے حسن یہی شے تو گماں اور نہ کیجے
سودا نہیں مطلوب، ذرا دیکھ رہا ہوں

کس طرح نہ قائل ہوں دعائے سحری کا
اس لب پہ تبسم کی ضیا دیکھ رہا ہوں

کیوں ارضِ وطن تنگ ہے یہ بات ہی کیا ہے
اب تو فقط اک قبر کی جا دیکھ رہا ہوں

مر جانے کی دھمکی ہوئی تمہید تماشا
میں نے کہا دیکھ! اس نے کہا: دیکھ رہا ہوں

(۱۹۲۴ء)

○

وہ ہوئے پردہ نشین انجمن آرا ہو کر
رہ گیا میں ہمہ تن چشمِ تمنا ہو کر

حسن نے عشق پہ حیرت کی نگاہیں ڈالیں
خود تماشا ہوئے ہم محوِ تماشا ہو کر

آنکھ کم بخت سے اس بزم میں آنسو نہ رُکا
ایک قطرے نے ڈبویا مجھے دریا ہو کر

کوئی ہو' دردِ محبت کا مداوا کر دے
ملک الموت ہی آ جائے مسیحا ہو کر

کچھ تعجب نہیں کعبے میں اگر جی نہ لگے
آئے ہیں ہم طرفِ دیر و کلیسا ہو کر

رنگ و روغن پہ نگاہیں نہ کبھی للچائیں
مجھ کو دنیا نظر آتی رہی دنیا ہو کر

(۱۹۱۸ء)

○

رنگ بدلا یار نے وہ پیار کی باتیں گئیں
وہ ملاقاتیں گئیں وہ چاندنی راتیں گئیں

پی تو لیتا ہوں مگر پینے کی وہ باتیں گئیں
وہ جوانی وہ سیہ مستی ، وہ برساتیں گئیں

اللہ اللہ کہہ کے بس اک آہ کرنا رہ گیا
وہ نمازیں وہ دعائیں وہ مناجاتیں گئیں

حضرتِ دل اب نئی الفت سمجھ کر سوچ کر
اگلی باتوں پر نہ بھولیں آپ وہ باتیں گئیں

راہ و رسم دوستی قائم تو ہے لیکن حفیظ
ابتدائے شوق کی لمبی ملاقاتیں گئیں

(۱۹۲۱ء)

○

دو روز میں شباب کا عالم گزر گیا
بدنام کرنے آیا تھا بدنام کر گیا

بیمارِ غم مسیح کو حیران کر گیا
اٹھا ، جھکا ، سلام کیا ، کر کے مر گیا

گزرے ہوئے زمانے کا اب تذکرہ ہی کیا
اچھا گزر گیا ، بہت اچھا گزر گیا

دیکھو یہ دل لگی کہ سرِ رہ گزارِ حسن
اِک اِک سے پوچھتا ہوں مرا دل کدھر گیا

اے چارہ گر سنا مرے تیغ آزما کی خبر
اب دردِ سر کی فکر نہ کر دردِ سر گیا

اے میرے رونے والو، خدارا جواب دو
وہ بار بار پوچھتے ہیں کون مرگیا

شاید سمجھ گیا مرے طولِ مرض کا راز
اب چارہ گر نہ آئے گا اب چارہ گر گیا

جلوہ دکھا کے چھپ گیا وہ شوخ اور ہمیں
وقفِ نزاعِ مسجد و بت خانہ کر گیا

اب ابتدائے عشق کا عالم کہاں حفیظؔ
کشتی مری ڈبو کے وہ دریا اتر گیا

(۱۹۲۳ء)

○

عاشق سا بدنصیب کوئی دوسرا نہ ہو
معشوق خود بھی چاہے تو اس کا بھلا نہ ہو

ہے مدعائے عشق ہی دنیائے مدعا
یہ مدعا نہ ہو تو کوئی مدعا نہ ہو

عبرت کا درس ہے مجھے ہر صورتِ فقیر
ہوتا ہے یہ خیال کوئی بادشاہ نہ ہو

پایانِ کار موت ہی آئی بروئے کار
ہم کو تو وصل چاہیے کوئی بہانہ ہو

میرے عزیز مجھ کو نہ چھوڑیں گے قبر تک
اے جان! انتظار نہ کر، تو روانہ ہو

کعبے کو جا رہا ہوں نگہ سوئے دیر ہے
ہر پھر کے دیکھتا ہوں کوئی دیکھتا نہ ہو

ہاں اے حفیظؔ چھیڑتا جا نغمۂ حیات
جب تک ترا رباب سخن بے صدا نہ ہو

(۱۹۱۸ء)

○

جلوۂ حسن کو محرومِ تماشائی کر
بے نیازی صفتِ لالۂ صحرائی کر

ہاں بڑے شوق سے شمشیر کے اعجاز دکھا
ہاں بڑے شوق سے دعوائے مسیحائی کر

میں تو مجبور ہوں عادت سے کہے جاؤں گا
تو کوئی بات نہ سن اور نہ پذیرائی کر

اپنے بیمار کی یہ آخری اُمید بھی دیکھ
ملک الموت سے کہتا ہے مسیحائی کر

مجھ کو لے جا کے درِ یار پہ قاصد نے کہا
خامہ فرسائی نہ کر ناصیہ فرسائی کر

ہم تری صورتِ انکار کو پہچانتے ہیں
وہ تبسم تو شریکِ لبِ گویائی کر

(۱۹۲۳ء)

○

بتوں نے یا خدا نے مار ڈالا
محبت کے بہانے مار ڈالا

مسیحا کو نہ آنا تھا، نہ آئے
قضا آئی قضا نے مار ڈالا

بتوں کا نام کیوں لیتی ہے دنیا
مجھے میرے خدا نے مار ڈالا

رہے ان کے بہانے ہی بہانے
بہانے ہی بہانے مار ڈالا

بتو! کیوں قتل سے کرتے ہو پرہیز
اگر مجھ کو خدا نے مار ڈالا

محبت کو مرض سمجھے ہوئے تھے
طبیبوں کی دوا نے مار ڈالا

کہا یہ سن کے ذکرِ مرگِ دشمن
کسی کی بد دُعا نے مار ڈالا

جنابِ خضر کیا فرما رہے ہیں
کسے آبِ بقا نے مار ڈالا

ارے یہ ظلم! ارے یہ سرد مہری
زمانے! او زمانے! مار ڈالا!!

(۱۹۲۳ء)

○

رائج یہ کہیں مذہب گفتار نہ کردے
سردار کو منصور سرِدار نہ کردے

دل لے تو چلا ہوں کہیں آنکھوں سے نہ ٹپکے
مجھ کو بھی گنہگار ، گنہگار نہ کردے

کیوں عرض تمنا لیے پھرتی ہے ہوس بھی
یہ حسن کہیں عشق کو بے زار نہ کردے

اے داورِ حشر اس سے نہ کر پرسشِ ایماں
انکار کا عادی کہیں انکار نہ کردے

شاگرد کو استاد سے بڑھنے کا بھی ہے شوق
انساں کہیں شیطان کو بے کار نہ کردے

(۱۹۴۲ء)

○

دلِ بے مدعا ہے اور میں ہوں
مگر لب پر دعا ہے اور میں ہوں

نہ ساقی ہے نہ اب وہ شے ہے باقی
مرا دور آ گیا ہے اور میں ہوں

ادھر دنیا ہے اور دنیا کے بندے
اِدھر میرا خدا ہے اور میں ہوں

کوئی پرساں نہیں پیرِ مغاں کا
فقط میری وفا ہے اور میں ہوں

ابھی میعاد باقی ہے ستم کی
محبت کی سزا ہے اور میں ہوں

نہ پوچھو حال میرا کچھ نہ پوچھو
کہ تسلیم و رضا ہے اور میں ہوں

یہ طولِ عمر نامعقول و بے کیف
بزرگوں کی دعا ہے اور میں ہوں

لہو کے گھونٹ پینا اور جینا
مسلسل اک مزا ہے اور میں ہوں

حفیظ ایسی فلاکت کے دنوں میں
فقط شکرِ خدا ہے اور میں ہوں

(۱۹۲۲ء)

:

○

مٹایا تو نے مجھ کو جوشِ ایماں دیدہ خواہد شد
صنم کہتے ہیں جا ہو جا مسلماں دیدہ خواہد شد

حسینوں کی شکایت داورِ محشر سے کی میں نے
بہت چپکے سے یوں فرما دیا ہاں دیدہ خواہد شد

ہوا ہے فصلِ گل کے ساتھ ہی دورانِ خوں رخصت
پھر اگلے سال اے خارِ مغیلاں دیدہ خواہد شد

بہار آنے تو دو ہوش و خرد جانے تو دو، ٹھہرو!
گلستاں دیدہ خواہد شد، بیاباں دیدہ خواہد شد

فلک کہتا ہے انساں محو ہے تو آرزوؤں میں
بنا بیٹھا ہے پریوں میں سلیماں دیدہ خواہد شد

مسلسل کسمپرسی کا سلوک آباد کاروں سے
بروزِ حشر اے گورِ غریباں دیدہ خواہد شد

ہمارے ہی عزیزوں سے تجھے ہو اختلاط ایسا
ہمی سے نفرت اے مرگِ عزیزاں دیدہ خواہد شد

حفیظ اس گفتگو سے رنگِ مشرب کھل گیا آخر
ہوئے تم بھی شریکِ بزمِ رنداں دیدہ خواہد شد

(۱۹۲۳ء)

:

○

عشق نے عقل کو دیوانہ بنا رکھا ہے
زلفِ انجام کی الجھن میں پھنسا رکھا ہے

اٹھ کے بالیں سے مرے دفن کی تدبیر کرو
نبض کیا دیکھتے ہو، نبض میں کیا رکھا ہے

میری قسمت کے نوشتے کو مٹا دے کوئی
مجھ کو قسمت کے نوشتے نے مٹا رکھا ہے

آپ بے تابِ نمائش نہ کریں جلوؤں کو
ہم نے دیدار قیامت پہ اٹھا رکھا ہے

وہ نہ آئے نہ سہی موت تو آئے گی حفیظ
صبر کر صبر، ترا کام ہوا رکھا ہے

(۱۹۲۲ء)

○

امیدیں، آرزوئیں کھیلتی ہیں یوں مرے دل سے
پلٹ جاتی ہیں موجیں جس طرح ٹکرا کے ساحل سے

ترا مقصود کیا ہے، میرے آقا یہ تو فرما دے
مری پھوٹی ہوئی تقدیر سے ٹوٹے ہوئے دل سے

صعوبت راہ کی جاتی رہی نیند آ گئی مجھ کو
نشہ سا چھا گیا کیفِ ہوائے قربِ منزل سے

نہ کر طوفاں زدوں کی ہاؤ ہو پر تبصرہ پیارے
ترے تو پاؤں بھی نکلے نہیں دامانِ ساحل سے

سرِ مقتل حفیظ اپنا کوئی ہمدم نہ تھا لیکن
نگہ کچھ دیر تک لڑتی رہی شمشیرِ قاتل سے

(۱۹۲۳ء)

○

حال میرا دم بدم نوع دگر ہوتا گیا
نوحہ گر ہوتا گیا جو چارہ گر ہوتا گیا

ضعف سے ساری امیدیں خاک میں ملتی گئیں
آہ بے تاثیر نالہ بے اثر ہوتا گیا

عیش میں لذت کے بدلے ذلتیں ملتی گئیں
نفع بھی ہوتا گیا جتنا ضرر ہوتا گیا

زندگی کی منزلوں میں جس قدر آگے بڑھے
دل کشی کے ساتھ رستا پُرخطر ہوتا گیا

درد دل کہتا گیا میں اور وہ سنتے گئے
حلق ادھر خشک اس طرف رومال تر ہوتا گیا

باغ ہستی میں عجب شے ہے نہالِ آرزو
جس قدر بڑھتا گیا یہ بے ثمر ہوتا گیا

وقت پیدائش جو گریہ تھا بدستور اب بھی ہے
ابتداء میں جو ہوا وہ عمر بھر ہوتا گیا

(۱۹۳۲ء)

○

یہ بات نہ تھی پہلے اب مجھ کو ہوا کیا ہے؟
پینے کا تقاضا ہے جینے کی تمنا ہے

اے دل تری ماہیت معلوم نہیں کیا ہے
تو خود ہی تماشائی تو خود ہی تماشا ہے

اے جرأتِ ناکامی ، تیرا ہی بھروسا ہے
تو جانِ تمنا ہے ، ایمانِ تمنا ہے

اے حسن یہ گلکاری یہ مستی و سرشاری
میری ہی نگاہوں کا کھینچا ہوا نقشا ہے

کچھ راز نہیں کھلتا دُزدیدہ نگاہی کا
اب تو مرے سینے میں دل ہے نہ تمنا ہے

بستی ہمہ بربادی ، صحرا ہمہ آبادی
یہ عشق کی دنیا ہے، کیا عشق کی دنیا ہے

تیری یہ کثیف آنکھیں اور حسن کا نظارا
بیتاب نہ ہو غافل جلوہ نہیں پردا ہے

عاشق ہے حفیظؔ آخر نفرت نہ کرو اس سے
انسان کی صورت ہے، اللہ کا بندہ ہے

(۱۹۲۱ء)

○

چلے تھے ہم کہ سیرِ گلشنِ ایجاد کرتے ہیں
کہ اتنے میں اجل آ کر پکاری یاد کرتے ہیں

ہجومِ آرزو سے شہرِ دل آباد کرتے ہیں
ہم اپنی خاک اپنے ہاتھ سے برباد کرتے ہیں

طرف داری نہ کر، انصاف کر اے داورِ محشر!
سزا دے ان بتوں کو ورنہ ہم فریاد کرتے ہیں

کبھی تو رنگ لائے گا کبھی تو گل کھلائے گا
ہم اپنا خون صرفِ گلشنِ ایجاد کرتے ہیں

ہمیں تو کار پردازانِ قدرت کھیل سمجھے ہیں
کبھی آباد کرتے ہیں کبھی برباد کرتے ہیں

کسی امید پر زندہ رہوں یا گھٹ کے مر جاؤں
وہ کیا کہتے ہیں اے قاصد وہ کیا ارشاد کرتے ہیں

حفیظ اپنی طبیعت پر مجھے خود رشک آتا ہے
مرے اشعار پر حضرت ہمیشہ صاد کرتے ہیں

(۱۹۱۷ء)

○

برہمن جس دن عدوے ماومن ہو جائے گا
شیخ بت خانے میں جا کر برہمن ہو جائے گا

فرش ہو یا عرش ہستی ہو عدم ہو کچھ بھی ہو
تم جہاں مل جاؤ گے میرا وطن ہو جائے گا

عشق پھر کرنے لگا دعویٰ انا المنصور کا
پھر زباں زد قصۂ دار و رسن ہو جائے گا

جان وتن نے آپ خود رکھی تھی بنیادِ حیات
یہ خبر کیا تھی فراقِ جان وتن ہو جائے گا

دہر کی بے مائیگی ہی سے نہ رہ مجبورِ زیست
مر بھی جا ہو جائے گا گور و کفن، ہو جائے گا

عشق کے انصاف پر فرہاد بھی ہے سرنگوں
یہ نہ تھا معلوم تیشہ کوہ کن ہو جائے گا

تیری آنکھوں کے برے اطوار ہیں پیارے حفیظؔ
دل کو آنکھوں میں نہ لا، دل بدچلن ہو جائے گا

(۱۹۲۱ء)

○

لہو رلوا گئی سیرِ بہارِ گلستاں مجھ کو
سنائی پتی پتی نے خزاں کی داستاں مجھ کو

مسلماں ہوں مگر اس شہر میں توبہ معاذ اللہ
صدائے نالۂ ناقوس ہے بانگِ اذاں مجھ کو

الٰہی کیا محبت نام ہے دم گھٹ کے مرنے کا
نہ تابِ ضبط ہے مجھ کو نہ یارائے فغاں مجھ کو

حماقت تھی مگر جرأت سمجھ کر راہزن بھاگے
پلٹ لائی تھی منزل سے تلاشِ کارواں مجھ کو

یہ محشر ہے تو ایسی ساحری کو کون مانے گا
کہ جھٹلاتے ہیں خود میری زباں میرا بیاں مجھ کو

عجب سودا ہوا ہے راہ سے کترا کے چلتا ہوں
نظر آتے ہیں رہزن نقشِ پائے رہرواں مجھ کو

گرا دی آسماں نے خانۂ صیاد پر بجلی
قفس پر آشیاں کا ہو چلا تھا اب گماں مجھ کو

حفیظ اپنی غزل کہنے کو جب الفاظ چنتا ہوں
نظر آتے ہیں یہ میرے ہی دل کی دھجیاں مجھ کو

(۱۹۲۳ء)

○

ہے قفس میں جو ازل ہی سے نشیمن میرا
منہ تکا کرتی ہے برقِ شرر افگن میرا

دیکھ اے رحمتِ حق میرے گلے سے نہ لپٹ
میں گنہگار ہوں آلودہ ہے دامن میرا

کب سے پابندِ قفس ہوں مجھے معلوم نہیں
شاخِ سدرہ پہ کسی دن تھا نشیمن میرا

روح کو خاک کے دامن میں لیے پھرتا ہوں
میرا قالب ہی حقیقت میں ہے مدفن میرا

گردنِ غیر میں ہیں ہاتھ حمائل ان کے
ہاں گلا گھونٹ کمندِ رگِ گردن میرا

جانب کعبہ تو چلتا ہوں مگر یا اللہ
بت کدہ میرا! صنم میرے!! برہمن میرا

نہ لگاؤ ہے کسی سے نہ مجھے لاگ حفیظ
دوست میرا کوئی دنیا میں نہ دشمن میرا

(۱۹۲۱ء)

○

مضحکہ آؤ اڑائیں عشق بے بنیاد کا
اک جدا مدفن بنائیں تیشۂ فرہاد کا

واہ واہ کیا رنگ بدلا گلشنِ ایجاد کا
سایۂ گل پر گماں ہونے لگا صیاد کا

بہ چلا ہے اشکِ حسرت المدد اے برقِ یاس
یہ بھی اک دانہ ہے میرے خرمنِ برباد کا

کس نگاہِ گرم سے دیکھا ہے اس نے وقتِ قتل
آہ ٹھنڈی پڑ گئی، دم گھٹ گیا فریاد کا

غنچہ غنچہ خوف سے مجھ کو نظر آیا قفس
پتے پتے پر ہوا دھوکا کفِ صیاد کا

یہ سمجھ لیجے ، کسی شاعر کے دل کا ٹوٹنا
ٹوٹ جانا ہے طلسمِ عالمِ ایجاد کا

ہو نہ احساس اسیری تو رہائی ہے محال
ایسے قیدی نام تک لیتے نہیں میعاد کا

ضعف کی یہ ہمتیں ہیں ناتوانی کا یہ زور
ٹکڑے ٹکڑے کر دیا دامن مری فریاد کا

اس سخنور سے مجھے فیض سخن ہے اے حفیظؔ
نام نامی ہے گرامی جس جہاں اُستاد کا

(۱۹۲۳ء)

○

مجازِ عین حقیقت ہے باصفا کے لیے
بتوں کو دیکھ رہا ہوں مگر خدا کے لیے

اثر میں ہو گئے کیوں سات آسماں حائل
ابھی تو ہاتھ اٹھے ہی نہیں دعا کے لیے

ہُوا بس ایک ہی نالے میں دم فنا اپنا
یہ تازیانہ تھا عمرِ گریز پا کے لیے

الٰہی ایک غمِ روزگار کیا کم تھا
کہ عشق بھیج دیا جانِ مبتلا کے لیے

ہمیں تو داورِ محشر کو چھوڑتے ہی بنی
خطائے عشق نہ کافی ہوئی سزا کے لیے

اسی کو راہ دکھاتا ہوں جو مٹائے مجھے
میں ہوں تو نور مگر چشمِ نقشِ پا کے لیے

یہ جانتا ہوں کہ ہے نصف شب مگر ساقی
ذرا سی چاہیے اک مردِ پارسا کے لیے

الٰہی تیرے کرم سے ملے مے و معشوق
اب التجا ہے برستی ہوئی گھٹا کے لیے

حفیظ عازمِ کعبہ ہوا ہے جانے دو
اب اس پہ رحم کرو اے بتو خدا کے لیے

(۱۹۳۰ء)

○

نہ جب تک جلوۂ کن واقفِ قندیلِ امکاں تھا
نہ یوں صورت سے روشن تھا نہ یوں معنی میں پنہاں تھا

غضب کا عبرت افزا انقلابِ چرخِ گرداں تھا
ابھی اک شور برپا تھا ابھی اک ہو کا میداں تھا

اُمید و یاس کی روداد ہے الفت کا افسانہ
کبھی جینے کے ارماں تھے کبھی مرنے کا ساماں تھا

وفورِ اشک نے آخر حقیقت کھول دی دل کی
اسی کوزے میں دریا تھا اسی قطرے میں طوفاں تھا

کبھی چشمِ بصیرت سے نہ دیکھی سرزمینِ دل
یہاں کا ذرّہ ذرّہ آفتابِ اَوجِ عرفاں تھا

ہوئی یہ رات بھر میں خندہ ہائے عیش کی صورت
چمن کا غنچہ غنچہ صبح کو اک چشمِ گریاں تھا

ہوائے جاہ و دولت وجہِ ناکامی ہوئی ورنہ
ہمارا بوریائے بے ریا تختِ سلیماں تھا

بہارِ آرزو کیسی؟ خزانِ یاس کے دن ہیں
ہمارا خطۂ دل ہاں کبھی گلشن بداماں تھا

بتوں کے عشق میں کیونکر پھنسا اب یہ خدا جانے
بظاہر تو ہمارا دل بڑا پکا مسلماں تھا

(۱۹۲۲ء)

○

بہت شوریدہ سر تھا میں ، بہت محشر بداماں تھا
مرا دستِ وگریباں بھی کبھی دست و گریباں تھا

وہ اک پردہ خرد کے لب پہ جس کا نام داماں تھا
جنوں کے ہاتھ میں تھا اور گریباں ہی گریباں تھا

مجھے برہم سمجھ کر ہجوِ مے کو پی گیا واعظ
وگرنہ آج میرا ہاتھ تھا اس کا گریباں تھا

حفیظ احباب کے ارشاد کی تعمیل کر دی ہے
کہ حکمِ قافیہ پیمائیِ لفظِ گریباں تھا

(۱۹۲۲ء)

○

ذرا انصاف کر او میری صورت دیکھنے والے
کہیں دیکھے بھی ہیں ایسی مصیبت دیکھنے والے

قفس میرا یہ کہہ کر لے چلا صیاد گلشن سے
تری پستی نہ دیکھیں تیری رفعت دیکھنے والے

مٹائے لوحِ دل سے یاس نے احساس کے نقشے
مجھے نادم نہ کر نقشِ ندامت دیکھنے والے

اٹھا رکھا ہے میں نے آپ کا دیدار محشر پر
مرا منہ تک رہے ہیں میری ہمت دیکھنے والے

لگایا اس لیے آئینہ اس نے روزنِ در میں
کہ اپنا منہ تو دیکھیں میری صورت دیکھنے والے

مجھے روتے ہوئے بے ساختہ ہنسنا بھی پڑتا ہے
اذیت پر تری ، میری اذیت دیکھنے والے

(۱۹۱۶ء)

○

شیخ کا خوف ہمیں حشر کا دھڑکا ہم کو
ساتھ ہی عشق کے آزار نے مارا ہم کو

موت کہتے ہیں جسے ضبط کا یہ خبط نہ ہو
زندگی پر بھی ہے فریاد کا دھوکا ہم کو

جاؤ ہاں جاؤ رقیبوں کی مرادیں برلاؤ
رہنے دو رہنے دو ناکامِ تمنا ہم کو

ہم تو انسان ہیں اے خضر ہمیں مرنا ہے
جینے دیتا نہیں فطرت کا تقاضا ہم کو

ہے ابھی دور بہت دور ہماری منزل
حکم ہے فرش سے تا عرشِ معلیٰ ہم کو

وہ نگہ باندھ گئی دل میں طلسمِ اُمید
نظر آتی ہے تمنا ہی تمنا ہم کو

شہرِ الفت میں نہیں تفرقہ پرداز حفیظؔ
کہیں کعبہ نظر آیا نہ کلیسا ہم کو

(۱۹۱۸ء)

○

الفت ہوئی ، ہوئی وہ ہوا بے وفا ہوا
اچھا ہوا ، برا ہوا ، جو بھی ہوا ، ہوا

رزاقِ دو جہاں کے خزانے کو کیا ہوا
ملتا ہے رنج وہ بھی کسی کا دیا ہوا

بیمارِ غم کی پوچھتے ہو سرگزشت کیا
اک آہ کی غریب نے اور دم ہوا ہوا

بس دور ہی سے زندگیِ خضر کو سلام
زہرابِ غم ہے آبِ بقا میں ملا ہوا

آنکھیں تو پھوٹ پھوٹ کے روتی ہیں ہجر میں
رہتا ہے پھر بھی آبلۂ دل بھرا ہوا

پھر مردہ آرزوؤں میں اک روح پھونک دی
گزرا پھر اس طرف سے کوئی دیکھتا ہوا

(۱۹۱۷ء)

○

اب راز کھل رہے ہیں ضبطِ غمِ نہاں کے
آنکھوں سے گر رہے ہیں ٹکڑے مری فغاں کے

ہونٹوں پہ جم گئے ہیں لختے دل و زباں کے
اب اختتام پر ہوں میں اپنی داستاں کے

پھر کون اسے سنبھالے، پہلو جو خود نکالے
ہر نفع میں ضرر کے ہر سود میں زیاں کے

یہ اک نئی ادا ہے انگڑائی لے رہا ہے
پر تل رہے ہیں شاید اُڑنے کو مرغِ جاں کے

با ایں ہمہ کہولت، یہ پیرزالِ دنیا
پیچھے پڑی ہوئی ہے ہر ایک نوجواں کے

جا گو حفیظ پیارے جب تک کھلے ہیں تارے
شاید کوئی تمھی کو ان کھڑکیوں سے جھانکے

(۱۹۱۷ء)

○

عشق میں چھیڑ ہوئی دیدۂ تر سے پہلے
غم کے بادل جو اٹھے تو یہیں برسے پہلے

اب جہنم میں لیے جاتی ہے دل کی گرمی
آگ چمکی تھی یہ اللہ کے گھر سے پہلے

ہاتھ رکھ رکھ کے وہ سینے پہ کسی کا کہنا
دل سے درد اٹھتا ہے پہلے کہ جگر سے پہلے

دل کو اب آنکھ کی منزل میں بٹھا رکھیں گے
عشق گزرے گا اسی راہ گزر سے پہلے

وہ ہر اک وعدے سے انکار بطرزِ اقرار
وہ ہر اک بات پہ "ہاں" لفظِ "مگر" سے پہلے

میرے قصے پہ وہی روشنی ڈالے شاید
شمعِ کم مایہ جو بجھتی ہے سحر سے پہلے

چاکِ دامانیِ گل کا ہے گلہ کیا بلبل
کہ الجھتا ہے یہ خود بادِ سحر سے پہلے

کچھ سمجھ دار تو ہیں نعش اٹھانے والے
لے چلے ہیں مجھے اس راہ گزر سے پہلے

دل نہیں ہارتے یوں بازیِ الفت میں حفیظؔ
کھیل آغاز ہوا کرتا ہے سر سے پہلے

(۱۹۱۸ء)

○

دنیائے حسن و عشق میں یہ امتیاز ہے
اک ہے نیاز مند تو اک بے نیاز ہے

سچ پوچھیے تو نیستی ہستی کا راز ہے
جو سر چڑھا ہے دار پہ وہ سرفراز ہے

کچھ ہوش ہے تو چشمِ حقیقت نگر سے دیکھ
محمود! ذرّے ذرّے میں حسنِ ایاز ہے

ٹوٹے تو موت ہی سے یہ ٹوٹے گا سلسلہ
ورنہ شبِ فراق کی رسی دراز ہے

دیکھو حفیظ عشق کی یہ بے نیازیاں
آنکھیں نیاز مند ہیں دل بے نیاز ہے

(۱۹۱۳ء)

○

فلک سے آج شورِ نعرۂ مستانہ آتا ہے
کوئی مے نوش بادل جانبِ میخانہ آتا ہے

لحاظِ خاطرِ احبابِ دیرینہ ہے اے زاہد
چلوں کیا سوئے مسجد راہ میں میخانہ آتا ہے

محبت کے علاوہ کچھ نہ پوچھ اے داورِ محشر
مجھے تو بس یہی قصہ یہی افسانہ آتا ہے

یہ کس کی جستجو میں رشکِ مجنوں بن گئی لیلیٰ
یہ کیا ہے آج محمل جانبِ ویرانہ آتا ہے

امیدِ مرگ بھی یونہی سی ہے مجھ کو شبِ فرقت
نہ آئے دوست ہی تو کب کوئی بیگانہ آتا ہے

سخن کی قدردانی زندگانی میں نہیں ہوتی
یہاں جب شمع بجھ لیتی ہے تب پروانہ آتا ہے

حفیظ اس بزمِ رنداں میں مجھے بھی لے چلو اک دن
بقدرِ ظرف گردش میں جہاں پیمانہ آتا ہے

(۱۹۲۴ء)

○

مجھے بھی آج ان سے بات کرنے میں حجاب آیا
ہمیں کیا ہو گیا یارب! یہ کیسا انقلاب آیا

تصور میں بھی اب وہ بے نقاب آتے نہیں مجھ تک
قیامت آ چکی ہے لوگ کہتے ہیں شباب آیا

کوئی سازش ہے یا میرے مقدر کی نوازش ہے
کہ آیا محتسب بھی ساتھ جب جامِ شراب آیا

مری سیرِ دو عالم کا مرقع ایک مصرع ہے
اِدھر گزری شبِ فرقت ادھر یومِ حساب آیا

ہزاروں باوفا معشوق ہیں لیکن مری قسمت
جب آیا بے وفاؤں پر دلِ خانہ خراب آیا

نظر آتا ہے کچھ بدلا ہوا سا رنگ عالم کا
حفیظؔ اک دو برس میں دیکھ لینا انقلاب آیا

(۱۹۱۶ء)

○

قرینِ مصلحت ہے چند سجدے قبلہ رو کر لوں
مگر اس باب میں پہلے بتوں سے گفتگو کر لوں

ذرا دم لے کوئی ساعت ٹھہر اے مرگِ مایوسی
تمنا ہے کہ ان سے آخری اک آرزو کر لوں

وہ آوازِ اذاں آئی ، مرا پیمانہ بھر ساقی
جنابِ شیخ چلیے سوئے مسجد مَیں وضو کر لوں

فراقِ دوستانِ بزمِ ہستی شاق ہے لیکن
ذرا گم گشتگاں کی بھی عدم میں جستجو کر لوں

حفیظ آسان ہے ترکِ وفا میرے لیے لیکن
زمانے بھر کی لعنت کس لیے طوقِ گلو کر لوں

(۱۹۳۰ء)

○

کمبخت دِل برا ہو تری آہ آہ کا
حسنِ نگاہ بھی نہ رہا گاہ گاہ کا

چھیڑو نہ میٹھی نیند میں اے منکر و نکیر
سونے دو بھائی میں تھکا ماندہ ہوں راہ کا

میرے مقلدوں کو مری راہِ شوق میں
ہر گام پر نشان ملا سجدہ گاہ کا

دل سا گواہ حشر میں آ کر پھسل گیا
اب رحم پر معاملہ ہے داد خواہ کا

کس منہ سے کہہ رہے ہو ہمیں کچھ غرض نہیں
کس منہ سے تم نے وعدہ کیا تھا نباہ کا

دل لینے والی بات اسی دل سے پوچھیے
مالک یہی ہے میرے سفید و سیاہ کا

پیش خدا چلو تو مزہ جب ہے اے حفیظ
نعرہ ہو لب پہ اشہد اَنْ لَّآ اِلٰہَ کا

(۱۹۱۵ء)

○

یہ کیسی بجلیاں سی کوندتی ہیں میرے شیون میں
لگے آگ اس محبت کو لگا دی آگ سی تن میں

نہ کرنا بھول کر رخ اس طرف اے ناقۂ لیلیٰ
غبارِ قیس پھرتا ہے ابھی تک نجد کے بن میں

پڑی ہے ٹھوکریں کھانے کو اس ظالم کے کوچے میں
یہ کہہ دو اٹھ کے آ جائے قیامت میرے مدفن میں

اسی سے لوگ جیتے ہیں اسی سے لوگ مرتے ہیں
یہ کیا اعجاز کیا جادو ہے چشمِ سامری فن میں

حفیظ آغوشِ مادر کا مزا آیا یہاں مجھ کو
بڑی راحت بڑا آرام پایا کنجِ مدفن میں

(۱۹۱۵ء)

مری آنکھیں ہیں ساقی پر مری نیت ہے کوثر میں
مزے دونوں جہاں کے مل رہے ہیں ایک ساغر میں

نہ چھیڑ اے ہم نشیں ہم ہیں خیالِ روئے دِلبر میں
برسنے کو بھرے بیٹھے ہیں بادل دیدۂ تر میں

یہ کس دُولھا نے باندھا ہے شعاعِ طور کا سہرا
یہ کیسا نور ہے جس نے لگا دی آگ محشر میں

خدا کے واسطے دیکھو او موذن وصل کی شب ہے
چھری چل جائے گی مجھ پر تری اللہ اکبر میں

سزائے معصیت اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی
الٰہی میکشوں کو غرق کر دے حوضِ کوثر میں

حفیظؔ اس کے حضور اک سجدہ کرنے کی تمنا ہے
سرفرازی کا سودا بھر دیا جس نے مرے سر میں

○

اٹھ اٹھ کے بیٹھ بیٹھ گئے پھر رواں رہے
ہم صورتِ غبار پسِ کارواں رہے

مشقِ سخن کے اب وہ زمانے کہاں رہے
کیا خوب لوگ تھے جو مرے ہم زباں رہے

وہ بت ہمارے پاس! خدا ساز بات تھی
ہم مدتوں خدا کی قسم بدگماں رہے

اچھا جنابِ عشق ہیں؟ تشریف لائیے!!
خوب آئے آپ! آئیے حضرت کہاں رہے

صاحب ہماری توبہ، ہمیں باز آ گئے
ہاں ہاں کے بعد پھر بھی نہیں ہے تو ہاں رہے

ہم بے کسی کے فیض سے دریائے شوق میں
تنکے کی طرح موج کے بل پر رواں رہے

یہ پاسِ وضع تھا کہ اناالحق نہ کہہ سکے
اہلِ زباں تھے ہم بھی مگر بے زباں رہے

سر سینکڑوں، جہاں میں سروں کی کمی نہیں
اس آستاں کی خیر ہو وہ آستاں رہے

دیکھیں کسی کی قبر بھی رہتی ہے یا نہیں
ہر اک یہ چاہتا ہے کہ میرا نشاں رہے

پھر بھی رواں ہے جانب ساحل جہازِ عمر
لنگر رہا کوئی نہ کہیں بادباں رہے

گزرے ہوئے شباب کے قصے نہ چھیڑیے
وہ ہم نہیں رہے تو بھلا تم کہاں رہے

بیچارگی سی تھی مری آوارگی حفیظؔ
جس طرح کوئی خواب میں اٹھ کر رواں رہے

(۱۹۲۳ء)

○

بے تعلق زندگی اچھی نہیں | زندگی کیا موت بھی اچھی نہیں
آج بھی پایا ہے ان کو بدمزاج | صورتِ حالات ابھی اچھی نہیں
حسرتِ دل دیکھ آنکھوں میں نہ بیٹھ | اس قدر بے پردگی اچھی نہیں
میں نہ کہتا تھا دلِ خانہ خراب | دل بروں سے دل لگی اچھی نہیں
سیر کیجے حسن کے بازار کی | ہاں مگر آوارگی اچھی نہیں
دل لگاؤ تو لگاؤ دل سے دل | دل لگی ہی دل لگی اچھی نہیں

یہ ہوا یہ ابر یہ سبزہ حفیظ
آج پینے میں کمی اچھی نہیں

(۱۹۲۳ء)

○

وہ قافلہ آرام طلب ہو بھی تو کیا ہو
آوازِ نفس ہی جسے آوازِ درا ہو

خاموش ہو کیوں دردِ محبت کے گواہو
دعوے کو نباہو، مرے نالو، مری آہو

ہر روز جو سمجھانے چلے آتے ہو ناصح
میں پوچھتا ہوں تم مجھے سمجھے ہوئے کیا ہو؟

اس دارِ بقا میں مری صورت کوئی دیکھے
اک دم کا بھروسا ہے جو اک دم میں فنا ہو

مجھ کو نہ سنا خضر و سکندر کے فسانے
میرے لیے یکساں ہے فنا ہو کہ بقا ہو

(۱۹۱۷ء)

○

وہ ہم نہیں کہ مریں عمرِ جاوداں کے لیے
دعائیں مانگتے ہیں مرگِ ناگہاں کے لیے

کسی نے کی نہ سفارش مری گزارش پر
نہیں سنی ہے ہزاروں سے ایک ہاں کے لیے

فلک کو ہجر کی شب بادلوں نے ڈھانپا ہے
یہ انتظام ہوئے ہیں مری فغاں کے لیے

ہمارے بعد کرو گے تلاش تم خود ہی
کسی کو دل کے لیے اور کسی کو جاں کے لیے

ترے حضور مجھے لے تو آئے ہیں یارب
سمجھ کے حکم ملے بندۂ بتاں کے لیے

(۱۹۱۷ء)

○

اے برہمن مجھے زنار سے کیا کام ابھی
میری گردن میں تو ہے رشتۂ اسلام ابھی

حسن والوں کو ابھی سے مرا دشمن نہ بنا
عشق کا ذکر تو کر، لے نہ مرا نام ابھی

چشمِ ساقی ابھی مشغول ہے کم ظرفوں میں
مجھ تک آیا نہیں گردش ہی میں ہے جام ابھی

ابھی آغازِ جوانی ہے خوش اوقات ہیں دوست
جام دیتے ہیں دکھاتے نہیں انجام ابھی

قیس و فرہاد پہ موقوف نہیں کیا معلوم
دربدر کس کو پھرائے ہوسِ خام ابھی

زلف و رخسارِ سخن میں ہوں گرفتار حفیظ
اسی الجھن میں ہیں میرے سحر و شام ابھی

(۱۹۲۱ء)

○

تو قریب رگ جاں بھی ہے، بہت دور بھی ہے
دار بھی پیش نظرِ جرأتِ منصور بھی ہے

وصل دائم بھی رکھے ہجر کو قائم بھی رکھے
زاہدا ایسی تیری حوروں میں کوئی حور بھی ہے

وقتِ رخصت میری آنکھوں کی سفیدی پہ نہ جاؤ
چہرۂ صبح کو دیکھو تو کہیں نور بھی ہے

اہل سمجھا گیا آقائی و مختاری کا
یہی انسان کہ پابند بھی مجبور بھی ہے

مل تو لیجے کہ برا شخص نہیں ہے یہ حفیظ
محض عاشق ہی نہیں شاعرِ مشہور بھی ہے

(۱۹۲۳ء)

○

کفر کی دل شکنی ہم نہیں کرنے والے
ہم مسلمان ہیں اللہ سے ڈرنے والے

باغِ فردوس تو منزل ہے تھکے ہاروں کی
ہم تو چلتے ہیں ٹھہر جائیں ٹھہرنے والے

غرقِ گرداب ہو یا برسرِ ساحل کشتی
ایک ہی گھاٹ اترتے ہیں اترنے والے

وادیٔ عشق ہے یارو! عدم آباد نہیں
ہم تو ہرگز نہیں خاموش گزرنے والے

ہم کو اقرار ہے ہنگامۂ عالم ہم تھے
داورِ حشر! بھلا ہم ہیں مکرنے والے

اسے پڑھ لے کہ ہے افسانۂ دلچسپ حفیظ
کوئی دم میں ہیں یہ اوراق بکھرنے والے

(۱۹۱۸ء)

○

حشر کے اقرار پر یا طور کے انکار پر
ہر طرح بجلی گری ہے طالبِ دیدار پر

موسیٰ و منصور سے اتنا تو کوئی پوچھ دے
لطفِ نظارہ ملے گا کوہ پر یا دار پر

کون جاگے، صبح تک چلتے بنے تیمار دار
شمع کا سنسان عالم رہ گیا بیمار پر

ہستیِ گل کی حقیقت بس یہی اک دو ورق
ہستیِ بلبل کی صورت، بس یہی دو چار پر

میرے لب پر ہے میرا ٹوٹا ہوا دل، ہم نفس
ضربِ پیہم نغمہ زن ہے اک شکستہ تار پر

چارہ گر ہم اور مداوا عشق کے آزار کا
جان جاتی ہے ہماری عشق کے آزار پر

دوستوں کی دردمندانہ ہنسی نے اے حفیظ
کر دیا مجبور مجھ کو درد کے اظہار پر

(۱۹۱۸ء)

○

یوں ترازو مرے دل میں ترا پیکاں ہوگا
داورِ حشر بھی انگشت بدنداں ہوگا

دامنِ دشت و غبارِ دل لیلیٰ ہے لباس
لاکھ عریاں ہو مگر قیس نہ عریاں ہوگا

کب مٹانے سے مٹا داغ سیہ کاری کا
صورتِ مہر سرِ حشر نمایاں ہوگا

جان جاتی ہے گھڑی بھر کے لیے اور نہ جا
جاتے جاتے یہ مری جان پہ احساں ہوگا

جو بھی کچھ نامۂ اعمال پہ لکھوں گا حفیظؔ
خونِ ارماں میری تحریر کا عنواں ہوگا

(۱۹۱۵ء)

○

اٹھو اب دیر ہوتی ہے وہاں چل کر سنور جانا
یقینی ہے گھڑی دو میں مریضِ غم کا مر جانا

مجھے ڈر ہے گلوں کے بوجھ سے مرقد نہ دب جائے
انھیں عادت ہے جب آنا ضرور احسان دھر جانا

حباب آسا مٹے سب ولولے جوشِ جوانی کے
غضب تھا قلزمِ اُمید کا چڑھ کر اتر جانا

بری حالت بری شے ہے کہ ہم نے دوست دشمن کو

یہاں جز کشتیِ موجِ بلا کچھ بھی نہ پاؤ گے
اسی کے آسرے دریائے ہستی سے اتر جانا

مبادا پھر اسیرِ دامِ عقل و ہوش ہو جاؤں
جنوں کا اس طرح اچھا نہیں حد سے گزر جانا

حفیظ آغاز سے انجام تک رہزن نے پہنچایا
اسی کو ہم سفر پایا اسی کو ہم سفر جانا

(۱۹۱۷ء)

○

شب فرقت قرارِ جانِ مضطر ہو تو کیونکر ہو
شعاعِ آفتابِ حشر جب ہر تارِ بستر ہو

میرا کیا پوچھتے ہو، قافلے کے ساتھ میں بھی ہوں
وہ رہرو ہوں کہ جس کا اک ہجوم غول رہبر ہو

میں وہ برگِ بہار آلودہ ہوں اجڑے گلستاں میں
بگولے جس کے شائق جس پہ عاشق بادِ صرصر ہو

یہی نازک دماغی باعثِ رسوائیِ گل ہے
صبا کی اک ذرا سی چھیڑ میں جامے سے باہر ہو

مجھے اُردو میں حاصل کیوں نہ ہو رتبہ نظامی کا
حفیظ استاد میرا جب گرامی سا سخنور ہو

(۱۹۱۷ء)

○

یار پہلو میں نہیں ویرانہ ہے میخانہ آج
گردشِ قسمت بنی ہے گردشِ پیمانہ آج

قہر آلودہ ہے چشمِ ساقی مستانہ آج
ہو گیا لبریز کس کی عمر کا پیمانہ آج

آپ کے فیضِ قدم سے یہ خرابہ بس گیا
غیرتِ خلدِ بریں ہے شیخ جی میخانہ آج

میرے زانو پر گرادے لاکے اس میخوار کو
اک ذرا سا کام کر اے لغزشِ مستانہ آج

پھر خطا کی اس کا سر پھر آج کاٹا جائے گا
شمع نے دیکھو جلائے پھر پرِ پروانہ آج

محتسب کا ہائے پھر دستِ تعدی ہے دراز
ہائے پھر ٹوٹے پڑے ہیں شیشہ و پیمانہ آج

میہماں وہ برق وش ہے آج قسمت سے حفیظؔ
بن گیا ہے وادیٔ ایمن مرا کاشانہ آج

○

دوستی کا چلن رہا ہی نہیں　　اب زمانے کی وہ ہوا ہی نہیں
سچ تو یہ ہے صنم کدے والو　　دِل خدا نے تمھیں دیا ہی نہیں
پلٹ آنے سے ہو گیا ثابت　　نامہ بر تو وہاں گیا ہی نہیں
حال یہ ہے کہ ہم غریبوں کا　　حال تم نے کبھی سنا ہی نہیں
کیا چلے زورِ دشتِ وحشت کا　　ہم نے دامن کبھی سیا ہی نہیں
غیر بھی ایک دن مریں گے ضرور　　ان کے حصے میں کیا قضا ہی نہیں
اس کی صورت کو دیکھتا ہوں میں　　میری سیرت وہ دیکھتا ہی نہیں
عشق میرا ہے شہر میں مشہور　　اور تم نے ابھی سنا ہی نہیں
قصۂ قیس سن کے فرمایا　　جھوٹ کی کوئی انتہا ہی نہیں

واسطہ کس کا دیں حفیظؔ ان کو
ان بتوں کا کوئی خدا ہی نہیں

○

ابھرے جو خاک سے وہ تہِ خاک ہو گئے
سب پائمال گردشِ افلاک ہو گئے

رکھتی تھی لاگ میرے گریباں سے نو بہار
دامن گلوں کے باغ میں کیوں چاک ہو گئے

تھے دیدہ ہائے خشک محبت کی آبرو
کم بخت ان کے سامنے نمناک ہو گئے

ایسا بھی کیا مزاج قیامت کا دن ہے آج
پیشِ خدا تم اور بھی بے باک ہو گئے

آتے ہی بزمِ وعظ سے چلتے بنے حفیظؔ
دو حرف سن کے صاحبِ ادراک ہو گئے

(۱۹۱۶ء)

○

مری بے مائگی شرما رہی ہے اہلِ گلشن سے
کبھی بجلی نہ آسودہ گئی میرے نشیمن سے

گلوں پر ٹوٹنے والے بہاریں لوٹنے والے
سنا ہے اب نکالے جا رہے ہیں صحنِ گلشن سے

وہ روز آتے ہیں پہروں بیٹھ کر آنسو بہاتے ہیں
الٰہی کون سا فتنہ اٹھے گا میرے مدفن سے

مثالِ گرد میں بھی آج سرگرمِ تعاقب ہوں
کہ اترے گا کہیں تو شہسوارِ ناز توسن سے

حفیظ آساں نہیں سودائے الفت، ہم بھی دیکھیں گے
اٹھایا جائے گا کب تک یہ سر کا بوجھ گردن سے

[(لکھنؤ کے پہلے مشاعرے میں پڑھی)] (۱۹۲۱ء)

○

چلی ہے جان یادِ رفتگاں میں — مسافر ہے تلاشِ کارواں میں
کوئی اتنا تو پوچھے باغباں سے — اگایا کیوں مجھے دورِ خزاں میں
ہوا کہتی ہے مجھ سے گلستاں کی — تجھے رہنا نہیں ہے آشیاں میں
خدا ، انسان ، جنت اور شیطاں — میرا ہی ذکر ہے اس داستاں میں
نظر آتا ہوں اِک ننھا سا قطرہ — مگر شامل ہوں دریائے رواں میں
سنا ہے مہر بن جاتا ہے ذرّہ — اگر آئے نگاہِ مہرباں میں
بتوں سے جنگ کرنے کو خدا نے — مجھے پیدا کیا ہندوستاں میں
کروں گا موم اِک دن پتھروں کو — اگر تاثیر ہے میری زباں میں
بتوں کا ممتحن کر دے الٰہی — سوالِ وصل رکھ دوں امتحاں میں
حفیظ آیا ہے ارشادِ گرامی
تیرا دل چاہیے تیری زباں میں

(۱۹۱۵ء)

○

اگر یہ حضرت دل عشق سے حذر کرتے
تو کیا ہی لطف سے ہم زندگی بسر کرتے

نہ فرشِ راہ اگر ہم دل و جگر کرتے
قدم قدم پہ قیامت یہ فتنہ گر کرتے

جو واعظوں کو کہیں چاٹ عشق کی ہوتی
تو منبروں پہ نہ اتنی اگر مگر کرتے

پہاڑ تک لرز اٹھتے ہیں میرے نالوں سے
یہ بات کیا ہے بتوں پر نہیں اثر کرتے

قدم قدم پہ نہ ملتا جو رہبروں کا ہجوم
خیال یہ تھا کہ ہم عمر بھر سفر کرتے

حفیظؔ کاش جناب بیان یزدانی[1]
میرے کلام پہ اصلاح کی نظر کرتے (۱۹۱۳ء)

---

[1] حضرت بیان و یزدانی میرٹھی مرحوم، مجھے لڑکپن میں بہت تمنا تھی کہ آپ سے اصلاح لوں، یہ غزل میرٹھ میں کہی تھی، لیکن مرحوم خود فراموش ہو چکے تھے۔ (حفیظ)

○

مدتوں تک جو پڑھایا کیا استاد مجھے
عشق میں بھول گیا کچھ نہ رہا یاد مجھے

کیا میں دیوانہ ہوں یارب کہ سرِ راہ گزر
دور سے گھورنے لگتے ہیں پریزاد مجھے

اب ہے آواز کی وہ شان نہ بازو کی اُڑان
اور صیاد کیے دیتا ہے آزاد مجھے

داد خواہی کے لیے اور تو ساماں نہ ملا
نالہ و آہ پہ رکھنی پڑی بنیاد مجھے

میرے شعروں پہ وہ شرمائے تو احباب ہنسے
اے حفیظ آج غزل کی یہ ملی داد مجھے

(۱۹۱۳ء)

○

کہا شیریں نے رو کر لاشۂ فرہاد کے آگے
یہی اے پیرزن آئے تری اولاد کے آگے

کفِ افسوس ملنے کے سوا اب تک بہلنے کی
کوئی صورت نہیں شاید دِل ناشاد کے آگے

"سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے"
میرا اک شعر لکھ دو اس غلط ارشاد کے آگے

محبت کی نظر سے جو بھی چاہے قتل کر ڈالے
جھکے گا سر نہ میرا خنجرِ جلاد کے آگے

حفیظ ان زاہدوں نے زندگی کی راہ روکی ہے
کہ جھنڈے گاڑ رکھے ہیں عدم آباد کے آگے

(۱۹۱۵ء)

○

پھر لطف خلش دینے لگی یاد کسی کی
پھر بھول گئی یاد کو بیداد کسی کی

پھر رنج و الم کو ہے کسی کا یہ اشارا
اجڑی ہوئی بستی کرو آباد کسی کی

پھر خط کا جواب ایک وہی طنز کا مصرع
مجبور ہے کیوں فطرتِ آزاد کسی کی

پھر دے کے خوشی ہم اسے ناشاد کریں کیوں
غم ہی سے طبیعت ہے اگر شاد کسی کی

پھر پند و نصیحت کے لیے آنے لگے دوست
وہ دوست جو کرتے نہیں اِمداد کسی کی

پھر شہر میں چرچا ہے نئی سنگ زنی کا
اخبار میں پھر درج ہے روداد کسی کی

پھر بابِ اثر کا کوئی رستہ نہیں ملتا
پھر بھٹکی ہوئی پھرتی ہے فریاد کسی کی

پھر خاک اُڑاتے ہوئے پھرتے ہیں بگولے
پھر دشت میں مٹی ہوئی برباد کسی کی

پھر میں بھی کروں کیوں نہ حفیظ اس پہ تسلط
جاگیر نہیں طبعِ خدا داد کسی کی

(۱۹۲۴ء)

(۰)

چکر ہے پاؤں میں بھی سودا بھی میرے سر میں
روکے رکھیں گے کب تک یہ لوگ مجھ کو گھر میں

اس کی ستم گری کا رونا جو رو رہے ہیں
نشتر چبھو رہے ہیں میرے دل و جگر میں

برباد زندگانی دل ہی کی ہے کہانی
کھویا ہے ایک پل میں پایا تھا عمر بھر میں

یہ پھول پیارے پیارے یہ چاند یہ ستارے
جس سمت دیکھتا ہوں تو ہے مری نظر میں

ہیں نام ہی سے ظاہر یہ کام بھی ہمارے
دم کیوں نہ آدمی دے شر کیوں نہ ہو بشر میں

مشقِ سخن کئے جا جب تک حفیظ تجھ میں
تیری نظر دکھائے خامی ترے ہنر میں

(۱۹۱۴ء)

سوز و ساز

دیباچہ

(از پنڈت ہری چند اختر ایم اے)

شاہنامۂ اسلام اور نغمہ زار وغیرہ کا مصنف اب کسی ماہرفن اور بلند آواز نقیب کی خدمات سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ مہذب محفل میں نووارد اور اجنبی کو بے شک تعارف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قاعدہ کی رو سے جب حفیظ نووارد اور اجنبی تھے انہوں نے اپنا تعارف اہل بزم سے خود بخود کر لیا تھا۔ پھر ۱۹۲۵ء میں اُن کے کلام کا سب سے پہلا مجموعہ ''نغمہ زار'' کے نام سے شائع ہوا تو ملک الشعراء حضرت مولانا گرامی قدس سرہٗ نے چند تعریفی یا تعارفی اشعار کہہ کر اور پروفیسر سید احمد شاہ صاحب بخاری (پطرس) نے چند سطور نثر لکھ کر یہ ضابطہ پورا کر دیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۷ء میں نغمہ زار دوسری مرتبہ شائع ہوا تو میرے دوست پروفیسر تاثیر ایم اے[1] نے ایک مختصر مگر جامع دیباچہ اس خیال سے بڑھا دیا کہ یہ طرزِ سخن بالکل نیا ہونے کے باعث اُردو شاعری کی محفل میں نووارد کی حیثیت رکھتا تھا اور اس نرالے طرزِ سخن کی خصوصیات و امتیازات پر (مختصر طور پر ہی سہی) روشنی ڈالنا تعارف کی شرائط میں داخل تھا۔

پس جہاں تک بزم شعر و سخن میں تعارف و تقریب کا تعلق ہے یہ کام ضابطہ کی حد تک انجام پا چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس جامع تعریف کے ساتھ پطرس نے حضرت حفیظ کو بزم شعر و سخن میں پیش کیا تھا وہ اس تعریف کے اہل ثابت ہوئے ہیں یا نہیں اور ان کے طرز شاعری کے متعلق جن خصوصیات اور امتیازات کا تاثیر نے دعویٰ کیا تھا انھیں اہل بزم نے تسلیم کر لیا ہے یا نامطبوع اور نامعقول کہہ کر روک دیا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر تاثیر کا ۱۹۵۰ء میں انتقال ہو چکا ہے۔ اب تک اس دور میں اُردو ادب کے سب سے بڑے نقاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ (حفیظ)

کسی شاعر کے کلام اور طرزِ سخن پر ہم دو پہلوؤں سے نظر ڈال سکتے ہیں۔ یعنی موجودہ قبولیت اور قبولِ دوام کی توقع۔ حضرت حفیظ کی موجودہ قبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی شاعری اور طرزِ سخن کو قبولِ عام کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہے، بلکہ بقول حضرت تاثیر قبولیت کی مضرتیں بھی لاحق ہو گئی ہیں سے ۱۹۲۳ء یعنی جب سے حضرت حفیظ نے مناظر قدرت کی تصویر کشی، چھوٹی مترجم بحروں میں جذبات کے اظہار اور دردِ دل کو ملکی دھنوں اور گیتوں کے سانچہ میں ڈھالنے کا آغاز کیا ہے۔ اُردو کا کوئی رسالہ اٹھا کر دیکھیے، شعر و سخن کی کسی محفل میں شریک ہو کر اندازہ کیجیے آپ کو بیک وقت حفیظ کے تتبع کے متعدد نمونے نظر آئیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ تتبع کرنے والوں میں سے اکثر و بیشتر فطری مناسبت سے محروم ہونے کے باعث بہت بری طرح ٹھوکریں کھاتے ہیں اور اپنے آپ کو مضحکہ کا سامان بنا لیتے ہیں لیکن سوال کامیاب یا ناکام نقل کا نہیں بلکہ رجحان اور قبولیت کا ہے۔ بے بضاعت اور کم سواد لوگوں کی لغزشوں کو آپ قبولیت کی لغزشیں کہہ سکتے ہیں لیکن اگر تتبع واقعی قبولیت کا سب سے نمایاں اعتراف ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ رنگِ نو جس کی تخلیق کا باعث حفیظ ہے، اُردو دنیا کو بڑی حد تک متاثر کر چکا ہے۔ ایک طرف سخن فہم اور ذوقِ صحیح رکھنے والا طبقہ حفیظ کو مخترع تسلیم کر رہا ہے۔ دوسری جانب سخن سنج معاصرین کو یہ سیلابِ رنگ بہائے لیے جا رہا ہے۔ مبتدیوں کا ذکر نہیں کہنہ مشق اور پرانے سکول کے مستند شعرائے اُردو بھی اس طرزِ نو کا تتبع کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ طرز نہ صرف مقبول ہو رہا ہے بلکہ قدامت پرستی کے وہ دعوے دار بھی جو ابتدا میں بعض گفتنی یا ناگفتنی وجوہ کی بنا پر حضرت حفیظ کی جدت کو بدعت قرار دے کر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے، اب اپنے کو حفیظ کے تتبع پر مجبور پاتے ہیں۔

قبولِ دوام کے متعلق میں تسلیم کرتا ہوں کہ فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام لینا سخت خطرناک ہے۔ قبولیت ایک عجیب و غریب مخلوق ہے کہ مر مر کر زندہ ہوتی ہے۔ اور جی جی کر مرتی ہے۔ ایک وقت تک جسے کوئی پوچھتا بھی نہ ہو کچھ مدت کے بعد وہی بکنے لگتا ہے اور کل جس کے جھنڈے گڑے تھے آج اس کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ اندھا شاعر ہومر جب دنیا میں موجود تھا تو اس کے اشعار سن کر کوئی بھیک بھی مشکل سے دیتا تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد

ایک زمانہ ایسا آیا کہ یونان کے وہی سات شہر جن کے گلی کوچوں میں وہ در بدر خاک بسر لاٹھی ٹیکتا پھرتا تھا اس کی جائے ولادت ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔ ایرانی شعرا میں سے ایک طرف عمر خیام ہے جس کی قسمت دیکھیے کتنی مدت کے بعد جاگی اور کہاں جا کر جاگی۔ دوسری جانب حافظ شیراز ہیں کہ ان کی قبولیت ان کی زندگی سے اس وقت تک بدستور قائم ہے اور نہ جانے کب تک قائم رہے گی۔ اُردو شاعروں میں غالب اور ذوق کو لیجیے۔ اپنی زندگی میں ذوق ملک الشعرا خاقانی ہند تھا اور غالب مہمل گو لیکن آج ملک سخن میں غالب کا سکہ رواں ہے اور ذوق کی شہرت آزاد مرحوم کا وہ سحر کار قلم بھی قائم نہ رکھ سکا جس نے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو آفتاب عالمتاب ثابت کرنے کی کوشش میں اُردو شاعری کو کم از کم پچاس سال پیچھے پھینک دیا۔

ان حالات کے پیش نظر بظاہر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قبولیت کے پیدا ہونے کا وقت مقرر کرنا اور اس کے بڑھنے پھیلنے گھٹنے سمٹنے سے اس کی عمر کا اندازہ لگانا سخت مشکل ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ابنائے زمانہ کس کو کس وقت زندہ درگور کر دیں گے اور کس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر سر پر رکھ لیں گے، آنکھوں سے لگائیں گے؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ظاہری موانع کے باوجود قبولِ دوام کے متعلق تھوڑا بہت اندازہ کر لینا ناممکن نہیں۔ مندرجہ بالا بیان سے قبولیت کے اندازہ کی دشواریوں کے علاوہ کچھ اور بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن شعرا کو ہم عصروں کی بدمذاقی اور مذہبی مجلسی یا مقامی تعصبات کے باعث یا بعض دیگر حالات کی بنا پر اپنی موت کے بعد قبولیت حاصل ہوئی ان کے کلام میں کچھ ایسی باتیں ضرور موجود تھیں جن کا کسی نہ کسی وقت مرغوب خلائق ہونا لازمی امر تھا۔ حافظ کے کلام میں اکثر باتیں وقت کی ضرورت اور حالات کے مطابق تھیں، مگر طرز سخن اور موضوع کلام اس قدر نمایاں مقامی رنگ کے باوجود زمان و مکاں کی زنجیروں میں ایسی بری طرح جکڑے ہوئے نہیں تھے کہ آئندہ زمانے اور دیگر ممالک کے بامذاق لوگ حافظ کے کلام سے محظوظ اور مستفید نہ ہو سکیں چنانچہ وہ اپنی زندگی میں بھی مقبول ہوا اور اب تک مقبول چلا آتا ہے۔ خیام کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ نہ صرف اس کے ہمعصروں کی بدمذاقی اور تنگ نظری پر

دال ہے بلکہ اس افسوسناک حقیقت کا بھی کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایشیائی نقاد کو یورپی عینک کے بغیر کچھ بجھائی ہی نہیں دیتا۔

غالب کی مثال سے جہاں وقتی رائے کی بے وقعتی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ راز بھی کھلتا ہے کہ بعض قابل قدر جدتیں قبل از وقت معرض وجود میں آ کر کچھ مدت کے لیے نامطبوع بلکہ مردود ہو جاتی ہیں مگر وقت آنے پر ان کی ایسی قدر ہوتی ہے کہ ملک کے لٹریچر میں دائمی جگہ حاصل ہو جاتی ہے۔ پس اگر عام شعری محاسن کے علاوہ کسی شاعر کے کلام کی نمایاں خصوصیات اور دلچسپی کی وسعت کو پیش نظر رکھ کر قبول دوام کا اندازہ کیا جائے تو اغلب یہی ہے کہ وہ اندازہ بہت بڑی حد تک درست ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اگر اس کسوٹی سے کام لیا جائے تو ان مبصرین کی رائے کو درست تسلیم کر لینے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا جن کے نزدیک اُردو ادب میں حفیظ کی شاعری کا مقام جاودانی ہے۔

حضرت حفیظ کے کلام اور طرز سخن کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ کرنے سے پہلے چند امور کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے عام طور پر کسی شاعر کے نتائج طبع کو اس نظر سے دیکھا جاتا ہے جیسے وہ متقدمین کی تصانیف اور موجودہ ماحول سے الگ تھلگ یکایک ایک خلا میں پیدا ہو گئے ہوں۔ ان پر غور کرتے وقت اس امر کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ جس وقت اس خاص مصنف نے قلم سنبھالا اس وقت ملک کا لٹریچر کس مرحلہ تک پہنچ چکا تھا اور مصنف کے معاصرین کا عام رجحان کیا تھا لیکن یہ طریقہ درست نہیں کیونکہ اس طرح مصنف کے کارناموں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے مصنفوں پر ہر کہ آمد عمارت نو ساخت کا مقولہ کتنا ہی صادق آتا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیائے ادب کی ہر ایک بستی میں ان عمارتوں کی بنیادیں قدما کے کارناموں کی صورت میں پہلے ہی موجود ہوتی ہیں اور ہر نئے مصنف کو اپنی عمارت ان بنیادوں پر کھڑی کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے کسی نئے معمار کی چابکدستی کا اندازہ صرف عمارت کی ساخت یا شکل وصورت سے نہیں ہو سکتا بلکہ ساتھ ہی یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس نے یہ عمارت کن بنیادوں پر کھڑی کی اور ان بنیادوں پر اس قسم کی عمارت اٹھانے میں کس قدر ہنر مندی کی ضرورت تھی۔

اسی طرح ہر مصنف اپنے ماحول سے بھی لازمی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ کسی قوم کی تاریخ کو اگر اس کے سوانح قرار دیا جائے تو لٹریچر کو اس کے خودنوشت سوانح حیات کہنا بالکل بجا ہوگا۔ اس لیے کسی زمانہ کے مصنفوں کی تصانیف ایک طرف تو قوم کے خودنوشت سوانح حیات کا ایک باب ہوتی ہیں اور دوسری جانب یہ باب خود اس زمانہ کی روداد پر مشتمل ہوتا ہے۔ کسی دور کے ادبی کارناموں سے ہم اس زمانہ کے متعلق بہت سی باتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں چنانچہ مختلف محققین نے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں لٹریچر سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی مصنف ماحول کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسے قوم کی خودنوشت سوانح عمری کے اس باب کی تکمیل میں حصہ لینا پڑتا ہے جو خود اس کے زمانہ کی داستان کا حامل ہوتا ہے۔ پھر وہ ماحول سے بے نیاز کیونکر ہوسکتا ہے؟ پس کسی مصنف کی تصانیف کو خلا کی پیداوار سمجھنے کے بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے اپنے زمانہ کی داستان لکھنے میں کس قدر حصہ لیا۔ یہ حصہ کس خوبی سے لکھا گیا اور اس حصے کو نہ صرف اس باب میں جس کا تعلق اس زمانہ سے ہے بلکہ ساری داستان میں کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شاعر اپنی زبان اور ادب کی خدمت دو طریقوں سے کر سکتا ہے یا تو پرانی روش پر چل کر ملکی ادب کی تکمیل و تزئین میں حصہ لے اور یا پھر اپنے لیے نئی راہیں نکال کر ملک و قوم کے ادبی سرمایہ میں بیش بہا اور قابل قدر اضافے کا باعث بنے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر زمانے میں کسی قوم کا ادب بعض خاص رائج الوقت رجحانات کے ماتحت پرورش پاتا ہے لیکن جہاں ایک طباع شاعر پرانی روش کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کر لیتا ہے وہاں اسے اپنے عہد کی رسمی زنجیروں کو توڑ ڈالنے میں بھی تامل نہیں ہوتا اور وہ اپنے زور طبع سے معاصرین کا مذاق بدل کر لٹریچر میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ وہ سراسر زمانے کے مذاق کے تابع رہ کر عام رو میں بہ جانے پر قانع نہیں ہوسکتا بلکہ بازار کی مانگ کی نسبت زمانے کی ضرورت کا زیادہ خیال رکھتا ہے اور اسی ضرورت شناسی پر اس کے تفوق کا انحصار ہے۔

حفیظ کے طرز سخن کو کسی خاص ندرت یا ایک آدھ جدت کی بنا پر اچھوتا نہیں کہا جاتا بلکہ اُردو شاعری کی عام روش و افتاد کو مدنظر رکھیں تو حفیظ کی شاعری ہر لحاظ سے نرالی ہے۔ موضوع

کلام مضمون و خیالات بحور و قوانی کے استعمال اور موضوع کلام سے ان کی مناسبت انداز منظر کشی اور مناظر کا تجربہ تشبیہات و تلمیحات غرض کسی پہلو سے دیکھیے حفیظ کا کلام انقلاب انگیز جدتوں کا حامل نظر آئے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس چیز کو ہم اب تک ہماری شاعری کہتے رہے ہیں وہ اکثر و بیشتر اس کے سوا کسی اعتبار سے ہماری نہیں کہ اس کے مصنف ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ اس شاعری میں خیالات و جذبات، محاورات وطرزِ تکلم ''پشت منظر'' (بیک گراؤنڈ) اور اصل تصویر سب کچھ ایران کا ہے۔ اور ہندوستان کا کچھ بھی نہیں حتیٰ کہ اس شاعری کی بنا پر تہذیب وتمدن اور طرزِ معاشرت کا مقابلہ کر کے اگر کوئی مستشرق ہندوستان کو مملکت ایران کا ایک صوبہ یا ضلع کہہ دے تو میرے خیال میں ہمیں اس کو مطعون کرنے کا کوئی حق نہ ہو گا۔

نغمہ زار کے دیباچہ میں پطرس لکھتے ہیں'' ہمارے شاعر برسوں سے ترک شیرازی پر مست ہیں''۔ یہ فقرہ بڑا بلیغ اور پر معنی ہے۔ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو اس قسم کے مصنوعی اور صرف شاعر کی اپنی ذات کو فریب میں مبتلا رکھنے والی شاعری کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے اور جس کی بنا پر ہماری اُردو شاعری نے عام طور پر ایک غیر فطری شکل اختیار کر لی ہے لیکن اگر اس فقرے کے صرف الفاظ ہی کو لیا جائے تو یہ صورتِ حالات بھی کچھ کم باعث ندامت نہیں۔ مانا کہ ہندوستان میں رستم و اسفندیار ایسا کوئی شہزور پیدا نہیں ہوا اور ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی ہندوستانی کو گرز اور کمان سے کام لینے کی طاقت اور اہلیت عطا نہیں ہوئی۔ مانا کہ تیغ ہندی کی تعریف بھی ایرانی شاعروں نے محض مروّت کی راہ سے یا شاید بر سبیل استہزا کر دی تھی اور اس لیے ہمیں اپنی رزمیہ شاعری میں اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بھی تسلیم کہ یہاں تہذیب وتمدن کی روایات سرے سے موجود نہیں لیکن کیا اس وسیع براعظم میں جہاں دنیا کی انسانی آبادی کا پانچواں حصہ بستا ہے کسی کمبخت کو عاشق ہو جانے کی بھی توفیق نہیں ہوئی؟ اور اگر ہوئی تو اس کا محبوب ایسا ہی گیا گزرا تھا کہ ہمارے شاعروں کو اس کا ذکر تک گوارا نہیں؟

یہ تو خیر اپنی اپنی پسند کی بات سہی، لیکن ہمارے اکثر شعرا کو ہندوستان کی قدیم یا موجودہ

زندگی میں بھی کوئی ایسی خصوصیت نظر نہیں آتی جو کلیتہً ہندوستانی ہو اور تو اور یہاں کے موسم اور قدرتی مناظر بھی کسی اعتبار سے قابل امتیاز نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً بسنت ہندوستان میں بہار کا پیش خیمہ ہے اور ہمارے موسم بہار کی چند خصوصیات بھی ہیں۔ لیکن ہمارے شاعروں کے موسم بہار میں وہی ''بہمن و دے کا چمنستان سے عمل'' اٹھتا ہے اور ''تیغ اردی ملک خزاں کو مستاصل'' کرتی ہے۔ قدرت کی قلمکاریوں کا مقابلہ صرف مانی اور بہزاد کے کارناموں سے ہوسکتا ہے۔ سرسوں نہیں پھولتی بلکہ زمین پر عکس گلبن پڑتا ہے۔ نرگس شہلا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا پھر ان ایرانی باغوں اور مرغزاروں میں بلبل کے سوا کس کا زمزمہ فردوس گوش بن سکتا ہے؟

علیٰ ہذا اس موسم کا استقبال بسنت یا ہولی مناکر نہیں بلکہ ایسے انداز میں کیا جاتا ہے جس سے کنار رکنا باد کی بزم مے نوشی اور گلگشت مصلیٰ کا حظ حاصل ہو۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ سب کچھ تو ایران میں ہوتا ہے اور بہار ہندوستان میں آ جاتی ہے!! اب اس بہار کے ذکر سے کسی ہندوستانی کے دل میں کن واقعات اور کن مناظر کی یاد تازہ ہوسکتی ہے؟ اور جب ان بے چاروں کو اس شاعری میں کوئی چیز مانوس ہی معلوم نہ ہو تو وہ اس سے کیا لطف حاصل کر سکتے ہیں؟

بخلاف اس کے حفیظ کے ہاں بسنت میں سرسوں پھولتی ہے۔ باغوں اور کھیتوں میں ہندوستانی بہار آتی ہے۔ لڑکے ڈور اور پتنگ کی خاطر باہم دست و گریباں ہوتے ہیں۔ کوئی مار کھاتا ہے اور کوئی ہنستا کھلکھلاتا ہے۔ خون میں جوش آتا ہے عشق و جنوں کی مستی پیدا ہوتی ہے اور دوسری جانب گھر میں ایک عصمت مآب شوہر پرست ہندوستانی عورت نے پھولوں کے زرد گہنے تو پہن لیے ہیں لیکن شوہر پردیس میں ہے۔ اس لیے ؎

ہے مگر اداس
نہیں پی کے پاس
غم و رنج و یاس
دل کو پڑے ہیں سہنے

اسی طرح برسات آتی ہے تو جہاں باغوں میں بلبلوں کے بجائے کوئل کی کوکو اور پپیہے کی

'پی کہاں' سنائی دیتی ہے۔ وہاں آموں کے نیچے جھولے ڈال کر پینگیں بڑھانے والی ماہ پیکروں کے پیارے پیارے گیتوں کی میٹھی، رسیلی تانیں بھی فردوسِ گوش بنتی ہیں۔ ساتھ ہی حفیظ ننھی بچیوں کی ہنڈکلھیا اور گڈے گڑیا کی شادی کو بھی نہیں بھولتا ذرا یہ جھولے کا منظر دیکھیے کس قدر مانوس معلوم ہوتا ہے اور شاعر کی نظر اس پر کس انداز میں پڑتی ہے لیکن ہندوستانی عورت کی نمایاں ترین خصوصیات اس مستی اور الھڑ پنے کی بڑبونگ میں بھی حفیظ کے پیش نظر رہتی ہیں چنانچہ جھولا جھولنے والیاں ہنستے کھیلتے، مسکراتے منہ چڑاتے اور ہلڑ مچاتے مچاتے یکا یک جھینپ بھی جاتی ہیں اور اس کے بعد ؎

اٹھلا رہی ہیں		اترا رہی ہیں
خوبانِ ہندی	حورانِ ارضی	رونق گھروں کی
نازک دوپٹے		رنگین ہلکے
سر پر سنبھالے		شانوں پہ ڈالے
مینہ لاکھ برسے		جی لاکھ ترسے

نکلیں نہ گھر سے
شوہر کے ڈر سے

پھر یہی نہیں بلکہ ؎

اپنی نظر سے — شرما رہی ہیں

نغمہ زار کی ان نظموں اور جلوہ سحر، تاروں بھری رات وغیرہ کو چھوڑ کر سوز و ساز کی نظموں کو دیکھیے تو ان میں بھی یہ مقامی رنگ اسی طرح نمایاں نظر آئے گا۔ پریت کا گیت، چاندنی میں کشتی، شام رنگیں، جاگ سوزِ عشق اور چناب وغیرہ کو پڑھ کر قدیم اور موجودہ اُردو شاعری سے مقابلہ کیجیے۔ زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس مقامی رنگ کے باوجود نظموں کی دلچسپی محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ غیر ہندی شائقینِ ادب کو بھی اس سے وہی حظ حاصل ہو گا جو خالص ہندوستانی شاعری سے ہونا چاہیے اور یہ حفیظ کی قادر الکلامی اور وجدانِ صحیح کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

تشبیہات و تلمیحات اور بحور و قوافی کے معاملہ میں بھی اُردو شاعری اصولی نقائص سے خالی نہیں ہے۔ دوسری زبانوں میں تشبیہ و استعارہ اور تلمیحات کے مانوس ہونے کے باعث عوام الناس بھی شعر سے پورا پورا حظ حاصل کر سکتے ہیں اور شاعرانہ اشاروں کنایوں کو فوراً سمجھ لیتے ہیں لیکن ہمارے ہاں شاعری کی فضا اس قدر نامانوس ہوتی ہے کہ عوام تو در کنار خواص بھی شعر سے وہ لطف حاصل نہیں کر سکتے جو مانوس فضا میں ایک خاص تڑپ کا حامل ہوتا ہے۔ بحور و قوافی کا سلسلہ بہت بڑی حد تک اجنبی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی موسیقی اور اُردو شاعری کے تال سم میں بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ ملکی دھنوں سے مسلسل غفلت بلکہ دانستہ بے اعتنائی روا رکھی ہے حتیٰ کہ ہندوستانی گیت اُردو شاعری کے نام نہاد عروضیوں کو اس لیے غیر موزوں معلوم ہونے لگتے ہیں کہ ان میں ملکی زحافات سے کام لیا جاتا ہے۔ کیا یہ افسوسناک بات نہیں کہ جو سُر اور تال ہندوستان کے رُوح میں بسے ہوئے ہیں ان کو تو اجنبی اور غیر مانوس گردانا جائے اور غیر مانوس زیر و بم ہمارے اشعار کی موزونیت یا عدم موزونیت کا معیار بنا لیے جائیں؟ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعرا کو موزونیت کے قدرتی معیار سے کام لینے کے بجائے جس میں لازمی طور پر نسبتاً بہت جلد مہارت حاصل ہو سکتی ہے ایک اجنبی یا تقریباً اجنبی میزان کا استعمال سیکھنا پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُردو شعرا میں سے پانچ فیصدی بھی عروضی نکات سے کماحقہ واقفیت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

لیکن سوال صرف عروضی مہارت کا نہیں، اصل بحث یہ ہے کہ آیا یہ عربی اور ایرانی اوزان سب کے سب ہندوستانی کانوں کو مانوس اور پسندیدہ معلوم ہوتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض اوزان ہمارے ہاں پہلے ہی موجود ہیں یا کم از کم ہندوستان میں بھی خوشگوار معلوم ہو سکتے ہیں۔ ان سے ضرور کام لیا جائے لیکن جو اوزان قطعاً اجنبی اور نامانوس ہونے کے باعث ناگوار معلوم ہوتے ہیں ان بھاری پتھروں کو چوم کر چھوڑ دیا جائے تو کیا حرج ہے؟ مثال کے طور پر بحر منسرح کو لیجیے۔ یہ عربی بحر ایرانی فضا میں بھلی معلوم ہوتی ہے اگر کوئی ایرانی شاعر اس بحر میں لکھا ہوا فارسی کلام اپنے مخصوص لہجے میں پڑھ کر سنائے تو واقعی حظ حاصل ہوتا ہوگا لیکن اُردو شاعری کے لیے یہ بحر نہ صرف اجنبی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس میں لکھے ہوئے اُردو

اشعار کے متعلق غیر موزونیت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اس بحر کو زورِ طبع کی نمائش کے لیے ضروری سمجھتے ہوں۔ مگر اس نمائش کا نتیجہ "مغز ماخورد و حلق خود بدرید" کے سوا کچھ نہیں پس اگر ایرانی شعرا اس بحر پر جان چھڑکتے ہیں تو چشم ما روشن دل ما شاد لیکن ہمیں خواہ مخواہ پتھر ڈھونے کی کیا ضرورت ہے؟

میں یہ نہیں کہتا کہ حفیظ نے قدیم رنگ اور قدیم طرزِ سخن سے کوئی سروکار نہیں دکھایا۔ اجنبی عروض سے کامل بے اعتنائی کا برتاؤ کیا ہے۔ حفیظ کے ہاں بھی اُردو شاعری کی قدیم خصوصیات موجود ہیں اور ایسا ہونا ضروری تھا کیونکہ حفیظ کو اپنی عمارت انھی بنیادوں پر کھڑی کرنی تھی اور وہ ماحول کے اثر سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتا تھا لیکن بامذاق حضرات پر کلام حفیظ کے مطالعہ سے فوراً واضح ہو جائے گا کہ قدیم رنگ میں بھی شاعر نے خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل کرتے ہوئے تقریباً تمام فضولیات کو ترک کر دیا ہے اور عام طور پر صرف انھی خصوصیات کو لیا ہے جو ہر لحاظ سے پسندیدہ یا کم از کم قابل برداشت تھیں۔ اس کے ساتھ ہی جدت کا پہلو اس قدیم رنگ میں بھی نمایاں ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شاعر اپنی زبان اور ادب کی خدمت دو طریقوں سے کر سکتا ہے۔ قدیم اور رائج الوقت طرز کی تکمیل میں حصہ لے کر یا نئی راہیں نکال کر لیکن حضرت حفیظ کے متعلق بے تامل یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہر دو طریق اختیار کیے اور دونوں پہلوؤں میں نہایت ہی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ قدیم اُردو شاعری اور قدیم طرزِ سخن کی تکمیل و تزئین اور اصلاح و تہذیب کے سلسلے میں حفیظ کے کارنامے اس قدر اہم اور قابل قدر ہیں کہ اُردو شاعری ہمیشہ ان کی ممنونِ احسان رہے گی لیکن حفیظ کا پروگرام یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ تزئین و تہذیب ابتدا تھی اس انقلاب کی جو حفیظ نے اُردو شاعری میں پیدا کیا ہے اور جس کے بغیر ہمارا ادب بڑی حد تک پسماندہ تھا۔

مثلاً اُردو ادب کا دامن مناظرِ فطرت کی تصویروں سے خالی ہے اور گیت کا تو ذکر ہی جانے دیجیے یہ وہ صنف ہے جس کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی حالانکہ شعر اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہندوستان یہ سوال کر سکتا ہے کہ موسیقی جو ہندوستانی طبائع پر زبردست اثر رکھتی ہے کیا

اس کا اُردو پر اتنا حق بھی نہ تھا کہ ہمارے شعراء اپنے سوز و گداز کا اظہار کرتے وقت اس سے کام لیتے؟

دنیا بھر کی زبانوں میں گیت کو ذوق و سرمستی اور سوز و گداز کا بہترین مظہر مانا گیا ہے۔ اُردو شاعری میں حفیظ اس مخصوص صنف کا موجد ہے اور کامیاب موجد۔ اس کے گیتوں نے اُردو شاعری میں ایک نئی لذت ایک نیا رس پیدا کر دیا ہے۔ اس کے قلم نے گیت کو وہ مقام بخشا ہے کہ اُردو زبان ہمیشہ حفیظ کی احسان مند رہے گی۔

تقریباً یہی کیفیت حفیظ کے انداز منظر کشی کی ہے۔ وہ بحر اور وزن یا تشبیہ و استعارہ ہی سے نہیں اپنی نظم کے ایک ایک لفظ سے منظر کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ وہ اپنے پیش نظر منظر کے لیے ہر لحاظ سے مناسب بحور اور مناسب الفاظ استعمال کرتا ہے اور اسی طرح وہی کیفیت دوسرے پر وارد کر دیتا ہے جو خود اس کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

حفیظ کا فن یہ ہے کہ لفظ دوسرے لفظ پر مصرع دوسرے مصرعے پر اور شعر دوسرے شعر پر اس طرح اضافہ کرتا ہے جس سے دیدہ و دل کے سامنے پوری تصویر بے نقاب ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لطافت اور سادگی اور دلآویزی کے ساتھ کہ اس میں شاعر کی اپنی ذات اور گرد و پیش کی خصوصیتیں زائل نہیں ہونے پاتیں۔

منظر کشی کا یہ اسلوب قادر الکلامی اور قوتِ اختراع کا زبردست ثبوت ہے۔ اس کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حفیظ کے اس رنگ سخن نے ''فطری شاعری'' کی دنیا میں ایک بالکل نئے اور انقلاب انگیز باب کا اضافہ کیا ہے۔

بحور و قوافی کے متعلق حفیظ کا اجتہاد اس قدر اہم ہے کہ ان کی شاعری کی نمایاں ترین خصوصیت بن گیا ہے۔ ''ڈگر پرست'' فاعلاتیوں کے جذبات کا احترام اس پہلو میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے لیکن صرف اس قدر کہ دوسری جانب ہندوستانی کانوں کو سمع خراشی کی شکایت کا موقع پیدا نہ ہونے پائے، پھر انہوں نے بعض بحور و اوزان کو چھوڑ دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی جگہ نئے اوزان پیش کر کے اُردو شاعری کے سرمایہ میں اضافہ اور میدان میں وسعت پیدا کی ہے۔ چند بحور و اوزان ترک کر دینا کسی بامذاق شاعر کے لیے کچھ ایسی بڑی بات نہیں۔

اصل کام نئے اوزان کی تلاش کا تھا جس میں انتخاب اور انتخاب در انتخاب کی ایسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے کہ ان پر قابو حاصل کر لینا حفیظ ہی کا کام تھا۔ ظاہر ہے کہ غیر مانوس اور سمع خراش اوزان کے بجائے محض چند ہندوستانی اوزان پیش کر دینا کافی نہ تھا بلکہ ایسے نعم البدل منتخب کرنے کی ضرورت تھی جنہیں اُردو شاعری آسانی سے قبول کر لے اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ ان کی چولیں اُردو شاعری کے موجودہ ڈھانچے میں بالکل ٹھیک بیٹھ جائیں۔ پھر ان نئے اوزان کو کامیابی سے رواج دینے کے لیے ضروری تھا کہ کسی موضوع پر نظم لکھتے وقت ان منتخب اوزان میں سے بھی ایسا وزن منتخب کیا جائے جو نفس مضمون کے ساتھ پوری پوری مناسبت رکھتا ہو۔ آپ نے اپنی عمر کے کسی حصہ میں اس قسم کی داستانیں سنی ہوں گی کہ ایک مرتبہ جب کہ آسمان پر بادلوں کا نام و نشان تک نہ تھا اور آفتابِ عالمتاب پوری شان سے جلوہ افروز تھا' بیجو باورا نے ملھار گایا اور آناً فاناً گھنگھور گھٹائیں اُٹھ کر موسلا دھار مینہ برسانے لگیں۔ یا تان سین نے آدھی رات کو دیپک راگ چھیڑ دیا اور شہر بھر کے بجھے ہوئے چراغ خود بخود روشن ہو گئے۔ آپ اُن داستانوں اور موسیقار کے متعلق مشہور و معروف روایات کو من گھڑت اور ایامِ جہالت کی فرضی یادگاریں چاہیں کہہ لیں لیکن موضوعِ کلام اور بحور و اوزان کی باہمی مناسبت کی ضرورت اور اہمیت کی طرف جو اشارہ ان میں موجود ہے اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ دور کیوں جاؤ۔ خود مروجہ بحور و اوزان میں سے بعض خاص اوزان کو اُردو شاعری میں بھی بعض خاص موضوعات کے لیے مخصوص یا قابلِ ترجیح سمجھا جاتا ہے۔

حفیظ نے اس انتخاب میں جس بالغ نظری اور ذوقِ صحیح کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اُردو شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ ''بسنت'' اور ابھی تو میں جوان ہوں کے ''چلنت'' اوزان میں کس قدر مستی ہے، کتنا جوش ہے! ''جلوہ سحر کے نفس مضمون سے قطع نظر صرف زیر و بم ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات خوابِ راحت سے بیدار ہو گئی ہے اور ایک آخری انگڑائی کے ساتھ تمام سستی اور غنودگی کو پرے جھٹک کر روزانہ معمولات کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ دوسری جانب ''تاروں بھری رات'' سنتے وقت نہ صرف دنیائے ہست و بود کے محوِ خواب ہونے یقین ہو جاتا ہے بلکہ خود سامعین پر بھی غنودگی طاری ہونے لگتی ہے۔ ''برسات'' کی نظم جتنی دیر آپ سنتے

رہیں گے یہی محسوس ہوگا کہ آپ برسات کے موسم میں کسی باغ کی سیر کر رہے ہیں۔ جھولا جھولنے والیاں ملہار گا رہی ہیں اور ان کے ارمانوں بھرے گیت سن کر دل میں ہوک سی اٹھ رہی ہے۔

اسی طرح سوز وساز کی نظموں میں ''فرشتہ کا گیت'' دیکھیے اس کا وزن آسمانی نغموں کے لیے کس قدر موزوں ہے! کانوں کے ساتھ دل بھی یہی محسوس کرتا ہے کہ ایک رحمت کا فرشتہ ہاتھ میں چھوٹی سی ستار لیے بے فکری کے عالم میں تانیں اڑاتا پھر رہا ہے۔

دیکھ اس دنیا کا نظارہ
میرے ساز کے تاروں میں

''پریت کے گیت'' میں ''پریم رس'' کی مسلسل ''قطرہ زنی'' دل کو بغض وعناد کے میل سے پاک کرتی محسوس ہوتی ہے لیکن اس تقاطر کے آگے آگے نظم کا وزن دل میں پریم رس کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا جاتا ہے۔ جاگ سوزِ عشق کو پڑھیے شاعر کے ساتھ نظم کا وزن بھی فریاد کر رہا ہے۔ ''شہسوار کربلا'' ایسی نظمیں عام طور پر صرف اظہار عقیدت کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ لیکن حفیظ نے دوسرے ضروری محاسن کو نظر انداز نہیں کیا اور اس نظم کے وزن پر غور کرو محض اصوات سے میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچ جاتا ہے۔ میں بخوف طوالت دوسری نظموں کے ذکر اور تفصیلی بحث سے احتراز کرتا ہوں۔ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ خود پڑھ کر مختلف نظموں کے بحور و اوزان کی مناسبت کا اندازہ کر لیجیے۔ البتہ یہ عرض کر دینا ضرور ہے کہ یہ سب کچھ خود بخود بلا ارادہ نہیں ہو گیا۔ بلکہ شاعر کے حسن انتخاب کا نتیجہ ہے۔ حفیظ کو اس ''حسن'' کی ضرورت واہمیت اور حسن انتخاب میں اپنی کاوش وکامیابی کا پورا پورا احساس ہے اور وہ بالکل بجا دعویٰ کرتا ہے۔

کیا پابند نے نالے کو میں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

حفیظ کے اس دعویٰ کی صحت اور اس طرزِ خاص کے نو ایجاد ہونے کا سب سے نمایاں ثبوت اس رویہ میں موجود ہے جو ان کے مخالفین نے اپنے قصر شہرت کی بنیادوں کو متزلزل دیکھ

کر اختیار کیا تھا۔ نیا سیلاب اس قدر اچانک آیا کہ یہ لوگ بھونچکے رہ گئے اور اس بوکھلاہٹ میں نئی شاعری کی تمام خصوصیات سے آنکھیں بند کر کے یہ ''پراپاگنڈا'' کرنے لگے کہ حفیظ کی کامیابی اور روز افزوں مقبولیت محض اس کی مترنم آواز کا نتیجہ ہے۔ اس ''پراپیگنڈے'' میں اس قدر شدت سے کام لیا گیا کہ خود پراپیگنڈا کرنے والوں کو بھی اپنے دعووں کی صداقت کا یقین سا ہو گیا چنانچہ اس غلط فہمی کے ماتحت لاہور میں مدتوں گلے بازی ہوتی رہی جس کسی کی آواز میں ذرا سا لوچ تھا وہی شاعر بن بیٹھا اور الٹی سیدھی تک بندیوں کو گا بجا کر اُردو ادب میں ''بے بہا اور قابل فخر اضافہ'' کرنے لگا۔ شعر اور نغمہ میں جو گہرا تعلق ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن نغمہ بذاتِ خود شعر نہیں کہلا سکتا۔ حضرت امیر خسرو نظم کو عروسِ خوب اور نغمہ کو اس کا زیور قرار دے کر فرماتے ہیں۔

عیب نبود گر عروسِ خوب بے زیور بود

پس اگر عروسِ خوب ''با زیور'' ہو تو سبحان اللہ اور اگر بے زیور ہو تو بھی کوئی حرج نہیں لیکن عروس کا ''خوب'' ہونا ضروری ہے۔ بلکہ میرے خیال میں تو عروسِ خوب کو بھی کوئی زیور اسی صورت میں زیب دے سکتا ہے جب کہ وہ اس کے تمام دوسرے محاسن سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہو۔ ورنہ زیور کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ایک پری چہرہ خاتون کو انگریزی لباس پہنا کر گلے میں سیر سوا سیر کی ہندوستانی ہیکل باندھ دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے حفیظ کی شاعری کے متعلق موضوع کلام نفس مضمون طرز سخن اور وزن کی باہمی مناسبت کو اس قدر اہمیت دی ہے کاش یہ لوگ بھی زیور کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے پہلے ان شعری محاسن کی فکر کرتے جو حفیظ کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس صورت میں ایک طرف تو اُردو ادب اور اُردو شاعری کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ ہوتا اور دوسری جانب ان کا سارا کھیل ''خوش گلو ایکٹروں اور فوق البھڑک''، ''سین سینری'' کے باوجود اس طرح ناکام نہ رہتا۔

مخالفوں کی آنکھوں پر تو خیر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض مبتدی مداح بھی اس رو میں بہ گئے۔ کہنے کو تو یہ حضرات حفیظ صاحب کا تتبع کر کے بزعم خود اُردو ادب اور اُردو شاعری کی خدمت میں مصروف تھے مگر یہ سمجھنے کی زحمت انہوں نے بھی گوارا نہ فرمائی کہ

صرف۔

ٹپ ٹپ ٹپا ٹپ

مینہ موسلا دھار

کہہ دینے سے بارش کا سماں نہیں بندھ سکتا بلکہ برسات کی فضا پیدا کرنے کے لیے ترنم کے علاوہ بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے اور جب تک وہ چیزیں موجود نہ ہوں ترنم محض ''تانا ریزی'' کا بے ہنگم سا ہنگامہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس قدر توجہ انھوں نے مترنم ہندوستانی بحروں والی نظموں پر مبذول کی اگر اس کا عشر عشیر بھی دوسری نظموں مثلاً ''فرصت کی تلاش'' ''آزاد وادی'' ''ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح'' ''درۂ خیبر'' ''چاندنی میں کشتی'' ''شامِ رنگیں'' وغیرہ پر صرف کرتے بلکہ خود مترنم بحروں والی نظموں ہی کو گویے کی بجائے شاعر کی آنکھوں سے دیکھتے تو ان پر حفیظ کی شاعری کے تمام محاسن اور حفیظ کی کامیابی کا حقیقی راز بہت جلد کھل جاتا۔

اس مقصد کے لیے حفیظ کی غزلوں کا مطالعہ خاص طور پر کارآمد ثابت ہو سکتا ہے لیکن تتبع کرنے والے اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے۔ ''ہفت پیکر'' حفیظ کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مقدمہ میں سید امتیاز علی صاحب تاج لکھتے ہیں:

''جو لوگ حضرت حفیظ کو بحیثیت شاعر جانتے ہیں اگر ان سے کہا بھی جائے کہ حفیظ کے افسانے ان کی شاعری سے کم قابل قدر نہیں تو فی الحال کوئی اس پر غور کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو گا۔ لوگ حفیظ کی شاعری سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ اب انھیں کسی دوسری حیثیت میں دیکھ کر داد دینے کی مطلق گنجائش نہیں رہی۔ ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا آیا ہے۔ دنیا صرف ایک ہی حیثیت سے کسی کو غیر معمولی داد دیا کرتی ہے۔ بیک وقت دو حیثیتوں سے اعتراف کمال کرنا ان کی بساط سے باہر ہے۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا حوصلہ اس سے بھی زیادہ تنگ ہے۔ وہ شاعری میں بھی مختلف اصناف سخن کے متعلق حفیظ کے کمال کا اعتراف کرنے سے قاصر رہی ہے۔ مثلاً غزل ہی کو لیجیے۔ یارانِ نکتہ داں کے نزدیک غزل گوئی میں حفیظ کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو لیکن لوگ ان کی نظموں (بلکہ صرف مترنم بحور والی نظموں) سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ ان کو اب تک

ان محاسن کا احساس ہی نہیں ہوا جن کی بنا پر ماہرین فن حفیظ کو غزل میں بھی "صاحب طرز" تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح اگر ان نظموں کو دیکھیں جو حفیظ نے بچوں کے لیے لکھی ہیں تو شاعری کی اس صنف میں بھی حفیظ مخترع نظر آئے گا۔ خصوصاً جو صغیر السن بچوں کے لیے ہیں ان میں تو شاعر نے کمال اختراع کا حیرت انگیز ثبوت دیا ہے لیکن دنیا کو یہاں بھی اعتراف کمال کی توفیق نہیں ہوئی۔

میں مثالیں دے دے کر حفیظ کی امتیازی خصوصیات اور عام محاسن شعری پر تفصیلی بحث سے احتراز کرتا ہوں۔ ان کے متعلق پروفیسر تاثیر اور دیگر حضرات تھوڑا بہت لکھ چکے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ مزید برآں یہ دیباچہ مجمل اشاروں ہی میں کافی طویل ہو گیا ہے لیکن جو لوگ حفیظ کے کلام کا بغرض استفادہ مطالعہ کرنا چاہیں ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ صرف کسی خاص صنف میں شاعر کے نمونۂ کمال اور اس نمونہ کی بھی محض ایک آدھ خوبی سے متاثر ہو کر بس اسی کے نہ ہو رہیں بلکہ جن اصناف سخن میں حفیظ نے طبع آزمائی کی ہے ان سب کے مختلف نمونوں کا بہ نظر امعان مطالعہ کریں۔ ہر نظم اور ہر غزل میں ان کو وہ تمام شعری لوازم نظر آئیں گے۔ جن کے متناسب مجموعہ کا نام شعریت ہے۔ ان لوازم کے ساتھ ان کو اس تناسب کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ جس کے باعث حفیظ اور شعریت گویا مترادف بن گئے ہیں۔ حفیظ کی کامیابی کا راز یہی شعریت ہے۔ جو ترنم کی خانہ زاد نہیں بلکہ خالق ہے۔

اختر

آج یہ "پروف" لاہور سے کراچی تصحیح کے لیے پہنچے۔ آج ہی شام دہلی سے خبر آ گئی کہ پنڈت ہری چند اختر کا انتقال ہو گیا۔ ہاں میں زندہ ہوں، پروف پڑھ رہا ہوں۔

حفیظ

۲ جنوری ۱۹۵۸ء

منظومات[1]

''کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا''

(۱) عنوان مرتب کا دیا ہوا ہے: اس سے پہلی اشاعتوں میں موجود نہیں البتہ غالبؔ کا مندرجہ بالا مصرع موجود ہے۔

مدینے کے مسافر

فسوں باطل ہوا شب کے طلسماتی نظاروں کا
سحر کے جاگتے ہی لد گیا ڈیرا ستاروں کا

بیاباں کے عظیم الشان منظر سے اُٹھے پردے
کہ جیسے دل میں کوئی اِک نظر سے معرفت بھر دے

ہوائے سرد کے آزاد جھونکے سرسراتے ہیں
چمک اُٹھنے کی امیدوں میں ذرے مسکراتے ہیں

یہ جنت کا سماں بس اِک دو ساعت رہنے والا ہے
کہ صحرا پھر وہی شدت کی حدت سہنے والا ہے

یہاں اب ایک ساعت بیٹھنا بھی جان کھونا ہے
طلوعِ مہر سے پہلے ہی پہلے کوچ ہونا ہے

ہوا کی گرمیاں جب ریت کے طوفاں اُٹھاتی ہیں
بیاباں گرد ٹیلوں کی نئی دنیا بساتی ہیں

چلے جب دشت میں بادِ سموم اِک قہر ہے گویا
یہ اُونٹوں اور انسانوں کے حق میں زہر ہے گویا

اٹھو آسودگانِ دشتِ غربت خوابِ غفلت سے
کرو تجدیدِ پیمانِ وفا عزم اور ہمت سے

مبادا دِن نکل آئے مبادا دُھوپ چڑھ جائے
یہاں بیٹھے رہیں ہم، قافلہ کچھ اور بڑھ جائے

انہی ذرّوں کی چھاتی سے کرن سورج کی پھوٹے گی
جو پیچھے رہ گئے ہیں اُن پہ بجلی بن کے ٹوٹے گی

دعا مانگو بیاباں میں کوئی تنہا نہ رہ جائے
مسافر کو خدا اس دھوپ کی سختی نہ دکھلائے

یہ وہ منزل ہے کوسوں تک یہاں پانی نہیں ملتا
بسا اوقات رستہ بھی بآسانی نہیں ملتا

ابھی دنیائے انساں ایک صحرا کے سوا کیا ہے
ابھی چاروں طرف دورِ ہلاکت کارفرما ہے

تمنائے حصولِ اقتدارِ شخصی و ذاتی
ابھی تک ہے بشر کو اِک نرالا ناچ نچواتی

بگولے نفسی نفسی کے مسلسل رقص فرماتے
ابھی اپنے شکم کی بھٹیاں پھرتے ہیں گرماتے

ابھی ہیں شعلہ ہائے آتشیں جذباتِ نفسانی
ابھی جنات ہی کے رُوپ میں ہے نوعِ انسانی

اٹھو کیا سوچ ہے کیوں عازمِ منزل نہیں ہوتے
مدینے کے مسافر اِس قدر کاہل نہیں ہوتے

مدینے تک پہنچ جاؤ تو پھر راحت ہی راحت ہے
یہ دُنیا ایک صحرا ہے مدینہ باغِ جنت ہے

راوی میں کشتی

بن گیا ہے آسماں نتھرے ہوئے پانی کی جھیل
یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل

کوئی لہر اُٹھتی نہیں اِس بحرِ حیرت جوش میں
بزمِ انجم غرق ہے موسیقیِ خاموش میں

کس قدر یہ نیلگوں وسعت سکوت انگیز ہے
جس کے اندر چاند کا چہرہ تجلی ریز ہے

رات کے افسون میں گم ہو گئی ہے کائنات
یہ گماں ہوتا ہے شاید سو گئی ہے کائنات

شہ درے کے "نوحہ خواں" مینار بھی خاموش ہیں
مقبرہ بھی، باغ بھی، اشجار بھی خاموش ہیں

اِک طرف سائے کو لپٹائے ہے پُل سویا ہوا
چاندنی پر ریت کا ہے جزو و کُل سویا ہوا

اس طرف اُجڑی ہوئی بارہ دری خاموش ہے
اِک گئے گزرے پرانے خواب میں مدہوش ہے

اوڑھ کر مغموم بیوہ کی طرح چادر سفید
کروٹیں لیتی ہے راوی ناشکیب و ناامید

سینہ جنباں ہے کہ دل میں ہلکا ہلکا درد ہے
یہ ہوا کیا ہے لبِ راوی پہ آہِ سرد ہے

نغمہ سویا بربطِ آبِ رواں کی گود میں
جس طرح اِک طفل سو جاتا ہے ماں کی گود میں

چاند بالائے فلک ہے، چاند زیرِ آب ہے
چاند ہی ساکن ہے لیکن چاند ہی بیتاب ہے

چاند کو گھیرے میں لے کر بہ رہی ہے چاندنی
کوئی خواب آور کہانی کہہ رہی ہے چاندنی

اور اس چاندی کے دھارے پر بہا جاتا ہوں میں
خواب کے عالم میں سب کچھ دیکھتا جاتا ہوں میں

یہ مری کشتی بھی گویا خواب کا آغوش ہے
میں کسی عالم میں بیٹھا ہوں بس اتنا ہوش ہے

دو طرف خاموش اور تاریک ساحل ہیں رواں
اِس روانی پر روانی کا نہیں ہوتا گماں

چپکے چپکے دوسری جانب چلے جاتے ہیں یہ
میری کشتی کے جلو میں کیوں نہیں آتے ہیں یہ

میں کہاں جاتا ہوں شاید یہ نہیں معلوم انھیں
آنکھ سے فطرت نے رکھا ہے مگر محروم انھیں

دُور اُفق پر اِک نیا منظر ہے میرے سامنے
زندگانی کا رُخِ انور ہے میرے سامنے

میں وہاں جاتا ہوں نیندیں ٹوٹ جاتی ہوں جہاں
حسرتیں اُمید کے جلوے دکھاتی ہوں جہاں

شامِ رنگیں

پچھم کے در پہ سورج بستر جما رہا ہے
رنگین بادلے میں چہرہ چھپا رہا ہے

کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو

عکسِ شفق نے کی ہے اِس طرح زرفشانی
گھل مل کے بہ رہے ہیں ندی میں آگ پانی

اوڑھے سیہ دوپٹے سرسبز وادیوں نے
زیور اُتار ڈالے گلزار زادیوں نے

چھایا ہے تھوڑا تھوڑا پیروں تلے اندھیرا
چڑیوں نے کھیت چھوڑا لینے چلیں بسیرا

کلیوں کے قہقہوں سے معمور ہیں ہوائیں
پریوں کی لوریاں ہیں یہ رس بھری صدائیں

لپٹی ہوئی ہیں نیندیں کیف آفریں ہوا میں
خاموشیوں کی لہریں اُٹھنے لگیں فضا میں

گم ہو چلی ہے دُنیا بکھرے ہوئے سکوں میں
دن غرق ہو رہا ہے چپ چاپ کے فسوں میں

کھیتوں میں کام کر کے لوٹے ہیں کام والے
چادر سروں پہ ڈالے، کندھوں پہ ہل سنبھالے

اب شام آگئی ہے جاگے ہیں بھاگ اِن کے
ہر سمت گونجتے ہیں رستوں پہ راگ اِن کے

لے لے کے ڈھور ڈنگر چرواہے آ رہے ہیں
سیٹی بجا رہے ہیں اور گیت گا رہے ہیں

کم سن سہیلیوں کا پنگھٹ پہ جمگھٹا ہے
جانے اکیلیوں کا دن کس طرح کٹا ہے

یہ بار بار باتیں ، یہ بار بار ہنسنا
یہ بے شمار باتیں ، یہ بے شمار ہنسنا

اِک گدگدا رہی ہے ، چھینٹے اڑا رہی ہے
اِک بھر چکی ہے پانی ، گاگر اُٹھا رہی ہے

شرما کے اِک نے اوڑھے منہ پر ہنسی کے مارے
رنگین اوڑھنی کے بھیگے ہوئے کنارے

شرم و حیا کی سرخی چہرے پہ چھا رہی ہے
شام اُس کو دیکھتی ہے اور مسکرا رہی ہے

چناب

وہ بلندی جس پہ ہیں نورانیوں کی بستیاں
برف کی آبادیاں برفانیوں کی بستیاں

نغمے سوتے ہیں جہاں خاموشیوں کے ساز میں
محو تھا میں بھی وہاں اِک روز خوابِ ناز میں

دفعتہً ٹوٹا مرے مجبور خوابوں کا طلسم
بن گئی ہستی مری یکسر ربابوں کا طلسم

گرمیِ رفتار نے چھیڑا مجھے مضراب سے
گونج اُٹھے کہسار میرے نغمۂ بیتاب سے

میں اتر آیا فرازِ کوہ سے گاتا ہوا
اپنی متوالی روش میں ٹھوکریں کھاتا ہوا

پاسبانوں نے بہت گھیرا بہت روکا مجھے
یعنی ہیبت ناک دیووں نے عبث ٹوکا مجھے

کچھ نہ بن آیا مری سعیِ عمل کے سامنے
میری رو میں بہ گئے آئے جو مجھ کو تھامنے

ابر نے آنسو بہا کر مجھ کو رخصت کر دیا
اور اپنے موتیوں سے میرا دامن بھر دیا

دولتِ کہسار لے کر دامنِ سیلاب میں
آخرِکار آ بسا میں خطۂ پنجاب میں

مدتیں گزری ہیں اس فردوس میں رہتا ہوں میں
یہ پری زادوں کی وادی ہے یہاں بہتا ہوں میں

اس زمیں پر چاہنے والے مرے آباد ہیں
شاد ہیں دونوں کنارے ہر طرح سے شاد ہیں

ان کے دل روشن ہیں سچی دوستی کی آگ سے
ان کے گیتوں کی صدا ملتی ہے میرے راگ سے

میرا افسانہ بندھا ہے اِن کے افسانوں کیساتھ
شمع وابستہ ہو جیسے اپنے پروانوں کے ساتھ

حسن وصورت، عشق والفت کانہیں کال اس جگہ
ہر طرف آباد ہیں سوہنی مہینوال اس جگہ

ٹوٹتے ہیں میری موجوں پر کئی کچے گھڑے
روز دکھلاتے ہیں اک الفت نئی کچے گھڑے

یہ ہوا لہروں سے جو محوِ شکست و بست ہے
ہر نئے رانجھے کی میٹھی بانسری سے مست ہے

ہر دو شیزہ دیکھتی ہے مجھ میں نقشہ ہیر کا
بن گیا ہوں آئنہ میں ہیر کی تصویر کا

گھیرتی ہیں مجھ کو اِن سادہ دِلوں کی ٹولیاں
بھولی بھولی صورتیں ہیں، میٹھی میٹھی بولیاں

اپنے بچے جانتا ہوں پالتا ہوں میں انھیں
جو طلب کرتے ہیں یہ دے ڈالتا ہوں میں انھیں

میرے بچوں کی طرح آتے ہیں میری گود میں
کھیلتے ہیں اور سو جاتے ہیں میری گود میں

اِن کو طوفانِ حوادث سے بچا لیتا ہوں میں
اپنے دامانِ محبت میں چھپا لیتا ہوں میں

ہاں میں پنجابی ہوں اُلفت ہے مجھے پنجاب سے
خوش ہوں میں پنجابیوں کی شورشِ بیتاب سے

ہمالیہ

یہ دنیا اللہ اللہ کس قدر آزاد دنیا ہے
یہی دنیا ہے جس کے فیض سے آباد دنیا ہے

یہ اُونچی چوٹیاں نورانیوں کی بارگاہیں ہیں
یہ سب تنبوٹیاں برفانیوں کی کارگاہیں ہیں

یہ منزل ہے ہوا کے برشگالی کاروانوں کی
یہیں پر ختم ہوتی ہے بلندی آسمانوں کی

کوئی خاکی قدم اِس خاک پر آیا نہیں اب تک
فرشتوں کی عبادت گاہ ہے یہ سرزمیں اب تک

یہاں آکر زمیں نے آسماں کی ہمسری کرلی
یہاں مٹی نے حاصل دو جہاں کی سروری کرلی

یہ اُونچے شامیانے دستِ قدرت نے لگائے ہیں
یہ لاتعداد خیمے سبز مخمل سے سجائے ہیں

یہ دیوداروں کا جنگل قدرتی پریوں کی بستی ہے
یہاں خاموشیاں اُگتی ہیں موسیقی برستی ہے

یہاں پگھلی ہوئی چاندی کے فوارے اُچھلتے ہیں
یہاں سوتے نکلتے ہیں یہاں چشمے ابلتے ہیں

یہاں آ کر ہوائیں دامنوں میں رنگ بھرتی ہیں
گھٹائیں بن کے اُٹھتی ہیں فلک سے جنگ کرتی ہیں

کوئی دیکھے یہاں آ کر تبسم لالہ زاروں کے
ترنم جوئباروں کے تکلم آبشاروں کے

یہ شادابی خزاں ناآشنا معلوم ہوتی ہے
شگفتہ ہر طرف شانِ خدا معلوم ہوتی ہے

یہاں چاروں طرف خاموشیوں کا حشر برپا ہے
جہاں تک دیکھیے بس ایک نورانی اندھیرا ہے

حفیظ اکثر یہاں میں اپنی ہستی بھول جاتا ہوں
خدا کی قدرتوں میں خود پرستی بھول جاتا ہوں

صبح و شامِ کوہسار

کس قدر ہنگامہ پرور ہے سکوتِ کوہسار
کار پردازانِ قدرت ہیں یہاں مصروفِ کار

رفعتوں پر رفعتیں ہیں پستیوں میں پستیاں
کس قدر آباد ہیں برفانیوں کی بستیاں

اِک بڑے قانون کی تعمیل ہوتی ہے یہاں
قسمتِ آب و ہوا تبدیل ہوتی ہے یہاں

گوشے گوشے میں ہیں قائم کارخانے ابر کے
بن رہے ہیں تن رہے ہیں شامیانے ابر کے

وقت بے چارہ یہاں پابند ہے مجبور ہے
اس مشقت گاہ کا ادنیٰ سا اِک مزدور ہے

آسماں گردش میں ہے دو کام کرنے کے لیے
صبح کرنے کے لیے یا شام کرنے کے لیے

صبح

صبح کا یہ فرض ہے معمول پر آیا کرے
جس قدر سونا فراہم کر سکے لایا کرے

کھول دیتی ہے زرِ خالص کی دُکانیں سحر
لا کے رکھ دیتی ہے سونے کی چٹانیں شرق پر

کیمیا سازانِ چرخ اُٹھتے ہیں اپنے کام کو
آگ کی بھٹی میں رکھتے ہیں طلائے خام کو

دفعتاً شعلے نظر آتے ہیں یا رنگیں دھواں
چوٹیاں مشرق کی ہو جاتی ہیں سب آتش فشاں

دیکھتے ہی دیکھتے ہوتا ہے سونے کا یہ حال
کوئی شے پگھلی ہوئی کچھ قرمزی کچھ لال لال

حکم یہ ہے اس میں جو ناقص ہے چھن جایا کرے
اور باقی اک طلسمی گیند بن جایا کرے

بعض چابکدست شاگردانِ استادِ ازل
کرتے ہیں اس گیند میں نیرنگ بھرنے کا عمل

جب پہاڑوں سے ابھرتا ہے یہ بقعہ نور کا
حسن خود کرتا ہے نظارہ قریب و دور کا

کارگہ کا جائزہ لیتے ہیں اُٹھ کر نور باف
ذرّے ذرّے پر چڑھا دیتے ہیں نورانی غلاف

یہ طلسمی گیند برساتی ہے نار آمیز نور
زندگی کی گرم بازاری کا ہوتا ہے ظہور

شام

رفتہ رفتہ سرخیوں پر چھا گیا کالا غبار
مٹ گیا رنگ شفق مرجھا گیا یہ لالہ زار

نور کے زرین ایوانوں میں تالے پڑ گئے
ارغوانی بدلیوں کے رنگ کالے پڑ گئے

شام آئی ہے سکوں کا جال پھیلائے ہوئے
ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے

بے زباں خاموشیاں جاگیں صدائیں سوگئیں
شورشیں چپ ہوگئیں خاموشیوں میں کھوگئیں

کوہ پر ظلمات کی پریوں نے پر پھیلا دیے
ہر طرف تاریک دامن کھول کر پھیلا دیے

اک پراسرار خاموشی فضا میں بس گئی
اِک سبک رفتار مدہوشی ہوا میں بس گئی

جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چپ ہوگئیں
بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سوگئیں

اس طرح اونچے پہاڑوں میں گھری ہیں وادیاں
جس طرح دیووں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں

شاعر

فتنۂ خفتہ جگائے اس گھڑی کس کی مجال
قید ہیں شہزادیاں کوئی نہیں پرسانِ حال

ان غریبوں کی مدد پر کوئی آمادہ نہیں
ایک شاعر ہے یہاں لیکن وہ شہزادہ نہیں

آہوؤں کی سرگیں پلکیں فضا پر حکمراں
چھائی ہیں ارض و سما پر آہنیں سی جالیاں

دُور سے کوہسار و وادی پر یہ ہوتا ہے گماں
اونٹ ہیں بیٹھے ہوئے اترا ہوا ہے کارواں

یا اثر ہیں آسمانِ پیر پر برسات کے
خیمۂ بوسیدہ میں پیوند ہیں بانات کے

اور اِس خیمے کے اندر زندگی سوئی ہوئی
تیرگی سوئی ہوئی تابندگی سوئی ہوئی

اے حفیظ ان نیند کے ماتوں کی منزل سے نکل
کام ہے درپیش ، دامِ دیدہ و دل سے نکل

دیدہ و دل کو بھی غفلت کے شبستاں سے نکال
یہ جو خاموشی کی زنجیریں ہیں ان کو توڑ ڈال

صبح کرنے کے لیے پھر ہاؤ ہو درکار ہے
شکر کر ، سوتی ہوئی دُنیا میں تو بیدار ہے

شہسوارِ کربلا

لباس ہے پھٹا ہوا   غبار میں اٹا ہوا
تمام جسمِ نازنیں   چھدا ہوا کٹا ہوا
یہ کون ذی وقار ہے، بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
یہ بالیقیں حسینؓ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ جس کی ایک ضرب سے   کمالِ فنِ حرب سے
کئی شقی گرے ہوئے   تڑپ رہے ہیں کرب سے
غضب ہے تیغِ دوسر کہ ایک ایک وار پر
اُٹھی صدائے الاماں، زبانِ شرق وغرب سے
یہ بالیقیں حسینؓ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ مرد حق پرست ہے مئے رضا سے مست ہے
کہ جس کے سامنے کوئی بلند ہے نہ پست ہے
اُدھر ہزار گھات ہے، مگر عجیب بات ہے
کہ ایک سے ہزار ہا کا حوصلہ شکست ہے
یہ بالیقیں حسینؓ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

عبا بھی تار تار ہے تو جسم بھی فگار ہے
زمیں بھی ہے تپی ہوئی فلک بھی شعلہ بار ہے
مگر یہ مردِ تیغ زن، یہ صف شکن فلک فگن
کمال صبر و تن دہی سے محوِ کار زار ہے
یہ بالیقیں حسینؓ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

دلاوری میں فرد ہے بڑا ہی شیر مرد ہے
کہ جس کے دبدبے سے دشمنوں کا رنگ زرد ہے
حبیبِ مصطفیٰؐ ہے یہ مجاہد خدا ہے یہ
جبھی تو اس کے سامنے یہ فوج گرد برد ہے
یہ بالیقیں حسینؓ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

اُدھر سپاہِ شام ہے ہزار انتظام ہے
اُدھر ہیں دُشمنانِ دیں اِدھر فقط امام ہے
مگر عجیب شان ہے، غضب کی آن بان ہے
کہ جس طرف اُٹھی ہے تیغ بس خدا کا نام ہے
یہ بالیقیں حسینؓ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

لاہور

(تصویر کا ایک رخ)

خطۂ لاہور یعنی جنتِ ہندوستاں
جس کی خوبی سے ہے خاکِ پاکِ پنجاب آسماں
ہے تو یہ جنت مگر انسان بستے ہیں یہاں
خلد سے نکلے ہوئے ارمان بستے ہیں یہاں
صورت و معنی بہم محوِ نیاز و ناز ہیں
حسن کے پہلو بہ پہلو عشق کے انداز ہیں
حسن پھرتا ہے یہاں اٹھکیلیاں کرتا ہوا
سادگی کو بے حجابی سے عیاں کرتا ہوا
عشق ہر سو اس تماشا گاہ میں آوارہ ہے
زخم خوردہ ہے بہت آزردہ ہے بیچارہ ہے
اِک طرف قاتل نگاہیں تیر برساتی ہوئی
اِک طرف مجبور آہیں دل کو دھڑکاتی ہوئی

یہ وہ میخانہ ہے جس میں ساقیانِ مے فروش
پھر رہے ہیں ہر طرف ساغر بکف، مینا بدوش
پینے والے پے بہ پے آتے ہوئے جاتے ہوئے
گنگناتے لڑکھڑاتے ٹھوکریں کھاتے ہوئے
ولولے اُٹھتے ہوئے بڑھتے ہوئے چڑھتے ہوئے
ردِ آفات و بلا کی سیفیاں پڑھتے ہوئے
جلوہ آرا ہیں یہاں کیفیتیں پنجاب کی
سینۂ فولاد میں خاصیتیں سیماب کی
آب و گِل میں زندگی ہنگامہ آرا ہے یہاں
موت بھی چاہے تو جینے کا سہارا ہے یہاں

توبہ نامہ

اُف وہ راوی کا کنارا، وہ گھٹا چھائی ہوئی
شام کے دامن میں سبزے پر بہار آئی ہوئی

وہ شفق کے بادلوں میں نیلگوں سرخی کا رنگ
اور راوی کی طلائی نقرئی لہروں میں جنگ

شہ درے میں آم کے پیڑوں پہ کوئل کی پکار
ڈالیوں پر سبز پتوں سرخ پھولوں کا نکھار

وہ گلابی عکس میں ڈوبی ہوئی چشمِ حباب
اور نشے میں مست وہ سرمست موجوں کے رباب

وہ ہوا کے سرد جھونکے شوخیاں کرتے ہوئے
بن پئے بامست کردینے کا دم بھرتے ہوئے

دُور سے ظالم پپیہے کی صدا آتی ہوئی
پے بہ پے کم بخت پی پی کہہ کے اُکساتی ہوئی

اور وہ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر بیٹھا ہوا
دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر بیٹھا ہوا

شیخ صاحب! سچ تو یہ ہے اُن دنوں پیتا تھا میں
اُن دنوں پیتا تھا یعنی جن دنوں جیتا تھا میں

اب وہ عالم ہی کہاں ہے مے پیے مدت ہوئی
اب میں توبہ کیا کروں، توبہ کیے مدت ہوئی

گیت (۱)

کیا پابندِ نے نالے کو میں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

وان-مرتب کا اضافہ

جاگ سوزِ عشق

جاگ سوزِ عشق جاگ!
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ کام دیوتا! فتنہ ہائے نو جگا
بجھ گیا ہے دل مرا پھر کوئی لگن لگا
سرد ہو گئی ہے آگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ!
پڑ گئی دِلوں میں پھوٹ کیا بجوگ پڑ گیا
پرتھوی پہ چار کونٹ ایک سوگ پڑ گیا
سرنگوں ہے شیش ناگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ!
تو نے آنکھ بند کی کائنات سو گئی
حسنِ خود پسند کی دن سے رات ہو گئی

زرد پڑ گیا سہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ!
اب نہ وہ سفر نہ سیر رہبری نہ رہزنی
کچھ نہیں ترے بغیر دوستی نہ دشمنی
اب لگاؤ ہے نہ لاگ!
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ!
اے مغنیِ شباب جاگ خوابِ ناز سے
دل شکستہ ہے رباب عرصۂ دراز سے
مر گئے قدیم راگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ!
تو جو چشم وا کرے ہر اُمنگ جاگ اُٹھے
آہ و نالہ جاگ اُٹھے راگ رنگ جاگ اُٹھے
جوگ سے ملے بہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ!

پھر اُسی اُٹھان سے تیر اُٹھے کماں اُٹھے
صبر کی زبان سے شورِ الاماں اُٹھے
جاگ اُٹھیں دلوں کے بھاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ اے نظر فروز! جاگ اے نظر نواز!
جاگ اے زمانہ سوز! جاگ اے زمانہ ساز!
جاگ نیند کو تیاگ!
جاگ سوزِ عشق جاگ!

کرشن بنسری

بنسری بجائے جا
کاہن مرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا
پریت میں بسی ہوئی اداؤں سے
گیت میں بسی ہوئی صداؤں سے
برج باسیوں کے جھونپڑے بسائے جا
سنائے جا سنائے جا
کاہن مرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا
کاہن مرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا

بنسری کی، لے نہیں ہے آگ ہے
اور کوئی شے نہیں ہے آگ ہے
پریم کی یہ آگ چار سو لگائے جا
جلائے جا جلائے جا
کاہن مرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا

دِل ہے پرائے بس میں

(۱)

پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں
پورب میں جاگا ہے سویرا دُور ہوا دنیا کا اندھیرا
لیکن گھر تاریک ہے میرا
پچھم میں جاگی ہیں گھٹائیں پھرتی ہیں سرمست ہوائیں
جاگ اُٹھو مے خانے والو پینے اور پلانے والو
زہر ملاؤ رس میں
دل ہے پرائے بس میں

(۲)

پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں
باغ میں بلبل بول رہی ہے نرگس آنکھیں کھول رہی ہے
شبنم موتی رول رہی ہے
آم پہ کوئل کوک اُٹھی ہے سینے میں اِک ہوک اُٹھی ہے
بن جاؤں نہ کہیں سودائی جانوروں کی رام دہائی

چبھتی ہے نس نس میں
دل ہے پرائے بس میں

(۳)

پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں
بیت گیا دن رات بھی آئی　　تاروں نے محفل بھی سجائی
اُس نے مگر صورت نہ دکھائی
وہم کئی ٹالے ہیں میں نے　　تارے گن ڈالے ہیں میں نے
وعدے کا تو کس کو یقیں ہے　　آنکھ میں لیکن نیند نہیں ہے
نیند نے کھا لیں قسمیں
دل ہے پرائے بس میں

(۴)

پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں
کیوں کرتے ہو دنیا داری　　جان گیا اُلفت مَیں تمھاری
تہ کر دو یہ نصیحت ساری
مجھ کو تم سے کام ہی کیا ہے　　میرا ننگ و نام ہی کیا ہے؟
اِس دنیا کی پریت یہی ہے　　رسم یہی ہے ریت یہی ہے
ٹوٹ گئیں سب رسمیں
دل ہے پرائے بس میں

(۵)

پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

کون بتائے اُلفت کیا ہے   دل کیا دل کی حقیقت کیا ہے

مر مٹنے میں لذت کیا ہے

بے درد اس کو کیا پہچانے   جس پر بیتی ہو وہ جانے

یہ سانسیں ہیں آنی جانی   ہائے محبت ، ہائے جوانی

آگ لگی ہے خس میں

دِل ہے پرائے بس میں

(٦)

پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

دوستو اِس کا نام نہ پوچھو   کچھ بھی نہیں ہے کام نہ پوچھو

مجھ سے کوئی پیغام نہ پوچھو

میرا بھی تم نام نہ لینا   مل جائے تو یوں کہہ دینا

اک دیوانہ چپ رہتا ہے   کہتا ہے تو یہ کہتا ہے

دل ہے پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

پرانی بسنت!

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ
رنگ دے قدیم رنگ بے دریغ ، بے درنگ
جس کی ضو سے مات ہو رنگ بازیِ فرنگ
عشق کے لباس کو
رنگ شوخ و شنگ دے
رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ
ایک ہی اُمنگ دے ایک ہی ترنگ دے
دین، دھرم مٹ نہ جائے پاسِ نام و ننگ دے
دامنِ دراز دے
یا قبائے تنگ دے
رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ
عمر گھٹ گئی تو کیا؟ ڈور کٹ گئی تو کیا
یہ ہوائے تند و تیز رُخ پلٹ گئی تو کیا
آ گئی بسنت رُت
اور اک پتنگ دے
رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ
صلح ہو کہ جنگ ہو ساتھیوں کا سنگ ہو
سب ہمیں پسند ہے خون ہو کہ رنگ ہو
خون ہو کہ رنگ ہو
ایک رنگ رنگ دے
رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ

پریت کا گیت

اپنے من میں پریت

بسا لے

اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسا لے او مورکھ او بھولے بھالے

دل کی دُنیا کر لے روشن اپنے گھر میں جوت جگا لے

پریت ہے تیری ریت پرانی بھول گیا او بھارت والے

بھول گیا او بھارت والے

پریت ہے تیری ریت

بسا لے

اپنے من میں پریت

(۲)

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اُترا ڈیرا　　چھایا چاروں کونٹ اندھیرا

شیخ برہمن دونوں رہزن　　ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا

ظاہر داروں کی سنگت میں　　کوئی نہیں ہے سنگی تیرا

کوئی نہیں ہے سنگی تیرا

من ہے تیرا میت

بسالے

اپنے من میں پریت

(۳)

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

بھارت ماتا ہے دُکھیاری　　دُکھیارے ہیں سب نرناری

تو ہی اُٹھا لے سندر مرلی　　تو ہی بن جا شام مراری

تو جاگے تو دُنیا جاگے　　جاگ اُٹھیں سب پریم پجاری

جاگ اُٹھیں سب پریم پجاری
گائیں تیرے گیت
بسالے
اپنے من میں پریت

(۴)

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت
نفرت اِک آزار ہے پیارے دُکھ کا دارو پیار ہے پیارے
آ جا اپنے رُوپ میں آ جا تو ہی پریم اوتار ہے پیارے
یہ ہارا تو سب کچھ ہارا من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے جیتے جیت
بسالے
اپنے من میں پریت

(۵)

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت
دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے سر جائے پر میت نہ جائے
میں ڈرتا ہوں کوئی تیری جیتی بازی جیت نہ جائے
جو کرنا ہو جلدی کر لے تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے
تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے
وقت نہ جائے بیت
بسالے
اپنے من میں پریت

سپنا

دیکھ اس دُنیا کا نظارا
میرے ساز کے تاروں میں رنگیں نغمہ زاروں میں
نیندوں کے دریاؤں میں ہے ایک حبابی دُنیا
اُس دُنیا کو دُنیا کہہ دیتی ہے خوابی دنیا
دیکھ اس دنیا کا نظارا
ہلکا ہلکا پیارا پیارا
میرے ساز کے تاروں میں رنگیں نغمہ زاروں میں
ہستی کیا ہے میٹھا سپنا
سپنا کیا ہے میٹھی پریت میٹھی پریت ہے، میرا گیت
میرے میٹھے گیتوں میں بستی ہے ساری ہستی
ساری ہستی گیت ہیں میرے نیند ہے میری بستی
ہستی کیا ہے میٹھا سپنا
دِل میں رہنا، آنکھ سے چھپنا
سپنا کیا ہے میٹھی پریت میٹھی پریت ہے میرا گیت

اُلفت کا اظہار

میرے دل کا باغ
پیاری ، میرے دل کا باغ
میں ہوں دل کے باغ کا مالی لایا ہوں پھولوں کی ڈالی
نازک نازک پھول ہیں جیسے اُجلے اور بے داغ
ایسا ہی بے داغ ہے پیاری میرے دل کا باغ
پیاری ، میرے دل کا باغ
میں ہوں دل کے باغ کا مالی لایا ہوں پھولوں کی ڈالی

اُلفت کا احساس

پیاری ، اُلفت کا احساس
الفت ہے پھولوں کا گہنا خوشبوؤں میں رہنا سہنا
مدھم مدھم ، بھینی بھینی ، ان پھولوں کی باس
میٹھا میٹھا درد ہو جیسے اُلفت کا احساس
پیاری ، اُلفت کا احساس

اُلفت ہے پھولوں کا گہنا　　　　خوشبوؤں میں رہنا سہنا

اُلفت کا اظہار

پیاری ، اُلفت کا اظہار

میری ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں　　　　تیری یہ حیران نگاہیں

ان پھولوں کی ہر ڈالی ہے اک گلشن' بے خار

اِن پھولوں کی رنگت جیسے اُلفت کا اظہار

پیاری ، اُلفت کا اظہار

میری ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں　　　　تیری یہ حیران نگاہیں

اندھی جوانی

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں کالی کالی
خوب برسنے والی
متوالی
پرشور
گھٹائیں
چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
گلشن کی گل پوش ادائیں آموں کی خاموش فضائیں
کوئل کی مدہوش صدائیں
بن میں بول رہے ہیں مور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

جوانی لے آئی برسات جوانی لے آئی برسات

جوانی ، ہائے جوانی

سرشوری ، نادانی

مستانی

بدذات

جوانی

لے آئی برسات

جوانی لے آئی برسات

بیٹھا ہوں راوی کے کنارے کرتا ہوں پریوں کے نظارے

آہ نگاہیں ، آہ اشارے

چھائی نظر پر کالی رات

جوانی لے آئی برسات جوانی لے آئی برسات

محبت آہوں کا طوفان   محبت آہوں کا طوفان

محبت ، پیاری پیاری

میٹھی سی بیماری

بیچاری

انجان

محبت

آہوں کا طوفان

محبت آہوں کا طوفان

اِک کشتی ملاح سے خالی   میں نے اُٹھا طوفان میں ڈالی

اس کشتی کا اللہ والی

لے چل لے چل اے طوفان

محبت آہوں کا طوفان   محبت آہوں کا طوفان

حسن اور موت

ذلتوں سے تنگ آ کر عشق آخر مر گیا
ہاو ہو کو لے گیا میدان خالی کر گیا
مر گیا —— عشق آخر مر گیا
اُٹھ گئی آہ و فغاں
رہ گئے کچھ استخواں

بے بسی
بے کسی

نوحہ خواں —— زندگی پر نوحہ خواں
مر گیا —— عشق آخر مر گیا
ذلتوں سے تنگ آ کر عشق آخر مر گیا

موت نے چاہا کہ تکمیل جہاں بانی کرے
آج شاہِ حُسن کو وقفِ پشیمانی کرے
دیکھ لے —— حسن آ کر دیکھ لے

زِندگانی کا مآل
اس جوانی کا مآل
عیش کو
طیش کو
پائمال —— لن ترانی کا مآل
حسن آ کر دیکھ لے
موت نے چاہا کہ تکمیل جہاں بانی کرے

آ رہا تھا حسن بھی اٹھکیلیاں کرتا ہوا
آپ ہی اپنی ہوا خواہی کا دم بھرتا ہوا
بے حجاب —— شوخیاں کرتا ہوا
بیش و کم سے بے خبر
زیر و بم سے بے خبر
شاد شاد
بامراد
بے خبر —— رنج و غم سے بے خبر
بے حجاب —— شوخیاں کرتا ہوا
آ رہا تھا حسن بھی اٹھکیلیاں کرتا ہوا

یہ تماشا دیکھ کر موجِ صبا چپ ہو گئی
شاخِ گل پر بلبلِ رنگیں نوا چپ ہو گئی
ہو گئی ـــــ ہر صدا چپ ہو گئی
اور فضا گھبرا گئی
خوف سے تھرا گئی

ہوش پر
جوش پر

چھا گئی ـــــ مردنی سی چھا گئی
ہو گئی ـــــ ہر صدا چپ ہو گئی
یہ تماشا دیکھ کر موجِ صبا چپ ہو گئی

آج حسن و موت میں اِک معرکہ ہونے کو تھا
کون رہ جائے گا باقی، فیصلہ ہونے کو تھا
فیصلہ! ـــــ جانے کیا ہونے کو تھا
دم بخود تھی کائنات
اُڑ گیا رنگ حیات

تھم گئے
جم گئے

بے ثبات ـــــ سب وجودِ بے ثبات
فیصلہ! ـــــ جانے کیا ہونے کو تھا
آج حسن و موت میں اِک معرکہ ہونے کو تھا

حسن آیا سرخوشِ کیفِ شرابِ زندگی
موت کی وادی پہ چمکا آفتابِ زندگی
زندگی ـــــ کامیابِ زندگی
ابتدا سے بے نیاز
ماسِوٰی سے بے نیاز
سربسر
بے خبر
بے نیاز ـــــ انتہا سے بے نیاز
زندگی ـــــ کامیابِ زندگی
حسن آیا سرخوشِ کیفِ شرابِ زندگی

استخوانوں پر پڑی جب چشمِ بے پروائے حسن
خندۂ دلچسپ تھا اندازِ استہزائے حسن
اور بھی ـــــ مٹ گئے اعدائے حسن
موت حیراں ہو گئی
خود پشیماں ہو گئی

زندگی

خوش ہوئی

ہوگئی ——— بلکہ خنداں ہو گئی

اور بھی ——— مٹ گئے اعدائے حسن

استخوانوں پر پڑی جب چشمِ بے پروائے حسن

عشق کے مرنے میں بھی اِک آن پیدا ہوگئی

یعنی مردہ ہڈیوں میں جان پیدا ہو گئی

ہو گئی ——— شان پیدا ہو گئی

شوخیِ انداز تھی

یا نگاہِ ناز تھی

اُف نگاہ

بے پناہ

راز تھی ——— واقعی اِک راز تھی

ہو گئی ——— شان پیدا ہو گئی

عشق کے مرنے میں بھی اک آن پیدا ہو گئی

کاہل کا گیت

(امریکن شاعرہ ایلا وھیلر ولکاکس کی ایک نظم سے)

اب شام ہو چلی ہے اب چھا چلا اندھیرا
دنیا پہ آسماں نے صبر و سکوں بکھیرا
اور دامنِ شفق پر
سرخی نے رنگ پھیرا
مستور ہیں ہوا میں اس پُرسکوں فضا میں
کچھ میٹھے نغمے
کچھ گیت کچھ ترانے
لیکن اُداس ہوں میں بالکل نراس ہوں میں
بے کار ہی گزارا یہ دن پھر آج میں نے
سوچا نہ کاہلی کا کوئی علاج میں نے
اُٹھ کر نہیں سنوارا
کچھ کام کاج میں نے

کھیتوں میں جانے والے ہمت دکھانے والے
لوٹے ہیں کام کرکے
دامن خوشی سے بھر کے
خوشیاں منا رہے ہیں اور گیت گا رہے ہیں

خوش ہو کے اس طرح سے گاتی نہیں کبھی میں
اس خوشنما خوشی کو پاتی نہیں کبھی میں
اِس کیف و سرخوشی میں
آتی نہیں کبھی میں
میری اُداس گھڑیاں رہتی ہیں سینہ کوباں
سن سن کے یہ منادی
اب ہو چکی ہوں عادی
چپ چاپ سن رہی ہوں اور سر کو دُھن رہی ہوں

مغرب کے سرخ بادل مرجھا چکے ہیں سارے
اور شام کی جبیں پر چھٹکے ہوئے ہیں تارے
لیکن میں سرنگوں ہوں
بیٹھی ہوں اِک کنارے

بے تاب ہو رہی ہوں　　چپ چاپ رو رہی ہوں
بے کار زندگی پر
بیمار زندگی پر
سر کو کھپا رہی ہوں　　آنسو بہا رہی ہوں
لیکن ہے مدتوں سے　　ایسا ہی حال میرا
سب بھول جاؤں گی میں　　آئے گا جب سویرا
پھر کاہلی کا آ کر
دل میں جمے گا ڈیرا
دن بیت جائے گا پھر　　یہ وقت آئے گا پھر
خوش ہوں گے کام والے
اور میں کروں گی نالے
تدبیر سے ڈروں گی　　تقدیر پر مروں گی

جب صبح کی ضیا میں　　ملتی نہیں مسرت
پھر شام کی ردا میں　　حاصل ہو کیا فراغت
مجھ کو تو ایک پل بھی
ہوتی نہیں یہ جرأت
دل کو ذرا سنبھالوں　　پھولوں پہ آنکھ ڈالوں

دل ہے مرا، فسردہ
شاید ہوں پھول بھی مردہ
شاید وہ میرے پیارے مرجھا چکے ہوں سارے

یہ دن یہ میری راتیں یہ ماہ سال میرے
بڑھتے رہے ہمیشہ رنج و ملال میرے
ہاں خوشنما بہت ہیں
خواب و خیال میرے
لیکن انھیں اگر میں تحفے کے طور پر میں
اُس در پہ لے کے جاؤں
دربار میں دکھاؤں
تو دو جہاں کا آقا مجھ کو نکال دے گا
آقا کے سامنے کیا منہ لے کے جاؤں گی میں
خواب و خیال کیوں کر جا کر دکھاؤں گی میں
شرمندہ ہو کے یوں ہی
بس لوٹ آؤں گی میں
غفلت شعار ہوں میں تقصیر وار ہوں میں
اُس نے اگر یہ پوچھا
دنیا سے لائی ہے کیا

پھر کیا جواب دوں گی　　اللہ میں کیا کہوں گی

راحت پسند ہستی　　کچھ کام کاج کر لے
اِن محنتوں کا خوگر　　اپنا مزاج کر لے
جو کام کل کرے گی
وہ اُٹھ کے آج کر لے
اُٹھ کارگاہ میں چل　　محنت کی راہ میں چل
اُٹھ وقت جا رہا ہے
تجھ کو بتا رہا ہے
تو عمر کھو رہی ہے　　برباد ہو رہی ہے

مرثیے (۱)

چلی ہے جان یادِ رفتگاں میں
مسافر ہے تلاشِ کارواں میں

---

(۱) عنوان — از مرتب

نعیم

والدہ کی موت

(۱۹۲۵ء میں جب مصنف خیر پور سندھ میں تھا)

اے کہ جینا تھا تجھے بھی ناگوار — اے کہ تو مدت سے تھی زار و نزار
مل گئی مٹی میں تو پایانِ کار — بن گیا ہے آج تیرا بھی مزار
فکر تھی تجھ کو بہت اولاد کی
راہ لی آخر عدم آباد کی

موجہائے اشک میں بہتی رہی — رفتگاں کی یاد میں رہتی رہی
دائمی ماتم کے دُکھ سہتی رہی — جلد مر جاؤں گی یہ کہتی رہی
آج فرصت ہو گئی ہر کام سے
سو، لحد میں سو، بڑے آرام سے

میری اولادوں کے تھے ارماں تجھے — اب پڑھانا تھا انھیں قرآں تجھے
یوں نہ کرنا تھا انھیں حیراں تجھے — بچیاں روتی ہیں اے اماں تجھے
آج کیوں اِن سے جدا سوئی ہے تو
دامنِ مادر میں جا سوئی ہے تو

تو نے کیں میری بہت غمخواریاں   عمر بھر کرتی رہی دلداریاں
ہائے رے مجبوریاں لاچاریاں   مجھ کو دھوکا دے گئیں ناداریاں

وقتِ آخر مَیں نہیں تجھ سے قریب
وقت آخر رہ گیا میں بدنصیب

اللہ اللہ کس قدر مجبور ہوں   زر نہیں آنے سے بھی معذور ہوں
کیا کہوں اس وقت بے مقدور ہوں   آہ تجھ سے کالے کوسوں دُور ہوں

تو نے بھیجا تھا مجھے پردیس میں
تا کہ آؤں رزق لے کر دیس میں

آہ وہ حسرت دمِ رخصت تری!   وہ تبسم میں نہاں رقت تری!
آہ وہ معصوم سی صورت تری!   آہ وہ مغموم سی شفقت تری!

وہ نگہ پر بے کسی چھائی ہوئی
وہ تری آواز بھرآئی ہوئی

میرے سر پر ہاتھ رکھنا پیار سے   اور یہ کہنا بڑے اصرار سے
اے پسر بے فکر رہ گھر بار سے   کام کیا تجھ کو مرے افکار سے

تو نہ رو اچھی ہوئی جاتی ہوں میں
غم نہیں کھاتی دوا کھاتی ہوں میں

ہائے آنے میں تذبذب تھا مجھے　　ہائے آنا ہی نہ تھا زیبا مجھے
خود ہی تو نے دودھ جب بخشا مجھے　　روکتا تھا میرا اندیشہ مجھے

کر دیا بے بس تری تاکید نے
ساتھ ہی والد کی بھی تائید نے

میں نے تیرے پاؤں پر بوسہ دیا　　تو نے سینے سے مجھے چمٹا لیا
کانپتے لب فی امان اللہ کہا　　اور منہ سر چوم کر رخصت کیا

راستے سے لوٹ آیا میں مگر
کیونکہ تھی تیری نقاہت پر خطر

پھر برائی کی مری تقدیر نے　　دی دغا کوتاہیِ تدبیر نے
کر دیا قائل تری تقریر نے　　اور کھینچا رزق کی زنجیر نے

حکم سے تیرے ہوا لاچار میں
پھر سفر پر ہو گیا تیار میں

گھر سے میں نکلا اُدھر گھر لٹ گیا　　میں تلاشِ زر میں تھا زر لٹ گیا
لٹ گیا بختِ سکندر لٹ گیا　　گلشنِ آغوشِ مادر لٹ گیا

میں شکستہ پر چمن سے دُور ہوں
دور ہوں خاکِ وطن سے دور ہوں

آج میں ہوں اور تنہائی مری　　ہم نفس ہے خاکِ صحرائی مری
دم بخود ہے ناشکیبائی مری　　دل کی دُنیا ہے تماشائی مری

دل ہی میں بیتاب ہو لیتا ہوں میں
اور چپکے چپکے رو لیتا ہوں میں

تیری خدمت کے لیے زندہ تھا میں تیری راحت کے لیے زندہ تھا میں
اِس سعادت کے لیے زندہ تھا میں اِس ضرورت کے لیے زندہ تھا میں

ہو سکی افسوس یہ خدمت تری
مجھ سے مستغنی رہی میت تری

اب کرے گا کون میرا انتظار خط لکھے گا کون مجھ کو بار بار
کون اب لے گا بلائیں بے شمار کون میرے دُکھ سے ہوگا بے قرار

اب حقیقی مادری شفقت کہاں
بے غرض بے مدعا اُلفت کہاں

قطع کرنی پڑ گئی راہِ بعید تا کہ جنت میں ہو تیری بازدید
اے خدائے پاک اے ربِّ مجید "منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید

نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے"
موت کو بھی اِک زمانہ چاہیے

بھائیوں کے غم ستاتے ہیں مجھے مرنے والے یاد آتے ہیں مجھے
لوگ کیوں نغمے سناتے ہیں مجھے میں نہیں روتا رُلاتے ہیں مجھے

کیا خبر ان کو میرا کیا حال ہے
میری ہستی کس قدر پامال ہے

غروبِ آفتابِ سخن

(اپنے استاد حضرت مولانا گرامی قدس سرہ کی وفات پر)

صبح کے ساحل سے جو کشتی چلی تھی نور کی
آخر کار اُس نے طے کر لی مسافت دُور کی

شکر ہے دریائے ہستی کا کنارا مل گیا
بے سہارا حسرتوں کو اِک سہارا مل گیا

اِس مسافر کے لیے منزل ہے ساحل شام کا
کٹ گیا لمبا سفر وقت آ گیا آرام کا

آرزو نے پاؤں پھیلائے ہیں سونے کے لیے
ولولے بیتاب ہیں آسودہ ہونے کے لیے

اب یہ محشر خواب کے طوفان میں کھو جائیگا
نیند آ جائے گی چپ ہو جائے گا سو جائے گا

شام نے کچھ اس طرح پھیلا دیا ہے دامِ خواب
موت کی تاریکیوں میں گھر گیا ہے آفتاب

اس غمِ جانکاہ میں چشمِ شفق خونبار ہے
بادلوں کا اِک جلوسِ ماتمی تیار ہے

نور کے شعلے کو یہ کالا کفن پہنائیں گے
پھر اُٹھا کر پردۂ ظلمات میں لے جائیں گے

بزمِ ہستی کا چراغِ حسن گل ہو جائے گا
روزِ روشن رات کے آغوش میں سو جائے گا

یاس ہی کے دل میں رہتی ہے مگر اُمید بھی
شام ہوتی ہے ہمیشہ صبح کی تمہید بھی

لیکن اے بختِ سیہ یہ شام ہے شامِ فراق
اس کے دامن میں نظر آتے ہیں ایام فراق

چھپ رہا ہے اسکے پردے میں اک ایسا آفتاب
پھر طلوعِ صبحِ محشر تک نہیں جس کا جواب

اپنے بدقسمت ستاروں کو بلا اے آسماں
سوچتا کیا ہے، صف ماتم بچھا اے آسماں

جا رہا ہے بخت روشن پھر نہ واپس آئے گا
کون دُنیا میں ترے اقبال کو چمکائے گا

بے زباں تاروں کی عشرت کیا ہے بزمِ خواب ہے
یہ چمک کچھ بھی نہیں ہے آنسوؤں کی آب ہے

آہ وہ خرمن جہاں سے جھولیاں بھرتے تھے یہ
جس شعاعِ نور سے کسبِ ضیا کرتے تھے یہ

آج وہ خورشیدِ عالمتاب خود گہنا گیا
چشمۂ آبِ بقا تاریکیوں میں آ گیا

مادرِ گیتی سیہ پوشی کی تیاری کرے
میت فرزند پر ماتم کرے زاری کرے

اے عروسِ زندگانی لٹ گیا تیرا سہاگ
سرد کر ڈالی قضا نے سینۂ اُلفت کی آگ

اے دُلھن زیور بڑھا دے اوڑھ لے چادر سیاہ
ہمکنارِ مرگ ہے تیرا شہِ خاور سپاہ

پتلیوں میں آ بسی جانِ گرامی دیکھ لے
پھر نہ دیکھے گی کبھی شانِ گرامی دیکھ لے

ہے لباسِ شعر خونِ آرزو سے لالہ زار
قبر ہے رنگینیوں کی یا گرامی کا مزار

اُٹھ گیا دن کا عمل، رات آ گئی، خاموش رات
اک بھیانک رات، اندھی رات، ماتم پوش رات

اے نگاہِ حسن جا اپنے سیہ خانے میں بیٹھ
سرمگیں پلکیں جھکا لے بند کاشانے میں بیٹھ

اُڑ گیا اے حسن! تصویرِ وفا داری کا رنگ
عشق کے جذبات میں آیا ہوس کاری کا رنگ

ہر طرف تاریکیاں چھائیں اُجالا چھپ گیا
تیری عصمت کی گواہی دینے والا چھپ گیا

اے جنونِ عشق دامان و گریباں چاک کر
اپنے ہاتھوں اپنی ہستی کو سپردِ خاک کر

اب تری تصویرِ وحشت پیکرِ بے رنگ ہے
مٹ گئی دنیائے دل میدانِ ہستی تنگ ہے

اب نمائش چاہتا ہے دیدۂ نظارہ بیں
اب کسے آئے گا تیری پاکبازی کا یقیں

اے زبانِ شوق تیری شعلہ گفتاری گئی
اے متاعِ ذوق تیری گرم بازاری گئی

دن ڈھلے ہی بلبل باغِ سخن کے ہم صفیر
ہو چکے ہیں اپنے اپنے آشیانوں میں اسیر

اب یہاں موجِ شمیم جاں فزا آئے تو کیوں
نالۂ جانکاہِ بلبل کی صدا آئے تو کیوں

اب گلستانِ سخن اُجڑا ہوا ویرانہ ہے
سرد، بے دل، بے زباں آہوں کا ماتم خانہ ہے

اب صبا آتی ہے تھراتی ہوئی ڈرتی ہوئی
رنگ کی بے مائیگی پر سسکیاں بھرتی ہوئی

اے تکلم چپ نہ ہو اِک آخری فریاد کر
قبر کی خاموش دُنیائے سخن ایجاد کر

ہوگئے خاموش ہنگامے تری آواز کے
اب نہ چھیڑے گا مغنی تار تیرے ساز کے

سوئے میٹھی نیند شور انگیز افسانے ترے
اُٹھ گیا پیرِ مغاں خالی ہیں پیمانے ترے

اب تخیل میں بھرے گا زندگی کے رنگ کون
شعلہ بن کر آپ ہو جائے گا زیبِ سنگ کون

بن گئی رنگینیِ گفتار تصویرِ خموش
گوشۂ فردوس میں پنہاں ہوا فردوسِ گوش

رہ گیا رنگ سخن اُترے ہوئے پھولوں کی باس
کون پہنائے گا اب صورت کو معنی کا لباس

ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح

(مولانا محمد علی قدس سرہٗ کی وفات پر)

''شبِ تاریک وبیم موج وگردابے چنیں حائل''[1]
نہنگانِ اجل کی نیتیں بیداد پر مائل

غضب تھا اِک شکستہ ناؤ کا منجدھار میں پھنسنا
وفا کی سسکیاں، قسمت کا رونا، موت کا ہنسنا

فقط اِک ''سر پھرا'' ملاح طوفانوں سے لڑتا تھا
ہوا کے آب کے جنوں سے شیطانوں سے لڑتا تھا

اگرچہ ناؤ میں انبوہ در انبوہ انساں تھے
یہ سب ملاح کے ہم قوم تھے پکے مسلماں تھے

یہ سب تھے عقل و جرأت میں ارسطو اور اسکندر
مگر آرام سے لیٹے ہوئے تھے ناؤ کے اندر

---

[1] یہ مصرع حافظ شیرازی کا ہے۔ (مرتب)

چلی جاتی تھی کشتی خشمگیں موجوں سے ٹکراتی
اُبھرتی ، بیٹھتی ، دبتی ، دباتی اور چکراتی

کبھیں گرداب کے منہ میں کبھیں پرشور دھارے پر
کبھی اس کے اشارے پر کبھی اُسکے اشارے پر

ہوا کے دوش پر خونخوار عفریتوں کی فوجیں تھیں
پہاڑ اُٹھ اُٹھ کے ٹکراتے تھے یا پانی کی موجیں تھیں

فلک پر بے تحاشا دوڑتے تھے ابر کے گھوڑے
کڑکتی بجلیاں برسا رہی تھیں آتشیں کوڑے

اُڑا کرتے ہیں صدموں سے جگر کے جس طرح لختے
اکھڑتے جا رہے تھے رفتہ رفتہ ناؤ کے تختے

تعجب ہے کوئی پروا نہیں تھی ناؤ والوں کو
کہ طوفاں میں نظر آتی تھی خامی "باکمالوں" کو

انھیں معلوم تھا گرداب نے کشتی کو گھیرا ہے
گھڑی بھر میں یہ بیڑا اب نہ تیرا ہے نہ میرا ہے

انھیں دعوے تھے بحرِ زندگی میں ناخدائی کے
انھیں گر یاد تھے، گرداب میں مشکل کشائی کے

یہ طوفانوں پہ کر سکتے تھے لچھے دار تقریریں
دکھا سکتے تھے تقریروں میں طوفانوں میں تصویریں

ہوا کا رخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جاتے تھے
تہِ دریا نہنگوں کی نظر پہچان جاتے تھے

یہ سب جو پاؤں پھیلائے ہوئے کشتی میں لیٹے تھے
پرانے ناخداؤں اور ملاحوں کے بیٹے تھے

مگر وہ ''سر پھرا ملاح'' تنہا تھا اکیلا تھا
اِدھر موجوں کی شدت تھی، اُدھر پانی کا ریلا تھا

وہ چلاتا تھا، اُٹھو بھائیو، آؤ، ادھر آؤ
ذرا ہمت دکھاؤ دست و بازو کام میں لاؤ

ہوا میں اُڑ چکی ہے دھجی دھجی بادبانوں کی
شکستہ ہو چکی ہے ناؤ، مانگو خیر جانوں کی

اُکھڑ جائیں گے تختے، آؤ ان کو تھام لو آ کر
سلامت ہیں جو کچھ "اوزار" اُن سے کام لو آ کر

اِدھر سیلاب پھر آتا ہوا معلوم ہوتا ہے
اِدھر گرداب بل کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے

نہیں ہنگام سونے کا کھڑے ہو جاؤ تن جاؤ
حوادث کے مقابل آہنی دیوار بن جاؤ

مبادا ناؤ اب کے اور بھی کمزور ہو جائے
یہ گردابِ بلا شاید دہانِ گور ہو جائے

وہ چلایا وہ چیخا منتیں کیں آہ و زاری کی
مگر بے سود تھا سب کچھ کسی نے بھی نہ یاری کی

نہ آمادہ ہوا کوئی بھی جرأت آزمائی پر
سبھی ہنستے رہے ملاح کی "ہرزہ سرائی" پر

بلاتا تھا وہ نامِ غیرتِ اسلام لے لے کر
جھڑک دیتے تھے لیکن سب اُسے دشنام دے دے کر

مگر ملاح اپنے فرض کا اُحساس رکھتا تھا
وہ اپنے ساتھیوں کی آبرو کا پاس رکھتا تھا

اُسی نے جسم پر کھائے تھپیڑے تند موجوں کے
اُسی کے ساتھ ٹکرائے ہوائے تیز کے جھونکے

وہ اپنی جان پر سہتا رہا ، سہتا رہا تنہا
اُٹھو! ہمت کرو! کہتا رہا کہتا رہا تنہا

مگر ہنستے رہے، ہنستے رہے غفلت کے شیدائی
اسی کشتی کے ہمراہی اسی ملاح کے بھائی

اُدھر بڑھتی رہی ، بڑھتی رہی دریا کی طغیانی
اِدھر گھٹتی رہی گھٹتی رہی توفیقِ انسانی

شکستہ ناؤ کا ملاح بے دم ہو گیا آخر
بڑھا کر حوصلہ تن میں لہو کم ہو گیا آخر

گرا دریا میں چپو، ہاتھ سے پتوار بھی چھوٹی
شکستہ ہو گئے بازو مگر ہمت نہیں ٹوٹی

وہ کشتی کے محافظ ڈھونڈتا تھا اب بھی یاروں میں
انھیں تاکید کرتا تھا اشاروں ہی اشاروں میں

مگر اُس کے اشاروں کو سمجھ سکتا نہ تھا کوئی
سمجھ سکتا بھی ہو، تو اس طرف تکتا نہ تھا کوئی

تھکن کا ہو رہا تھا اب اثر آہستہ آہستہ
لگا جھکنے وہ سرافراز سر آہستہ آہستہ

وہی سر جو ہواؤں سے نہ طوفانوں سے جھکتا تھا
نہ فرعونوں سے جھکتا تھا نہ ہامانوں سے جھکتا تھا

نہ جھکتا تھا کبھی میر و وزیر و شاہ کے آگے
وہ سر، اک مرتبہ پھر جھک گیا اللہ کے آگے

تعجب سے رِدائے ابر میں سے برق نے جھانکا
کہ یہ اِک آخری سجدہ تھا اُس مردِ مسلماں کا

شکستہ ناؤ میں طوفان کی اس چیرہ دستی میں
وہ اپنا فرض پورا کر چکا تھا بحرِ ہستی میں

نہ رو، او بے حمیت قوم! اب رونے سے کیا حاصل
دکھانے کے نہیں قابل یہ منہ دھونے سے کیا حاصل

ترا رونا تری طرزِ ستم سے بھی نرالا ہے
اُسے روتی ہے جس کو تو نے خود ہی مار ڈالا ہے

درِ توبہ ، بغیرِ توبہ ہرگز کھل نہیں سکتا
لہو کا داغ رسمی آنسوؤں سے دُھل نہیں سکتا

ننھی اصغری

(ایک بچی کی موت پر)

دُنیا میں آ گیا تھا　　رحمت کا اِک فرشتہ
ہم خاکیوں سے آ کر　　جوڑا تھا اُس نے رشتہ

اُلفت کا بیج بو کر　　فردوس کو سدھارا
اللہ کی رضا پر　　کیا زور ہے ہمارا

ننھی سی ایک چڑیا　　جنت سے آ گئی تھی
آنکھوں میں بس گئی تھی　　دل میں سما گئی تھی

من موہنی سی مینا　　کچھ روز چہچہائی
لیکن ہوا یہاں کی　　اُس کو نہ راس آئی

آخر اُداس ہو کر — چپ چاپ اُڑ گئی وہ
جنت سے آئی تھی وہ — جنت کو مڑ گئی وہ

لوٹے گی اب نہ ہرگز — ہم لاکھ اُسے بلائیں
چاہے ہزار پیٹیں — رو رو کے سر کھپائیں

اب کیا بنا سکے گا — رو رو کے جان کھونا
رونے سے فائدہ کیا؟ — بے فائدہ ہے رونا

ہاں یاد آ رہی ہیں — اس کی وہ ساری باتیں
وہ بھولی بھولی صورت — وہ پیاری پیاری باتیں

وہ ہم سنوں سے مل کر — بے اختیار ہنسنا
وہ بار بار باتیں — وہ بار بار ہنسنا

ہوتا نہ تھا کسی سے — جھگڑا فساد اس کو
اور ''شاندار گنگا''[1] — ساری تھی یاد اس کو

---

1 بچوں کے لیے ایک نظم جس میں یہ مصرع ہر بند کے آخر میں آتا ہے: او شاندار گنگا او پُر بہار گنگا (مرتب)

نظم حفیظ پڑھنا — ہر ایک کو سنانا
''میرا سلام لے جا'' — میٹھے سروں میں گانا

اِک پاک رُوح تھی یا — معصوم اصغری تھی
سچ مچ وہ نیک بچی — جنت کی تیتری تھی

نیند آ گئی ہے اس کو — پھولوں میں سوگئی ہے
تصویر کی طرح سے — خاموش ہو گئی ہے

تم چاہتے ہو اسلم — رو کر اسے جگانا
گویا سمجھ رہے ہو — اس نیند کو بہانا

سونے دو سو رہی ہے — اب مت اسے جگاؤ
اس دُکھ بھرے جہاں میں — واپس نہ پھر بلاؤ

دُنیا ہے سکھ سے خالی — دُکھ چار سو بھرا ہے
غم کے سوا یہاں پر — سوچو تو کیا دھرا ہے

موت کا قافلہ

آتی ہے آوازِ درا
یہ قافلہ ہے موت کا
دیکھو وہ گرد اُڑتی ہوئی
افلاک پر چڑھتی ہوئی
ہر موڑ پر مڑتی ہوئی
ہر سمت کو بڑھتی ہوئی

آہوں کے ڈیرے ساتھ ہیں
گہرے اندھیرے ساتھ ہیں
حسرت بھری خاموشیاں
ہیں ساتھ ساتھ اس کے رواں
یہ قافلہ ہے موت کا
آتی ہے آوازِ درا

ہاں موت ہے یہ موت ہے
اپنا سفر کرتی ہے طے
یعنی دیارِ ہست کو
پھرتی ہے سر کرتی ہوئی
ہر اِک بلند و پست کو
زیر و زبر کرتی ہوئی

کہسار کیا میدان کیا آباد کیا ویران کیا
یہ سب کو ٹھکراتی ہوئی زیرِ نگیں لاتی ہوئی
اپنا سفر کرتی ہے طے ہاں موت ہے، یہ موت ہے

پنجے درندوں کی طرح بازو پرندوں کی طرح
ہے ہڈیوں کے ڈھانچ پر افسردگی لپٹی ہوئی
ڈائن کی صورت سر بسر آزردگی لپٹی ہوئی

آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی مردہ دلی چھائی ہوئی
پچکے ہوئے سے گال ہیں بکھرے ہوئے سے بال ہیں
بازو پرندوں کی طرح پنجے درندوں کی طرح

اس کی خوشی ماتم میں ہے اس کی مسرت غم میں ہے
نالے نہیں یہ درد کے اس دیونی کا راگ ہے
جھونکے ہوائے سرد کے اس کے نفس کی آگ ہے

جس شہر میں جلتی ہے یہ جس راہ پر چلتی ہے یہ
آتی ہے آوازِ فغاں اُٹھتا ہے آہوں کا دھواں
اس کی مسرت غم میں ہے اس کی خوشی ماتم میں ہے

اس کے جلو میں ہیں رواں　　گل پیرہن بانکے جواں
بوڑھے بھی ہیں بچے بھی ہیں　　ہیں عورتیں بھی مرد بھی
جھوٹے بھی ہیں سچے بھی ہیں　　احرار بھی دِل سرد بھی

خاطی بھی ہیں معصوم بھی　　مسرور بھی مغموم بھی
مجبور بھی مختار بھی　　مفلوک بھی زردار بھی
گل پیرہن بانکے جواں　　اس کے جلو میں ہیں رواں

یاروں سے دل برداشتہ　　پیاروں سے دل برداشتہ
یہ پریم گھاتی موت کے　　موہ لوبھ تج کر آئے ہیں
سارے براتی موت کے　　پھولوں میں سج کر آئے ہیں

عاشق وفا بھولے ہوئے　　معشوق ادا بھولے ہوئے
بیوی کا دل توڑے ہوئے　　بچوں سے منہ موڑے ہوئے
پیاروں سے دل برداشتہ　　یاروں سے دل برداشتہ

کہتی ہے آوازِ جرس — اللہ بس ، باقی ہوس
سنتے ہیں سب شاہ و گدا — یہ موت کی آواز ہے
سب ہیں اسی کے ہم نوا — کتنا سریلا ساز ہے

لاچار ہیں مجبور ہیں — اس سحر میں مسحور ہیں
یہ نیند کے ماتے ہیں سب — سوتے چلے جاتے ہیں سب
کہتی ہے آوازِ جرس — اللہ بس ، باقی ہوس

یہ قافلہ ہے موت کا — چلتا ہی چلتا جائے گا
اس کے شہیدانِ اجل — بڑھتے ہی بڑھتے جائیں گے
کوہِ ندا پہ سر کے بل — چڑھتے ہی چڑھتے جائیں گے

یہ سست رو ، آتش قدم — جائیں گے تا ملکِ عدم
منزل مگر معدوم ہے — اللہ کو معلوم ہے
چلتا ہی چلتا جائے گا — یہ قافلہ ہے موت کا

ایک اور شامِ رنگیں

جہاں دھرتی کے سینے پر تھی مارا مار گھوڑوں کی
جہاں ٹاپیں سموں کی تھیں جہاں پھٹکار کوڑوں کی

جہاں برق و دُہل کا شور و غل تھا جھانجھ بجتے تھے
جہاں بجلی چمکتی تھی جہاں بادل گرجتے تھے

جہاں برچھوں کے پھل آتے ہی گڑ جاتے تھے سینوں میں
جہاں روزن کئے جاتے تھے ہستی کے سفینوں میں

مسلط ہے فضاؤں پر وہاں اب دورِ مدہوشی
کجا ہنگامۂ محشر ، کجا عالم فراموشی

بالآخر شام کی منزل پہ روزِ ہولناک آیا
اقامت گاہ پر جنگی سپاہی سینہ چاک آیا

سکت باقی نہیں ہے خاک میں ہنگامہ کوشی کی
پڑی ہے زندگی اوڑھے ہوئے چادر خموشی کی

شفق ہے یا لہو کی گرمیوں نے گل کھلائے ہیں
زمیں کے داغ اُبھرے ہیں فلک پر رنگ لائے ہیں

یہ ریگ و سنگ کی وادی گماں تھا جس پہ بنجر کا
پھلا پھولا ہے اس میں کھیت ہر سو تیغ و خنجر کا

عجب مضمونِ رنگیں ہیں یہ تختے سنگریزوں کے
ہیں سجدہ ریز ان پر سر قلم ہو ہو کے نیزوں کے

کہیں ناوک کہیں اُفتادہ ہیں ٹکڑے کمانوں کے
کہیں شمشیر کے قبضے کہیں ٹکڑے ہیں میانوں کے

کہیں اُلجھے ہوئے ہیں پتھروں سے چیتھڑے گیلے
کہیں مقتول گھوڑے تھوڑی تھوڑی ریت کے ٹیلے

کہیں زرہیں کہیں پھوٹے ہوئے مغفر ہیں اُفتادہ
کہیں ٹوٹی ہوئی ڈھالیں کوئی نقشیں کوئی سادہ

بقیہ ہے یہ انسانوں کے جوش و کبر و مستی کا
یہ منظر آخری ہے خود گری کا خود شکستی کا

عصائے پیری

گیا وہ ہنگامِ خود پرستی
اُجڑ چکی ولولوں کی بستی
خزاں کے ہاتھوں سے لٹ چکی ہے   ہوس کی شوخی ہوا کی مستی
شباب کی وادیِ طرب سے   گزر گیا کاروانِ ہستی
عدم کا پرہول راستہ ہے   اُدھر بلندی اِدھر ہے پستی
گیا وہ ہنگامِ خود پرستی

سفر ہے اور رات کا اندھیرا   نہ جانے کب آئے گا سویرا
ٹھہر کے چلنا ہے غیرممکن   کہ عمر کا لد چکا ہے ڈیرا
گرہ میں زادِ سفر نہیں ہے   ہے جان کی تاک میں لٹیرا
غرض پرستوں کی ہمرہی ہے   نہ کوئی تیرا نہ کوئی میرا
سفر ہے اور رات کا اندھیرا

قدم قدم پر ہزار ٹھوکر نہ عشق ساتھی نہ عقل رہبر
سنبھل کے چلنا ہے سخت مشکل کہ پاؤں جمتے نہیں زمیں پر
کہیں ذرا بھی جو پیر پھسلا تو ٹکڑے ٹکڑے ہے کاسۂ سر
نزاکتِ راہ کی وہ حالت اور اُس پہ یہ تندوتیز صرصر
قدم قدم پر ہزار ٹھوکر

ہے دامنِ ہوش پارا پارا حواس بھی کر گئے کنارا
مگر چلے جا رہے ہیں رہرو کہ اب نہیں کوئی اور چارا
فضائے اُمید کی جبیں پر چمک رہا ہے بس ایک تارا
کہ ہے تو فرزند ساتھ میں ہے عصائے پیری ہے یہ سہارا
چمک رہا ہے بس ایک تارا

نیندوں کی بستی

خاموش ! خاموش

اے دوست ، خاموش

اے رونے والے اے فاتحہ خواں

یہ سرزمیں ہے شہرِ خموشاں

سوئے پڑے ہیں ہستی کے طوفاں

غم ہائے امروز فردا کے ارماں

ناکامیِ دوش

خاموش ، خاموش

خاموش ، خاموش

اے دوست خاموش!

بیٹھے ہیں مل کر سانجھ اور سویرا

دھندلی ضیا ہے اُجلا اندھیرا

اِس وقت کوئی تیرا نہ میرا

اُترا ہوا ہے رُوحوں کا ڈیرا

آنکھوں سے رُوپوش
خاموش ، خاموش
خاموش ، خاموش
اے دوست ، خاموش

اے جنبشِ لب   ہاں ہاں ، خبردار
باطل نہ ہوجائے   یہ سحر زنہار
ہیں آج یک جا   عجز اور پندار
پہلو بہ پہلو   مجبور و مختار

ہشیار و مدہوش
خاموش خاموش
خاموش ، خاموش
اے دوست ، خاموش

خاموشیوں میں   گم ہیں صدائیں
بے کار ہیں سب   یہ التجائیں
کس کو پکاریں   کس کو بلائیں
یہ بیوی بچے   یہ باپ مائیں

ہیں پنبہ درگوش
خاموش ، خاموش

ایک لڑکی شاداں

یہ نظم میری عزیز بیٹی ارشاد بتول کی یادگار ہے

میں نے ایک مدت تک بچوں کے لیے نظمیں لکھی ہیں۔ ان کو میری سب سے بڑی بیٹی ارشاد بتول جسے میں پیار سے ''شاداں'' کہا کرتا تھا بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔ اکتوبر ۱۹ء میں جب میں نے پھول کی سالگرہ کے لیے متعدد نظمیں لکھیں تو ان میں ایک نظم یہ تھی۔ میں اس وقت سفر میں تھا اور میرے بال بچے جالندھر میں جہاں ''شاداں'' مدرسۃ البنات میں قرآن مجید پڑھ رہی تھی۔ اس نظم سے مقصود محض شاداں کو دق کرنا تھا۔ میں نے لکھا کہ وہ پڑھتی پڑھاتی کچھ نہیں۔ سارا دن کھیل کود میں ضائع کر دیتی ہے۔ خیال یہ تھا کہ اوّل تو وہ اس نظم کو اپنے نام پر دیکھ کر خوش ہوگی۔ جب اسے پڑھے گی تو پڑھ کر بگڑے گی۔ اور اس طرح خوب ہنسی مذاق رہے گا۔ ان پرلطف خیالات کو لیے جس روز میں گھر پہنچا اسی دن شام کو یہ بچی جو میری آنکھوں کا نور تھی اچانک کنوئیں میں گر کر جاں بحق تسلیم ہوگئی۔ پھول کا سالگرہ نمبر اس وقت ملا جب میں اپنے لخت جگر کو سپردِ خاک کر چکا تھا۔ حفیظ

اک لڑکی تھی چھوٹی سی ۔۔۔ دُبلی سی اور موٹی سی
ننھی سی اور منی سی ۔۔۔ بالکل تھن متھنی سی
اس کے بال تھے کالے سے ۔۔۔ سیدھے گھنگریالے سے

حفیظ سے ۔۔ نامکمل رہ گیا ہے۔ اگلی نظم ''ارشاد کی یاد میں'' بھی اسی بچی کے بارے میں ہے جہاں پورا ۔۔
نی ۱۴، ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء تحریر کیا گیا ہے۔ مرتب

منہ پر اس کے لالی سی چٹی سی مٹیالی سی
اس کی ناک پکوڑی سی نوکیلی سی چوڑی سی
آنکھیں کالی نیلی سی سرخ سفید اور پیلی سی
کپڑے اُس کے تھیلے سے اُجلے سے اور میلے سے
یہ لڑکی تھی بھولی سی بی بی سی اور گولی سی
ہر دم کھیل تھا کام اس کا شاداں بی بی نام اس کا
ہنستی تھی اور روتی تھی جاگتی تھی اور سوتی تھی
ہر دم اس کی اماں جان کھینچا کرتی اُس کے کان
کہتی تھیں مکتب کو جا کھیلوں میں مت وقت گنوا
امی سب کچھ کہتی تھی شاداں کھیلتی رہتی تھی

اک دن شاداں کھیل میں تھی آئے اُس کے ابا جی
وہ لاہور سے آئے تھے چیزیں ویزیں لائے تھے
بکس میں تھیں یہ چیزیں سب خیر تماشا دیکھو اب
ابا نے آتے ہی کہا شاداں آ کچھ پڑھ کے سنا
گم تھی اِک مدت سے کتاب کیا دیتی اس وقت جواب
دو بہنیں تھیں شاداں کی چھوٹی ننھی منی سی
نام تھا منجھلی کا سیماں گڑیا سی ننھی ناداں

وہ بولی اے ابا جی — اب تو پڑھتی ہوئی میں بھی
بلی ہے سی اے ٹی کیٹ — چوہا ہے آر اے ٹی ریٹ
منہ ماؤتھ ہے، ناک ہے نوز — اور گلاب کا پھول ہے روز
میں نے ابا جی' دیکھا! — خوب سبق ہے یاد کیا
شاداں نے اُس وقت کہا — "میں نے ہی تو سکھایا تھا"
لیکن ابا نے چپ چاپ — کھولا بکس کو اُٹھ کر آپ
اس میں جو چیزیں نکلیں — ساری سیماں کو دے دیں
اِک چینی کی گڑیا تھی — اِک جادُو کی پڑیا تھی
اِک ننھی سی تھی موٹر — آپ ہی چلتی تھی فرفر
گیندوں کا اِک جوڑا تھا — اِک لکڑی کا گھوڑا تھا
اِک سیٹی تھی اِک باجا — ایک تھا مٹی کا راجا
شاداں کو کچھ بھی نہ ملا — یعنی کھیل کی پائی سزا

اب وہ غور سے پڑھتی ہے
پورے طور سے پڑھتی ہے

ارشاد کی یاد میں

اِک بار پھر وطن میں گیا ، جا کے آگیا
لختِ جگر کو خاک میں دفنا کے آ گیا

ہر ہم سفر پہ خضر کا دھوکا ہوا مجھے
آبِ بقا کی راہ سے کترا کے آگیا

حورِ لحد نے چھین لیا تجھ کو اور میں
اپنا سا منہ لیے ہوئے شرما کے آ گیا

دل لے گیا مجھے تری تربت پہ بار بار
آواز دے کے بیٹھ کے ، اُکتا کے آ گیا

رویا کہ تھا جہیز ترا واجب الادا
مینہ موتیوں کا قبر پہ برسا کے آگیا

میری بساط کیا تھی حضورِ رضائے دوست
تنکا سا ایک سامنے دریا کے آ گیا

اب کے بھی راس آئی نہ حبِ وطن حفیظ
اب کے بھی ایک تیرِ قضا کھا کے آگیا

ارشاد بتول ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اچانک کنوئیں میں گر گئی اور جاں بحق ہوئی۔ اس وقت اس کی عمر کا دسواں سال تھا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی رات جالندھر کے دوستوں یعنی اہل وطن نے میری اس بچی کا مزار بھی کھود کر برباد کر دیا۔ حفیظ

حریم دل[1]

کوثر چکد از لبم بہ ایں تشنہ لبی
خاور دمد از شبم بہ ایں تیرہ شبی
اے دوست ادب کہ در حریمِ دلِ ماست
شاہنشہِ انبیاء رسولِ عربی

گرامی

---

[1] عنون - از مرتب

عیدِ میلاد النبیؐ

زندگی مردہ تھی رُوحِ زندگی افسردہ تھی
خامیِ تخلیق اپنے آپ سے آزردہ تھی
جلوے شرمندہ تھے اپنی خامیِ تکمیل سے
عشق تھا روپوش اب تک حسن کی قندیل سے
سازِ فطرت تھا ابھی مضراب سے نا آشنا
نغمہ تھا اک لذتِ بیتاب سے نا آشنا
سو رہی تھی زندگانی خواب کے آغوش میں
آرزوئیں دم بخود تھیں حسرتِ خاموش میں
باغ سے موجِ شمیمِ جانفزا اُٹھتی نہ تھی
نالۂ جانکاہِ بلبل کی صدا اُٹھتی نہ تھی
آنکھ تھی لیکن ابھی تک اشک سے محروم تھی
کامیابی کی تمنا رشک سے محروم تھی

رُوح نے اب تک دعاؤں کے مزے پائے نہ تھے
خامشی نے التجاؤں کے مزے پائے نہ تھے
عالمِ ایجاد تھا کچھ اس طرح یعنی نہ تھا
آفرینش لفظ تھا، شرمندۂ معنی نہ تھا
یک بیک اُمید کے گھر میں خوشی پیدا ہوئی
زندگی کے واسطے اِک زندگی پیدا ہوئی
سینۂ ہستی میں کروٹ لی دلِ بیتاب نے
پڑھ لیا یعنی حرارت کا سبق سیماب نے
روئے فطرت پر محبت کی ضیا پیدا ہوئی
حسن کی آنکھیں جھکیں، اُن میں حیا پیدا ہوئی
ناگہاں ساکن ہواؤں میں روانی آ گئی
اور چمن کے پتے پتے پر جوانی آ گئی
سینۂ غنچہ میں اک میٹھی کسک پیدا ہوئی
گل میں خوشبو اور شاخوں میں لچک پیدا ہوئی
سبزۂ خوابیدہ جاگا لہلہانے کے لیے
ہوگئیں بیتاب کلیاں مسکرانے کے لیے
آج زانوئے ازل پر صبح نے انگڑائی لی
مسکرا کر اک کرن نے ہاتھ میں شہنائی لی

غل ہوا دُنیا میں ختم المرسلینؐ پیدا ہوا
مخزنِ اِسرارِ قدرت کا امیں پیدا ہوا
کشتیِ ارض و سما کا ناخدا پیدا ہوا
ابتدا و انتہا کا پیشوا پیدا ہوا
عرش پر سے شادیانوں کی صدا آنے لگی
ساز الفت سے ترانوں کی صدا آنے لگی
فرش پر روح الامیں آنے لگے جانے لگے
طائرانِ قدس نغمے نعت کے گانے لگے
دھیمے دھیمے رس بھرے نغمے ہوا میں بس گئے
میٹھے میٹھے گیت حوروں کے فضا میں بس گئے
بس گیا آ کر فضا میں لشکرِ نورانیاں
اور پیش نورِ مطلق جھک گئیں پیشانیاں
پر فرشتوں کے کھلے انوار لہرانے لگے
نور کے بادل زمیں پر پھول برسانے لگے
کعبۂ توحید پر رکھ کر جبیں سات آسماں
جھک گئے تعظیم کو پیشِ زمیں سات آسماں
تھی یہ صبح زندگی تمہیدِ میلاد النبیؐ
آپ خالق نے منائی عیدِ میلاد النبیؐ

ہلالِ عید

کر دیا شام نے تمام
دامنِ غرب لالہ فام

رنگ بھرے سحاب میں ڈوب گیا ہے آفتاب
چھپ نہ سکا نقاب میں خندۂ حسنِ بے حجاب

منظرِ باغِ پر بہار
اور فرازِ کوہسار
چادرِ آبِ جوئبار
ہو گئے سب طلا نگار

نورِ شفق نے بھر دیے رنگ سے کوہ، سقف و بام
حسنِ نظر نے کر دیے دیدہ و رُوح شادکام

کر دیا شام نے تمام
دامنِ غرب لالہ فام

ہو گئی نرم رو ہوا
محوِ سکوت ہے فضا

دن کے تھکے ہوئے کسان　　اپنے گھروں میں آ گئے
دشت نورد ساربان　　چشمۂ آب پا گئے

خوش ہیں تمام روزہ دار
خوش ہوا اُن سے کردگار
بند ہیں سارے کاروبار
آنکھ ہے وقفِ انتظار

منتظرِ نوید ہے　　صبر و سکوں اُمید کا
ضبطِ دروں شہید ہے　　تیغِ ہلال عید کا

ہو گئی نرم رَو ہوا
محوِ سکوت ہے فضا
آج ہیں سب جوان و پیر
ایک لکیر کے فقیر

طفل رُبا اُمنگ سے　　شاہ و گدا نہال ہے
جوشِ طرب کے رنگ سے　　چہرۂ شوق لال ہے

حسن بھری بلندیاں
دیکھ رہی ہیں آسماں
چشم فلک سے بھی نہاں
محوِ نظر ہیں بیبیاں

سرخ شفق کی ڈھال میں ۔ گڑ گئے بے شمار تیر
جستجوئے ہلال میں گم ہیں کئی مہِ منیر

آج ہیں سب جوان و پیر
ایک لکیر کے فقیر
جوشِ خوشی سے یک بیک
بس گیا گنبدِ فلک

مسلم روزہ دار نے ختم کیا مہِ صیام
سازِ طرب کے تار نے توڑ دیا سکوتِ شام

دیکھ رہا ہے آسماں
آج زمین کا سماں
دشت و جبل میں ناگہاں
گونج اٹھیں سلامیاں

سن کے ترانۂ دُعا وجد میں آ گئے ملک
چھا گیا ایک نور سا فرشِ زمیں سے عرش تک

جوشِ خوشی سے یک بیک
بس گیا گنبدِ فلک
مل گئی عید کی نوید
دیکھ لیا ہلالِ عید

ارض و سما میں دفعتاً　　　بانگ اذاں ہوئی بلند
ایک صدا میں دفعتاً　　　ہو گئی ہر زبان بند

ایک جہانِ پاکباز
کرکے وضو پئے نماز
دل کو کئے ہوئے گداز
جھک گیا پیشِ بے نیاز

بندہ اِدھر، اُدھر خدا　　　لطف اُدھر، اِدھر اُمید
عجز اِدھر، اُدھر عطا　　　گفت اِدھر، اُدھر شنید

مل گئی عید کی نوید
دیکھ لیا ہلالِ عید

شہیدوں کی عید

فرض پورا کر چکے ، فرصت ملی ہر کام سے
مقبروں میں سو رہے ہیں آج کیا آرام سے

صبح کی صورت اُٹھے تھے رات کے آغوش سے
ہو گیا زندہ عمل کا جوش ان کے جوش سے

ان کا اٹھنا تھا کہ تقدیرِ اخوت جاگ اُٹھی
خوابِ غفلت میں پڑی تھی آدمیت جاگ اُٹھی

ان سروں پر سایہ افگن تھا علم اسلام کا
اِن لبوں پر وِرد تھا اللہ کے پیغام کا

آیۂ رحمت تھے یہ سارے زمانے کے لیے
آئے تھے اُجڑی ہوئی دنیا بسانے کے لیے

ہوگئیں آباد ان کے نام سے آبادیاں
رشکِ جنت بن گئیں اِن کے لہو سے وادیاں

بام و در، کہسار و میداں، خشک و تر، پست و بلند
ہو گئے اللہ والوں کی صدا سے بہرہ مند

زندگی میں بس گئے آباد کاروں کی طرح
زیست کی مدت گزاری روزہ داروں کی طرح

پیکرِ ہستی میں جب رُوحِ محبت بھر چکے
آئے تھے جس کام کو وہ کام پورا کر چکے

آخر ان کی عمر کا دن ڈھل گیا شام آ گئی
یعنی صبحِ عید کا شب لے کے پیغام آ گئی

آخری روزہ کیا افطار حق کے نام پر
بہرِ اظہارِ اطاعت جھک گئے سجدوں میں سر

قبلہ رُو ہو کر مصلوں پر نمازی سو گئے
فتح کر کے جنگ کو مردانِ غازی سو گئے

رات اِن کی ہے کہ روزِ عیش کی تمہید ہے
ان شہیدوں کے لیے صبحِ قیامت عید ہے

ہماری عید

یہ عید ہے روزہ داروں کی
محبوبِ خدا کے پیاروں کی
جن کی طاعت مشکور ہوئی
پروان چڑھی منظور ہوئی
سجدوں نے جبینیں چمکائیں
منت کی مرادیں بر آئیں
محنت کا شجر پھل لایا ہے
دِن فضلِ خدا کا آیا ہے
یہ بخشش کی اُمید کا دِن
یاروں کے لیے ہے عید کا دن
رحمت کی گھٹائیں چھائی ہیں
قبلے کی طرف سے آئی ہیں
وا ہیں توحید کے مے خانے
اور گردش میں ہیں پیمانے
ساقیِ ازل کی چوکھٹ ہے
مستانِ الست کا جمگھٹ ہے
یہ سب اللہ کے دیوانے
شمعِ وحدت کے پروانے
توحید کے نغمے گاتے ہیں
مل مل کر عید مناتے ہیں

ہم بدقسمت ہم بے چارے　　آزارِ فرقت کے مارے
عید آئی ہے کیسے مانیں　　ہم عید کی خوشیاں کیا جانیں
یثرب سے نہیں پیغام آیا　　غربت میں ماہِ صیام آیا
محبوب کے در سے دُور رہے　　لاچار ہوئے مجبور رہے
جب نورِ خدا کی دید نہیں
یہ عید ہماری عید نہیں

میرا سلام لے جا

قسمت کے آسماں پر سیمائے کہکشاں پر
چمکا ترا ستارا
اُس در پہ حاضری کا تجھ کو ہوا اشارا
اے بختیار بندے
اے کامگار بندے
تیری مراد مندی تقدیر کی بلندی
تجھ کو پکارتی ہے
آ باریاب ہو جا
اے ذرّۂ محبت جا آفتاب ہو جا
دربار میں چلا ہے
سرکار میں چلا ہے
رختِ سفر اُٹھا لے اللہ کے حوالے
یثرب کے جانے والے بس اِک پیام لے جا
میرا سلام لے جا

میری یہ سرد آہیں یہ منتظر نگاہیں
ان کا خیال کرنا
لیکن نہیں مناسب کچھ عرضِ حال کرنا
وہ جانتے ہیں سب کچھ
پہچانتے ہیں سب کچھ
ناشاد آرزوئیں برباد آرزوئیں
بے تاب ہو رہی ہیں
تاہم خموش رہنا
آنکھوں سے دیکھتا جا منہ سے مگر نہ کہنا
یہ صبح و شام میرے
سب سامنے ہیں تیرے
ان سے کوئی بھلائی دیتی نہیں دکھائی
لے جا سکے تو بھائی! یہ صبح و شام لے جا
میرا سلام لے جا
ہر چیز کھو چکا ہوں برباد ہو چکا ہوں
یہ زندگی ہے میری
اس وقت پاس میرے شرمندگی ہے میری
کچھ ارمغاں نہیں ہے
جز این و آں نہیں ہے

مفلس ہوں بے نوا ہوں　　کچھ بھی نہیں میں کیا ہوں
تجھ سے نہ مانگ مجھ سے
نادم نہ کر خدارا
دل تیرے پاس ہو تو　　دے دے مجھے ''ادھارا''
میرا کلام کیا ہے
یہ جنسِ خام کیا ہے
یہ ارمغاں خوشی سے　　چاہے تو ہاں خوشی سے
اے مہرباں خوشی سے　　یہ جنسِ خام لے جا
میرا سلام لے جا
فریاد و ہاؤ ہو میں　　صہبائے آرزو میں
وہ جوش ہی نہیں ہے
ٹوٹا ہوا بھی ہے دل　　خاموش ہی نہیں ہے
سرشار کرنے والی
شے ہو چکی ہے خالی
مے خانۂ یقیں سے　　اُس کیفِ بہتریں سے
ایمانِ آتشیں سے
پھر اس کو بھر کے لانا
پینے چلا ہے تو بھی　　اور مجھ کو بھی پلانا
ٹوٹا ہوا ہے بے شک
پھوٹا ہوا ہے بے شک

ہے عرض دست بستہ ہاں دُور کا ہے رستہ
اور جام بھی شکستہ لیکن یہ جام لے جا
میرا سلام لے جا
یہ اشک ریز آنکھیں طوفان خیز آنکھیں
اب خشک ہو چکی ہیں
دریا کہاں سے لائیں قطرے کو رو چکی ہیں
ورنہ یہ آرزو تھی
مدت سے جستجو تھی
کشتی بنا کے دل کو اور پھر سجا کے دل کو
یثرب کے جانے والے
اس میں تجھے بٹھاؤں
دریائے سرمدی کے ساحل پہ لے کے جاؤں
خیر اے دلیر اچھا
ہوتی ہے دیر اچھا
جا ہر طرح سلامت لے جا مری محبت
لے جا مری عقیدت میرا سلام لے جا
میرا سلام لے جا

گلشنِ جنت

وہ ملک جو ایک سمندر ہے لمبے چوڑے میدانوں کا
مجموعہ ریگستانوں کا اور ناہموار چٹانوں کا

اِک صحرا جس کے سینے پر آتش کے شرارے پھرتے ہیں
اِک ویرانہ جس میں سناٹے مارے مارے پھرتے ہیں

اک رقص کدہ خاموشی کا اک عشرت گاہ بگولوں کی
سنسان بیاباں جس میں فوجیں آسودہ ہیں غولوں کی

وہ دشت جہاں پُرشور ہوائیں گرد غبار اڑاتی ہیں
مٹی کی چھاؤنی چھاتی ہیں، مٹی کا فلک بن جاتی ہیں

طوفانی ریگِ رواں جس میں زہریلے طوفاں اُٹھتے ہیں
غصے میں بھر کر کالے نیلے پیلے طوفاں اٹھتے ہیں

وُہ مٹی کے تودے جن پر کرنوں کی بارش ہوتی ہے
وہ ریت جو رات کی چادر میں تاروں کے نیچے سوتی ہے

جو وسعت ذرّے ذرّے کو سو دشت بنائے بیٹھی ہے
گنتی کے نخلستانوں کو دامن میں چھپائے بیٹھی ہے

ہاں ہاں وہ عرب جو گہوارہ ہے ظلمت سوز تمازت کا
رکھا ہے اسی پردے میں چھپا کر حق نے گلشن جنت کا

یہ جنت جس کی راہِ طلب میں ذرّہ ذرّہ سینا ہے
یہ شہر ہے کملی والے کا ، اور اس کا نام مدینہ ہے

متفرق نظمیں (۱)

۱ عنوان از مرتب

تین نغمے

ٹیگور......اقبال......حفیظ

ہم نوا کوئی نہ پایا جب زمیں کے فرش پر
میرا نغمہ لے چلا مجھ کو اُڑا کر عرش پر
ظلمتِ ابلیس کی راہوں سے کتراتا ہوا
بندگی کے گیت اپنے رنگ میں گاتا ہوا
جادۂ پامالِ مہر و ماہ طے کرتا ہوا
مہ بہ مہ انجم بہ انجم راہ طے کرتا ہوا
کہکشاں تا کہکشاں بڑھتا گیا بڑھتا گیا
آسماں تا آسماں چڑھتا گیا چڑھتا گیا
یہ عبودیت کا نغمہ جانے کیا اعجاز تھا
جو ستارا میں نے دیکھا گوش برآواز تھا
زہرۂ افلاک میری لے اُڑا کر لے گئی
نقش سوز و ساز کے دل میں بٹھا کر لے گئی

کار پردازانِ قدرت ہم سفر بنتے گئے
اپنی اپنی منزلوں تک راہبر بنتے گئے
مرحبا کہتے ہوئے ننھی سی مشتِ خاک پر
ہو گئے رخصت ستارے بامِ ہفت افلاک پر
دو فرشتے ساتھ چلتے چلتے آخر رہ گئے
اے بشر! اب تیری جرأت ہے، یہ فقرہ کہہ گئے
میں کہ تھا 'سرمست صہبائے ازل' چلتا گیا
پاؤں تھک کر رہ گئے تو سر کے بل چلتا گیا
چلتے چلتے ایک ندی راہ میں حائل ہوئی
میرے ارمانوں کی منزل گاہ میں حائل ہوئی
ہلکی ہلکی پُرسکوں لہروں میں لہراتی ہوئی
میٹھے میٹھے گیت ٹھنڈی پریت کے گاتی ہوئی
لہریا آبی دوپٹا تا کمر لپٹا ہوا
دامنوں سے دامنِ شام و سحر لپٹا ہوا
عطر کی لپٹیں چلی آتی تھیں اس کے ساتھ ساتھ
تھی ہوا اُس کے لیے ہمراز مشاطہ کا ہاتھ
جھاڑیاں تھیں یا کہ سکھیاں تھیں قطار اندر قطار
نذر لائی تھیں پھلوں کی ڈالیاں پھولوں کے ہار

نازنیں شاخیں لچکتیں سرسراتیں جھومتیں
اپنے اپنے عکس کا منہ آئنے میں چومتیں
قمریاں تھیں بلبلیں تھیں سرو تھے شمشاد تھے
شاد تھے دونوں کنارے شاد تھے آباد تھے
پھول سے کانٹا حسین معلوم ہوتا تھا یہاں
سبزہ بیگانہ نہیں معلوم ہوتا تھا یہاں
میرے جی میں بس گئی اس کی سکوت افزا بہار
میں یہ سمجھا ہو گیا میرا مقدر سازگار
پاؤں پھیلا کر خنک ندی میں سر دُھننے لگا
آبجو کا نغمۂ جادُو اثر سننے لگا

اب ہوا محسوس یہ سارا جہاں نغمے کا ہے
یہ زمیں نغمے کی ہے یہ آسماں نغمے کا ہے
یہ عجب نغمہ تھا، اطمینان بخش و بے خروش
یہ عجب نشہ تھا جس میں کوئی بیتابی نہ جوش
محوِ گلگشت چمن پہنے ہوئے کلیوں کے ہار
نغمہ تھا، یا شام کی ٹھنڈی نسیمِ خوشگوار
نغمہ کیا تھا حدتِ خوں کے لیے برف آب تھا
یا تھکے ماندوں کی بستی میں نفیرِ خواب تھا

ہاں یہ نغمہ تھا لگی دل کی بجھانے کے لیے
برف بن بن کر رگوں میں بیٹھ جانے کے لیے
نغمہ خواب آور تھا نیند آنے لگی میں سو گیا
اپنی منزل بھول کر اس رنگ و بو میں کھو گیا
اصل میں ندی نہ میدانِ گل ولالہ تھا یہ
نغمۂ ٹیگور تھا یہ سحرِ بنگالہ تھا یہ
دیکھ کر نغمے کا یہ افسوں میں حیراں ہو گیا
میری جمعیت کا شیرازہ پریشاں ہو گیا
پھول تھے خوشبو تھی، نشہ تھا، فضا تھی میں نہ تھا
ساز کی دھڑکن تھی، نغمے کی صدا تھی میں نہ تھا
میری اپنی روح کے نغمے کی لے کم ہو گئی
قلب کو گرمانے والی کوئی شے کم ہو گئی
ہو گیا یخ بستہ میں بھی اور میرا ساز بھی
بیٹھ جائے دل تو اُٹھ سکتی نہیں آواز بھی
یاد مجھ کو اب وہ پہلی زندگی آنے لگی
یعنی اس افتاد سے شرمندگی آنے لگی
تازیانہ بن گیا بہرِ عمل یہ انفعال
دفعتاً پیدا ہوا خوداعتمادی کا خیال

جاگ اُٹھا میں اور کنارے ہی کنارے چل پڑا
سرنگوں ہارے ہوئے دل کے سہارے چل پڑا

چل رہے تھے پاؤں اپنے حال سے بے حال سے
خود بخود تھک جانے والی ڈگمگاتی چال سے

اِس طرح طے کر گیا میں سرحدِ ادراک بھی
میرا منہ تکنے لگی اب جرأتِ بیباک بھی

سامنے دیکھا ، تو اک دریا نظر آیا مجھے
میری منزل آ گئی ایسا نظر آیا مجھے

مِل گئی تھی جا کے دریا سے یہ پیاری جوئے آب
یعنی اپنے مدعا میں ہو گئی تھی کامیاب

یہ عروسِ فکرِ رنگیں بن سنور کر آئی تھی
دامن آبِ رواں میں پھول بھر کر لائی تھی

اِک محبت اِک مسرت کے نرالے جوش میں
لے لیا تھا بڑھ کے دریا نے اسے آغوش میں

پھر مرے ذوقِ عمل کو اک سہارا مل گیا
وہ کنارا مجھ سے چھوٹا یہ کنارا مل گیا

ہاں یہ دریا تھا مگر دریائے ناپیدا کنار
خوشنما ، پرہول ، نغمہ آفریں اور پروقار

سیل در آغوشِ سیل اور موج درِ آغوشِ موج
ہر طرف پرجوش لشکر ہر طرف پرجوش فوج
اندرونِ تہ سے لہر اُٹھتی ہوئی چڑھتی ہوئی
ولولوں کی طرح ہر سو پھیلتی بڑھتی ہوئی
تھے سکوں نا آشنا، لہریں بھی اور گرداب بھی
اپنی اپنی رو میں تھے طوفان بھی سیلاب بھی
ایک طوفانِ تلاطم ایک سیلابِ رواں
ظاہرا آبِ رواں باطن میں سیمابِ رواں
سازِ قدرت واصلِ مضراب تھا دریا نہ تھا
اِک مسلسل نغمۂ بیتاب تھا دریا نہ تھا
ہو گئی بیدار میرے نغمۂ ہستی کی گونج
قلب سے اُٹھی پرانے جوش و سرمستی کی گونج
جس طرح آ جائے پیاسا ساحلِ مطلوب پر
یا اچانک کوئی جا پہنچے درِ محبوب پر
اب یہ طوفانِ حیات افزا تھا میرے سامنے
نغمۂ اقبال کا دریا تھا میرے سامنے
درد کی چیخیں اُٹھیں میرے شکستہ ساز سے
آب دیدہ ہو گیا دریا میری آواز سے

میرا نغمہ ، نغمۂ دریا سے کم آواز تھا
ہاں مگر ہم رنگ و ہم آہنگ و ہم آواز تھا
ہوش نے چاہا کہ فکرِ خود فراموشی کروں
قطرہ ہوں دریا سے مل جاؤں ہم آغوشی کروں
اپنی ہستی کا ابھی تک تھا مگر دھوکا مجھے
شوق نے آگے بڑھایا ضبط نے روکا مجھے
لڑکھڑائے پائے ہمت عشق کے آداب میں
ایک لرزش سی ہوئی پیدا مرے اعصاب میں
کھینچنے کو دوڑ کر موجوں کی زنجیریں بڑھیں
روکنے کو حفظِ خودداری کی تدبیریں بڑھیں
یہ خودی یہ بے خودی یہ ضبط اور یہ اشتیاق
اِس طرح اُلجھے کہ آخر بن گئے دامِ فراق
مدعائے زیست حاصل ہوتے ہوتے رہ گیا
جزو اپنے کل سے واصل ہوتے ہوتے رہ گیا

جوہرِ ذاتی

مدتوں سے اشک کے سیلاب میں بہتا ہے دِل
سختیاں ہر موجِ طوفاں خیز کی سہتا ہے دِل

دل میں سب کچھ ہے مگر منہ سے نہیں کہتا ہے دِل
التجا کیسی ، دُعا سے محترز رہتا ہے دِل

حاجتیں لاکھوں ہیں لیکن مانگنے سے عار ہے
شکر کرتا ہوں کہ میرا دل بہت خوددار ہے

اپنے دامن میں لیا ہے بارگاہوں نے مجھے
اپنے پہلو میں بٹھایا بادشاہوں نے مجھے

بارہا تاکا ہے بخشش کی نگاہوں نے مجھے
اور پناہیں پیش کیں عالم پناہوں نے مجھے

رعب دولت کا مگر دل پر مرے چھایا نہیں
کچھ طلب کرنے کو میں نے ہاتھ پھیلایا نہیں

عرش کی رفعت لیے بیٹھا ہوں فرشِ خاک پر
سر مرا آسودہ ہے پائے رسولِ پاک پر

اہلِ زر ہنستے ہیں میرے دامن صد چاک پر
اور میں نازاں ہوں اپنی فطرت بیباک پر

میری فطرت نے دیا ہے جوہرِ ذاتی مجھے
دنیوی شاہوں کی مداحی نہیں آتی مجھے

درّۂ خیبر

نہ اس میں گھاس اُگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

کڑکتی بجلیوں کی اس جگہ چھاتی دہلتی ہے
گھٹا بچ کر نکلتی ہے ہوا تھرا کے چلتی ہے

یہ ناہموار چٹیل سلسلے کالی چٹانوں کے
امانت دار لافانی پرانی داستانوں کے

یہی پگڈنڈیاں نیرنگِ ہستی کی نظیریں ہیں
یہی تو قسمتِ اقوام کی خونیں لکیریں ہیں

یہ ذرّے رہرووں کی ہمتوں پر مسکراتے ہیں
زبانِ حال سے ماضی کے افسانے سناتے ہیں

یہ پتھر قافلے والوں کے ٹھکرائے ہوئے سے ہیں
کسی آتش قدم کی راہ میں آئے ہوئے سے ہیں

لیے بیٹھی ہیں یہ ویرانیاں محشر کے ہنگامے
ہیں اِن سنسانیوں میں دفن دنیا بھر کے ہنگامے

یہ بے آباد ، دہشت ناک وحشت خیز ویرانہ
ہے لاتعداد شور انگیز تہذیبوں کا افسانہ

اُنہی دشواریوں سے آریوں کا کارواں گزرا
زمینِ ہند پر جاتا ہوا اِک آسماں گزرا

اِسی رستے سے ہو کر ہنس اور اہلِ تتار آئے
کئی خانہ خراب آئے ، کئی آباد کار آئے

یہ مٹی شانِ اسکندر کی ہے آئینہ دار اب تک
اُسی آندھی کا باقی ہے یہاں گرد و غبار اب تک

اِسی تابش میں چمکی تھیں مسلمانوں کی شمشیریں
اِنہی فولاد کے دیووں سے ٹکرائی تھیں تکبیریں

فلک نے اس زمیں پر بارہا محمود کو دیکھا
بہادر غوریوں کے طالعِ مسعود کو دیکھا

اُڑی یہ خاک برسوں تک غبارِ کارواں ہو کر
فلک پر چھا گئی دلدوز آہوں کا دھواں ہو کر

اِسے تیمور نے روندا اسے بابر نے ٹھکرایا
مگر اس خاک کی عالی وقاری میں نہ فرق آیا

یہاں سے بارہا گزرے اتالے بارگاہوں کے
قدم چومے ہیں اِس مٹی نے اکثر بادشاہوں کے

کہاں اب وہ شکوہِ نادری اقبالِ ابدالی
لیا کرتے تھے جن سے سخت پتھر درسِ پامالی

یہ ہے وہ خارزار اس میں ہزاروں آبلے پھوٹے
نہیں ٹوٹے مگر یہ سنگدل کانٹے نہیں ٹوٹے

ہوائے درّۂ خیبر ہے محوِ انتظار اب بھی
کہ آ جائے کوئی رہوارِ وحشت پر سوار اب بھی

آخری رات

سیاہی بن کے چھایا شہر پر شیطان کا فتنہ
گناہوں سے لپٹ کر سو گیا انسان کا فتنہ

پناہیں حسن نے پائیں سیہ کاری کے دامن میں
وفاداری ہوئی رُوپوش ناداری کے دامن میں

میسر ہیں زری کے شامیانے خوش نصیبی کو
اُڑھا دی سایۂ دیوار نے چادر غریبی کو

مشقت کو سکھا کر خوبیاں خدمت گزاری کی
ہوئیں بے خوف بے ایمانیاں سرمایہ داری کی

لیا آغوش میں پھولوں بھری سیجوں نے امیری کو
مہیا خاک ہی نے کر دیے آسن فقیری کو

تڑپنا چھوڑ کر چپ ہو گئے جی ہارنے والے
مزے کی نیند سوئے تازیانے مارنے والے

وہ رُوحانی وہ جسمانی عقوبت کم ہوئی آخر
غلامی بیڑیوں کے بوجھ سے بے دم ہوئی آخر

ہوئے فریادیوں پر بند ایوانوں کے دروازے
کہ خود محتاجِ درباں ہیں جہانبانوں کے دروازے

اِسی انداز سے جا سوئی غفلت بادشاہوں کی
سرور و کیف بن کر چھا گئیں نیندیں گناہوں کی

شرابیں ختم کر کے ہو گئے خاموش ہنگامے
بالآخر نیند آئی سو گئے پُرجوش ہنگامے

تھا جب زندگی کا جوش پرخاشِ اجل جاگی
عمل کو دیکھ کر مدہوش پاداشِ عمل جاگی

اُٹھایا موت نے پتھر جہنم کے دہانے سے
جہاں آتش کا دریا کھولتا تھا اک زمانے سے

بلندی سے تباہی کے سمندر نے کیا دھاوا
چٹانوں کے جگر سے پھوٹ نکلا آتشیں لاوا

دکھادی آگ ایوانوں کو مظلومی کی آہوں نے
اُٹھائے شعلہ ہائے آتشیں بیکس نگاہوں نے

اُنھیں مختار بن کر بے کسی کے خون کی موجیں
حصارِ مرگ نے محصور کر لیں جنگ جو فوجیں

نہ حسن و عشق نے پائی اماں قہرِ الٰہی سے
دبی پاداش امیری سے فقیری سے نہ شاہی سے

ستاروں کی نگاہوں نے دُھواں اُٹھتا ہوا دیکھا
مگر خورشید نے کچھ بھی نہ مٹی کے سوا دیکھا

رقاصہ

اُٹھی ہے مغرب سے گھٹا پینے کا موسم آ گیا
ہے رقص میں اِک مہ لقا
نازک ادا ناز آفریں
ہاں ناچتی جا گائے جا نظروں سے دل برمائے جا
تڑپائے جا تڑپائے جا
او دُشمن دُنیا و دیں!
تیرا تھرکنا خوب ہے تیری ادائیں دل نشیں
لیکن ٹھہر تو کون ہے او نیم عریاں نازنیں
کیا مشرقی عورت ہے تو ہرگز نہیں ہرگز نہیں
تیری ہنسی بے باک ہے
تیری نظر چالاک ہے

اُف کس قدر دل سوز ہے تقریرِ بازاری تری
کتنی ہوس آموز ہے یہ سادہ پرکاری تری

شرم اور عزت والیاں
ہوتی ہیں عفت والیاں

وہ حسن کی شہزادیاں پردے کی ہیں آبادیاں
چشمِ فلک نے آج تک دیکھی نہیں اُن کی جھلک
سرمایۂ شرم و حیا زیور ہے اُن کے حسن کا
شوہر کے دُکھ سہتی ہیں وہ منہ سے نہیں کہتی ہیں وہ
کب سامنے آتی ہیں وہ غیرت سے کٹ جاتی ہیں وہ
اعزازِ ملت اُن سے ہے نامِ شرافت اُن سے ہے
ایمان پہ قائم ہیں وہ پاکیزہ و صائم ہیں وہ

تجھ میں نہیں شرم و حیا
تجھ میں نہیں مہر و وفا!

سچ سچ بتا تو کون ہے؟ او بے حیا تو کون ہے؟
احساسِ عزت کیوں نہیں شرم اور غیرت کیوں نہیں
یہ پرفسوں غمزے ترے نامحرموں کے سامنے
ہٹ سامنے سے دُور ہو مردُود ہو ، مقہور ہو
تقدیر کی ہیٹی ہے تو شیطان کی بیٹی ہے تو
جس قوم کی عورت ہے تو اُس قوم پر لعنت ہے تو

لیکن ٹھہر جانا ذرا
تیری نہیں کوئی خطا

مردوں میں غیرت ہی نہیں — قومی حمیت ہی نہیں
وہ ملتِ بیضا کہ تھی — سارے جہاں کی روشنی
جمعیتِ اسلامیاں — شاہنشہِ ہندوستاں
اب اس میں دم کچھ بھی نہیں — ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں
ملی سیاست اُٹھ گئی — بازُو کی طاقت اُٹھ گئی
شانِ حجازی اب کہاں — وہ ترکتازی اب کہاں
اب غزنوی ہمت گئی — اب بابری شوکت گئی
ایمان عالمگیر کا — مسلم کے دل سے اُٹھ گیا
قوم اب جفا پیشہ ہوئی — عزت گدا پیشہ ہوئی
اب رنگ ہی کچھ اور ہے — بے غیرتی کا دور ہے
یہ قوم اب مٹنے کو ہے — یہ نرد اب پٹنے کو ہے

افسوس یہ ہندوستاں!
یہ گلشنِ جنت نشاں!

ایمان داروں کا وطن — طاعت گزاروں کا وطن
رہ جائے گا ویرانہ پھر — بن جائے گا بت خانہ پھر
لیکن مجھے کیا خبط ہے — تقریر کیوں بے ربط ہے

ایسا بہک جاتا ہوں میں　　منہ آئی بک جاتا ہوں میں
اتنا شرابی ہو گیا　　عقل و خرد کو کھو گیا
مجھ کو زمانے سے غرض　　مٹنے مٹانے سے غرض!
ہندوستاں سے کام کیا　　اندیشۂ انجام کیا

جینے دو جینے دو مجھے
پینے دو پینے دو مجھے

جب حشر کا دن آئے گا　　اُس وقت دیکھا جائے گا
ہاں ناچتی جا گائے گا　　نظروں سے دل برمائے گا

تڑپائے جا تڑپائے جا
اور دشمنِ دنیا و دیں

کنجوس سرمایہ دار

آنکھیں اندھی، دل بھی اندھا، اندھی تیری قسمت بھی
قبر صفت گھر میں بھی اندھیرا، اندھی ہے یہ دولت بھی

ظالم تیرے ہاتھوں نے مسکینوں کے دل توڑے ہیں
ظلم کیے ہیں، حق چھینے ہیں، تب یہ پیسے جوڑے ہیں

لعنت دُنیا بھر کی تو نے خوب اکٹھی کر لی ہے
لاکھوں جیبیں خالی کر کے اپنی تھیلی بھر لی ہے

مال خزانہ پاس ہے تیرے لیکن اطمینان نہیں
اطمینان کہاں سے آئے، جب دل میں ایمان نہیں

یہ بے فیض خزانہ تیرا ، تیرے کام نہ آئے گا
تو نے دنیا کو ترسایا ، یہ تجھ کو ترسائے گا

چین تری تقدیر میں ہرگز او سرمایہ دار نہیں
مزدوروں کی چیخیں ہیں اشرفیوں کی کھنکار نہیں

تنہائی میں اندیشوں کے بھوت ستاتے ہیں تجھ کو
تیری دولت چھیننے والے ہاتھ ڈراتے ہیں تجھ کو

تھیلی کھول کے ہو جاتا ہے حال برا ہر بار ترا
کر دے گی یہ دولت آخر اک دن ''بیڑا پار'' ترا

رُومان

(۱)

صحنِ چمن کی اک سحر
آج بھی مجھ کو یاد ہے
دل پہ تو داغ ہے مگر
داغ سے دل بھی شاد ہے

چہرۂ شرق لال لال
جیسے ملا ہوا گلال
اور صبا کی نرم چال
رقص میں شاخِ ہر نہال
آج بھی ہے وہی خیال

آج بھی ہے مری نظر
نغمہ و رنگ سربسر
صحنِ چمن کی اِک سحر
آج بھی مجھ کو یاد ہے
دل پہ تو داغ ہے مگر
داغ سے دِل بھی شاد ہے

(۲)

حدِ نگاہ تک تمام
جزو سے کل ملا ہوا
سرخ ، سفید ، نیل فام
تختۂ گل کھلا ہوا

بلبل و گل کی داستان
حسن کی عشوہ کاریاں
عشق کی آہ و زاریاں
نہرِ چمن رواں دواں
سرو و سمن یہاں وہاں

برگ و ثمر کا انتظام
فطرتِ پختہ کار و خام

حدِ نگاہ تک تمام
جزو سے کل ملا ہوا
سرخ ' سفید ' نیل فام
تختۂ گل کھلا ہوا

(۳)

ہاں وہ عجیب تھا سماں
درد فزا و پُر سرور

آئی نظر جو ناگہاں.
تختۂ گل پہ ایک حور

آہ وہ پیکرِ شباب
آہ وہ رُوئے بے نقاب
ہائے شرارتی حجاب
وائے اشارتی عتاب
میرا ہی وہم تھا کہ خواب

یہ تو کہوں گا میں کہ ہاں
کچھ تو ضرور تھا وہاں

ہاں وہ عجیب تھا سماں
درد فزا و پُرسرور
آئی نظر جو ناگہاں
تختۂ گل پہ ایک حور

(۴)

جام بدست کائنات
لالہ فروش ہر طرف
حسن پرست شش جہات
دوش بدوش صف بہ صف

موجِ شمیم عطر بیز
فوج نسیم تیز تیز

ولولے انبساط خیز
ہر زرِ گل نشاط ریز
ایک عروس کا جہیز

اور دُلھن وہ ایک ذات
جس کے جلو میں یہ برات

جام بدست کائنات
لالہ فروش ہر طرف
حسن پرست شش جہات
دوش بدوش صف بہ صف

(۵)

آنکھوں میں بجلیاں مگر
اُن کے اثر سے بے خبر
جنبش سر سے بے خبر
سحرِ نظر سے بے خبر
مکر نہیں ، ریا نہیں
ظلم نہیں ، جفا نہیں
نازشِ ناروا نہیں
سازشِ فتنہ زا نہیں
یہ بھی خبر ذرا نہیں

کس پہ پڑی ہے یہ نظر
برق گری کدھر کدھر

آنکھوں میں بجلیاں مگر
اُن کے اثر سے بے خبر
جنبشِ سر سے بے خبر
سحرِ نظر سے بے خبر

(٦)

جب وہ خرامِ ناز سے
ایک روش پہ مڑ گئی
دامنِ گل بھرے ہوئے
سبز پری تھی اُڑ گئی

لے گئی دولتِ قرار
کرگئی ہوش کو شکار
چھوڑ گئی بہ حالِ زار
آنکھ کو محوِ انتظار
دل کو نظر سے شرمسار

شوخیٔ بے نیاز سے
عشوۂ پاک باز سے

جب وہ خرامِ ناز سے
ایک روش پہ مڑ گئی
دامنِ گل بھرے ہوئے
سبز پری تھی اُڑ گئی

عرفان

(۱)

تاریکیِ شب کافور ہوئی
مشرق کی جبیں پرنور ہوئی

خورشیدِ نویدِ تاباں کا
اُمید کے غرفے سے جھانکا

بیداریِ قسمت کے پرچم
لہرانے لگے میناروں پر
پھر ہونے لگی بارانِ کرم
اِن سوکھے ہوئے گلزاروں پر

کی دستِ صبا نے زبردستی
جاگ اٹھی سوئی ہوئی ہستی

بسنے لگی ہر اُجڑی بستی
ذلت سے اُبھری ہر پستی

(۲)

دل غفلت سے بیزار ہوئے
انگڑائیاں لیں بیدار ہوئے

انسانوں کے لشکر جاگے
طوفان اُٹھے محشر جاگے

ارمانوں کی لہریں جاگیں
شریانوں میں نہریں جاگیں
سرگرمی اور ہل چل جاگی
بیکل ہو کر ہر کل جاگی

وقت آیا کار گزاری کا
اک شور اُٹھا بیداری کا
آزادی کی سرشاری کا
سرداری کا مختاری کا

تاریکیِ شب کافور ہوئی
مشرق کی جبیں پرنور ہوئی

(۳)

ہر ملت کے ارماں جاگے
ہر علت کے درماں جاگے

طاقت کے شکاری اُٹھ بیٹھے
بہرِ سرداری اُٹھ بیٹھے

تدبیروں کے ہل جوتے ہیں
قوموں نے شور زمینوں میں
افسوس ہم اب تک سوتے ہیں
احساس نہیں اِن سینوں میں

اِس جسم میں جاں بیتاب نہیں
دریا ہے، موجِ آب نہیں

دِل درد سے لذت یاب نہیں
افسوس یہ موت ہے خواب نہیں

یہ قافلۂ آرام طلب
سوتا ہے راہ میں ہائے غضب

(۴)

یہ گھاٹی سخت ہے راہ کٹھن
ہر سمت کمیں میں ہیں رہزن
اے کاش یہ نیندوں کے ماتے
آوازِ جرس کو سن پاتے
اے کاش جگا دے کوئی انھیں
ٹھوکر ہی لگا دے کوئی انھیں

اے سونے والو جاگ اُٹھو
دنیا سے نرالو جاگ اٹھو
اب ہوش سنبھالو جاگ اُٹھو
یوں وقت نہ ٹالو جاگ اُٹھو

ہر ملت کے ارماں جاگے
ہر ملت کے درماں جاگے

تکیہ

امارت اور شوکت اور سرمائے کی تصویریں
یہ ایوانات سب ہیں حال ہی کی تازہ تعمیریں

اُدھر کچھ فاصلے پر چند گھر تھے کاشتکاروں کے
جہاں اب کارخانے بن گئے سرمایہ داروں کے

مویشی ہو گئے نیلام کیوں یہ کوئی کیا جانے
کچہری جانے، ساہوکار جانے یا خدا جانے

زمینداروں کو جا کر دیکھ لے جو بھی کوئی چاہے
نئے بھٹوں میں اینٹیں تھاپتے پھرتے ہیں ہلواہے

یہاں اپنے پرانے گاؤں کا اب کیا رہا باقی
یہی تکیہ یہی اک میں یہی اک جھونپڑا باقی

عظیم الشان بستی ہے یہ نو آباد ویرانہ
یہاں ہم اجنبی دونوں ہیں میں اور میرا کاشانہ

غزلیات(۱)

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم

(۱) عنوان ـــــ از مرتب

○

وہ سرخوشی دے، کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے

حقیقتیں آشکار کر دے ، صداقتیں بے حجاب کر دے
ہر ایک ذرّہ یہ کہہ رہا ہے کہ آ مجھے آفتاب کر دے

یہ خوب کیا ہے، یہ زشت کیا ہے جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے؟
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

کہو تو رازِ حیات کہہ دوں حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں ، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں خدا اگر کامیاب کردے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کرلے مری سزا کا حساب کردے

حفیظ سب سے بڑی خرابی ہے عشق میں لطفِ کامیابی
کسی کی دنیا تباہ کردے، کسی کی عقبےٰ خراب کردے

○

ایسا سبق مرے رفقا دے گئے مجھے
اپنے لہو کے گھونٹ مزا دے گئے مجھے
یعنی میں نامراد بھی ہوں بے وقوف بھی
کچھ اس طرح وہ دادِ وفا دے گئے مجھے
آخر طبیب نے بھی اُنہی سے کیا رجوع
وہ آئے مسکرائے شفا دے گئے مجھے
وہ مجھ سے آج عہدِ وفا لینے آئے تھے
جاتے ہوئے فریبِ وفا دے گئے مجھے
جن سے کوئی اُمید نہ تھی اُن سے کیا اُمید
جن سے اُمید تھی وہ دغا دے گئے مجھے
فرما گئے بزرگ کہ ''عمرت دراز باد''
میری شرارتوں کی سزا دے گئے مجھے

○

وفاداریاں سخت نادانیاں ہیں
کہ ان کے نتیجے پشیمانیاں ہیں
پشیمانیاں ہیں گناہوں پہ لیکن
بڑے ہی مزے کی پشیمانیاں ہیں
مری زندگی پر تعجب نہیں تھا
مری موت پر اُن کو حیرانیاں ہیں
محبت کرو اور نباہو تو پوچھوں
یہ دُشواریاں ہیں کہ آسانیاں ہیں
ندامت ہوئی حشر میں جن کے بدلے
جوانی کی دو چار نادانیاں ہیں
مرا تجربہ ہے کہ اس زندگی میں
پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں

○

حسن نے سیکھیں غریب آزاریاں
عشق کی مجبوریاں لاچاریاں

بہ گیا دل حسرتوں کے خون میں
لے گئیں بیمار کو بیماریاں

سوچ کر غم دیجیے ، ایسا نہ ہو
آپ کو کرنی پڑیں غمخواریاں

دار کے قدموں میں بھی پہنچی نہ عقل
عشق ہی کے سر رہیں سرداریاں

اِک طرف جنسِ وفا قیمت طلب
اِک طرف میں اور مری ناداریاں

ہوتے ہوتے جان دوبھر ہو گئی
بڑھتے بڑھتے بڑھ گئیں بیزاریاں

تم نے دُنیا ہی بدل ڈالی مری
اب تو رہنے دو یہ دُنیا داریاں

○

مل جائے مے تو سجدۂ شکرانہ چاہیے
پیتے ہی ایک لغزشِ مستانہ چاہیے

ہاں احترامِ کعبہ و بت خانہ چاہیے
مذہب کی پوچھیے تو جداگانہ چاہیے

رندانِ مے پرست سیہ مست ہی سہی
اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیے

دیوانگی ہے عقل نہیں ہے کہ خام ہو
دیوانہ ہر لحاظ سے دیوانہ چاہیے

اس زندگی کو چاہیے سامانِ زندگی
کچھ بھی نہ ہو تو شیشہ و پیمانہ چاہیے

او ننگِ اعتبار دُعا پر نہ رکھ مدار
او بے وقوف ، ہمتِ مردانہ چاہیے

رہنے دے جامِ جم مجھے انجامِ جم سنا
کھل جائے جس سے آنکھ وہ افسانہ چاہیے

○

میرے خیال و خواب کی دُنیا لیے ہوئے
پھر آ گیا کوئی رُخِ زیبا لیے ہوئے

پھر دل میں آ بسی ہے کسی انجمن کی یاد
اُجڑے ہوئے بہشت کا نقشا لیے ہوئے

یہ کم نگاہیاں ہیں تو پھر کس اُمید پر
بیٹھا رہوں فریبِ تمنا لیے ہوئے

دل گیسوئے بتاں میں اُلجھ کر نہ گر پڑے
اُٹھا تو ہے خدا کا سہارا لیے ہوئے

اُس فتنہء شباب کا عالم نہ پوچھیے
اِک حشر اُٹھ رہا ہے تماشا لیے ہوئے

حسرت برس رہی ہے، رُخِ نامراد پر
یہ کون جا رہا ہے تمنا لیے ہوئے

آئی ہے بے حیا مرا ایماں خریدنے
دُنیا کھڑی ہے دولتِ دنیا لیے ہوئے

گو آج تک کسی سے توقع نہ تھی حفیظ
پھرتا ہوں اِک جہان کا شکوہ لیے ہوئے

○

نہ کر دل جوئی اے صیاد میری
کہ فطرت ہے بہت آزاد میری

اسیری سے رہائی پانے والو
تمھیں پہنچے مبارک باد میری

سہارا کیوں لیا تھا ناخدا کا
خدا بھی کیوں کرے امداد میری

بھلا دو مجھ کو لیکن یاد رکھنا
ستائے گی تمھیں بھی یاد میری

فرشتے کیا مرتب کر سکیں گے
بہت بے ربط ہے روداد میری

پسند آنے لگی تھی سربلندی
یہی تھی اوّلیں افتاد میری

کیا پابند نے نالے کو میں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

مرے اشعار پر چپ رہنے والے
ترے حصے میں آئی داد میری

قضا کا ظلم حد سے بڑھ گیا ہے
کوئی سنتا نہیں فریاد میری

خدا وندا قضا نے چھین لی ہے
مرے آغوش سے ارشاد میری

○

خرد مند و خرد سے دُور ہوں میں
بہت خوش ہوں بہت مسرور ہوں میں

مری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو
کہ جینے کے لیے مجبور ہوں میں

جلاتے ہو مجھے کیوں چشمکوں سے
نہ موسیٰ ہوں نہ سنگِ طور ہوں میں

نہیں کرتا عزیزوں کی شکایت
عزیزو ہاں بہت مغرور ہوں میں

مجھے سمجھا رہے ہو ، جاؤ جاؤ
شہیدِ سعیِ نامشکور ہوں میں

مری دُنیا کا سرمایہ ہے عقبےٰ
بڑی تنخواہ کا مزدور ہوں میں

کسی نے بھی نہ پہچانا وطن میں
میں سمجھا تھا بہت مشہور ہوں میں

مجھے کردو غریقِ حوضِ کوثر
خرابِ بادۂ انگور ہوں میں

○

نہ دردِ محبت نہ جوشِ جوانی
یہ جنت ہے، تو ہائے دُنیائے فانی

تو پھر آ گئی گردشِ آسمانی
بڑی مہربانی! بڑی مہربانی!!

سناتا ہے کیا حیرت انگیز قصے
حسینوں میں کھوئی ہو جس نے جوانی

نظر اور ذوقِ نظر دینے والے
عجب شے بنادی ہے دُنیائے فانی

نصیحت سے روکا بہت ناصحوں کو
کسی نے ہماری نصیحت نہ مانی

تسلی دیئے جاؤ نادان دل کو
کئے جاؤ باتیں زبانی زبانی

حفیظ اپنی بولی محبت کی بولی
نہ اُردو نہ ہندی نہ ہندوستانی

○

گنہ کے بعد بشر عجز اختیار کرے
خدا کی شانِ کریمی پر اعتبار کرے
نہ دلدہی نہ تسلی ، نہ وعدہ ہے نہ وفا
تمھی کہو تمھیں کس دل سے کوئی پیار کرے
خداپرست وہی ہے، جو اس زمانے میں
بتوں پہ جان بھی ایمان بھی نثار کرے
فغاں کے واسطے ذوقِ سلیم ہے درکار
یہ جس کے پاس نہ ہو صبر اختیار کرے

○

نگاہِ آرزو آموز کا چرچا نہ ہو جائے
شرارت سادگی ہی میں کہیں رُسوا نہ ہو جائے

اُنہیں احساسِ تمکیں ہو کہیں ایسا نہ ہو جائے
جو ہونا ہو، ابھی اے جرأتِ رندانہ ہو جائے

بظاہر سادگی سے مسکرا کر دیکھنے والو
کوئی کمبخت ناواقف اگر دیوانہ ہو جائے

بہت ہی خوب شے ہے اختیاری شانِ خودداری
اگر معشوق بھی کچھ اور بے پردا نہ ہو جائے

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے

الٰہی دل نوازی پھر کریں وہ مے فروش آنکھیں
الٰہی اتحادِ شیشہ و پیمانہ ہو جائے

مری اُلفت تعجب ہو گئی، توبہ معاذ اللہ
کہ منہ سے بھی نہ نکلے بات اور افسانہ ہو جائے

یہ تنہائی کا عالم، چاند تاروں کی یہ خاموشی!
حفیظ اب لطف ہے، اک نعرۂ مستانہ ہو جائے

○

نا آشنا نہیں رہ و رسمِ جہاں سے ہم
لائیں مگر فریب کی صورت کہاں سے ہم
یہ اعترافِ عجز بھی معیوب ہے تو خیر
چپ ہو رہیں گے، کچھ نہ کہیں گے زباں سے ہم
ہاں اِس لیے کہ خاک کا رُتبہ بلند ہو
مٹ مٹ گئے دبے نہ مگر آسماں سے ہم
اغیار کی بھی آؤ بھگت خوب یاد ہے
اُس روز خوش ہوئے تھے بہت پاسباں سے ہم
اے زندگی سپردِ خدا کر دیا تجھے
بے فکر ہو گئے ترے سود و زیاں سے ہم
وہ رُوحِ زندگی نہیں شرمندگی سہی
خالی نہ جائیں گے درِ پیرِ مغاں سے ہم

○

زندگی کا لطف بھی آ جائے گا | زندگانی ہے تو دیکھا جائے گا
جس طرح لکڑی کو کھا جاتا ہے گھن | رفتہ رفتہ غم مجھے کھا جائے گا
حشر کے دن میری چپ کا ماجرا | کچھ نہ کچھ تم سے بھی پوچھا جائے گا
مسکرا کر، منہ چڑا کر، گھور کر | جا رہے ہو خیر دیکھا جائے گا
کر دیا ہے تم نے دل کو مطمئن | دیکھ لینا سخت گھبرا جائے گا
حضرت دل کام سے جاؤں گا میں | دل لگی میں آپ کا کیا جائے گا

دوستوں کی بے وفائی پر حفیظ
صبر کرنا بھی مجھے آ جائے گا

○

اُمیدیں مٹ گئیں آخر ہجومِ یاس و حرماں میں
یہ فتنے سو گئے نیند آ گئی آغوشِ طوفاں میں

بڑھا دے کشتیِ مے ہرچہ بادا باد اے ساقی
خدا کے آسرے پر چھوڑ دے دریائے عصیاں میں

مری آنکھیں ہیں آزادی کی دو بے رنگ تصویریں
لگی ہیں مدتوں سے روزنِ دیوارِ زنداں میں

خیال و خواب کا ہنگامہ ہے یا اور بھی کچھ ہے
یہ نور و نار کا جھگڑا ہے کیا گبر و مسلماں میں

وہی اِک نالۂ ماتم وہی اک نغمۂ شادی
کبھی صیاد کے گھر میں کبھی صحنِ گلستاں میں

کسی زلفِ مسلسل کی حکایت چھیڑ اے ناصح
کہیں تو ربط پیدا کر خیالاتِ پریشاں میں

اِدھر صیاد پھرتے ہیں ، اُدھر صیاد پھرتے ہیں
بہار آئی گلستاں میں ، بہار آئی گلستاں میں

مجھے بھی تک رہی ہیں اب وہ آنکھیں جن کے جادو سے
غزالانِ حرم آوارہ ہیں کوہ و بیاباں میں

بری ساعت میں جاگا تھا یہ فتنہ حسن و الفت کا
کہ برپا ہے قیامت آج تک دُنیائے انساں میں

بہت آغاز دیکھے ہیں بہت انجام دیکھے ہیں
کئی عبرت کی تصویریں کھنچی ہیں چشم حیراں میں

جنوں کی اب نہ پوچھو بس یہ سمجھو سانس لیتا ہوں
یہی اِک تار باقی ہے گریبانِ رگِ جاں میں

○

اے دوست مٹ گیا ہوں ، فنا ہو گیا ہوں میں
اس دردِ دوستی کی دوا ہو گیا ہوں میں

قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دُنیا سمجھ رہی ہے فنا ہو گیا ہوں میں

ہنسنے کا اعتبار نہ رونے کا اعتبار
یہ زندگی ہے جس پہ فدا ہو گیا ہوں میں

ہمت بلند تھی ، مگر افتاد دیکھنا
چپ چاپ آج محوِ دعا ہو گیا ہوں میں

نا آشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست
کمبخت جانتے نہیں کیا ہو گیا ہوں میں

یہ زندگی فریبِ مسلسل نہ ہو کہیں
شاید اسیرِ دامِ بلا ہو گیا ہوں میں

اُٹھا ہوں اِک جہانِ خموشی لیے ہوئے
ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا ہو گیا ہوں میں

ہاں کیفِ بیخودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا خدا ہو گیا ہوں میں

○

مٹنے والی حسرتیں ایجاد کر لیتا ہوں میں
جب بھی چاہوں اِک جہاں آباد کر لیتا ہوں
مجھ کو اِن مجبوریوں پر بھی ہے اتنا اختیار
آہ بھر لیتا ہوں میں فریاد کر لیتا ہوں میں
حسن بے چارہ تو ہو جاتا ہے اکثر مہرباں
پھر اسے آمادۂ بیداد کر لیتا ہوں میں
تو نہیں کہتا ، مگر دیکھ او وفا نا آشنا
اپنی ہستی کس قدر برباد کر لیتا ہوں میں
ہاں یہ ویرانہ ، یہ دل ، یہ آرزوؤں کا مزار
تم کہو تو پھر اسے آباد کر لیتا ہوں میں
جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظ
ایک عادت ہے خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

○

ہے ازل کی اس غلط بخشی پہ حیرانی مجھے
عشق لافانی ملا ہے زندگی فانی مجھے

میں وہ بستی ہوں کہ یادِ رفتگاں کے بھیس میں
دیکھنے آتی ہے اب میری ہی ویرانی مجھے

تھی یہی تمہید میرے ماتمی انجام کی
پھول ہنستے ہیں تو ہوتی ہے پشیمانی مجھے

حسن بے پردہ ہوا جاتا ہے یارب کیا کروں
اب تو کرنی ہی پڑی دل کی نگہبانی مجھے

باندھ کر روزِ ازل شیرازۂ مرگ و حیات
سونپ دی گویا دو عالم کی پریشانی مجھے

پوچھتا پھرتا تھا داناؤں سے اُلفت کے رموز
یاد اب رہ رہ کے آتی ہے وہ نادانی مجھے

○

محبت کی دُنیا میں سب کچھ حسیں ہے
محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

کہیں زیر دستوں کو راحت نہیں ہے
نہ زیرِ فلک ہے نہ زیرِ زمیں ہے

قدم اُس کے چوموں، جو اتنا بتا دے
ترا سنگِ در ہے، کہ میری جبیں ہے

جزا و سزا نیتوں پر ہے زاہد
مجھے بھی یقیں ہے تجھے بھی یقیں ہے

گلوں کا تبسم عنادل کا نغمہ
بہار آفریں ہے کہ درد آفریں ہے

○

اُس شوخ نے نگاہ نہ کی ہم بھی چپ رہے
ہم نے بھی آہ آہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

آیا نہ اُن کو عہدِ ملاقات کا لحاظ
ہم نے بھی کوئی چاہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

دیکھا کئے ہماری طرف بزمِ غیر میں
تجدیدِ رسم وراہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

تھا زندگی سے بڑھ کے ہمیں وضع کا خیال
جب عمر نے نباہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

خاموش ہو گئیں جو اُمنگیں شباب کی
پھر جرأتِ گناہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

مغرور تھا کمالِ سخن پر بہت حفیظ
ہم نے بھی واہ واہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

○

سمجھا ہوا ہوں شومیِ دستِ دعا کو میں
کچھ روز اور دیکھ رہا ہوں خدا کو میں
ثابت قدم رہوں کہ تلاطم کا ساتھ دوں
ساحل کے رُخ تو لا نہ سکوں گا ہوا کو میں
کشتی خدا پہ چھوڑ کے بیٹھا ہے مطمئن
دریا میں پھینک دوں نہ کہیں ناخدا کو میں
انسان ہوں خطائے وفا بخش دیجیے
بس کیجیے، پہنچ تو چکا ہوں سزا کو میں
مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لیے ہوئے دامِ وفا کو میں

○

ابھی چاہتا ہوں بہت روز جینا
بہار آفرینا! خزاں آفرینا!
عبادت کی لذت نہ جی بھر کے پینا
یہ کیا زندگی ہے نہ مرنا نہ جینا
مجھے یاد ہے اپنا انجام ناصح
میں اک روز مر جاؤں گا بس یہی نا!
تنزل کی حد دیکھنا چاہتا ہوں
کہ شاید وہیں ہو ترقی کا زینا
مرے ڈوب جانے کا باعث تو پوچھو
کنارے سے ٹکرا گیا تھا سفینہ

○

کل ضرور آؤ گے، لیکن آج کیا کروں
بڑھ رہا ہے قلب کا اختلاج کیا کروں؟
کیا کروں کوئی نہیں احتیاج دوست کو
اور مجھ کو دوست کی احتیاج کیا کروں
اب وہ فکر مند ہیں کہہ دیا طبیب نے
عشق ہے جنوں نہیں میں علاج کیا کروں
غیرتِ رقیب کا شکوہ کر رہے ہو تم
اس معاملے میں سخت ہے مزاج کیا کروں
ماسوائے عاشقی اور کچھ کیا بھی ہو
سوجھتا ہی کچھ نہیں کام کاج کیا کروں
محو کارِ دیں ہوں میں، بوریا نشیں ہوں میں
راہزن نہیں ہوں میں تخت و تاج کیا کروں
زور اور زر بغیر عشق کیا کروں حفیظ
چل گیا ہے ملک میں یہ رواج کیا کروں

○

ملا بھی درد بھرا دل تو کیا ، ملا نہ ملا
ترس کے عمر کٹی درد آشنا نہ ملا

اُٹھو صنم کدے والو تلاش لازم ہے
اِدھر ہی لوٹ پڑیں گے اگر خدا نہ ملا

کرم کیا دلِ بے مدعا دیا تو نے
ترے کرم کا مگر کوئی مدعا نہ ملا

تمام زادِ سفر راستے میں لٹ جاتا
خدا نے فضل کیا کوئی رہنما نہ ملا

رسن کو توڑ کے بھاگے ہیں قیدیانِ بلا
وفا تلاش میں نکلی کہیں پتا نہ ملا

بتوں نے عشق دیا، وہ بھی لاعلاج مرض
خدا سے درد بھی مانگا تو لا دوا نہ ملا

برنگِ شعلہ اڑا ہے مرے شباب کا رنگ
شرابِ تند ملی تھی مگر مزا نہ ملا

○

اُن کو جگر کی جستجو ، اُن کی نظر کو کیا کروں
مجھ کو نظر کی آرزو اپنے جگر کو کیا کروں

رات ہی رات میں تمام طے ہوئے عمر کے مقام
ہو گئی زندگی کی شام اب میں سحر کو کیا کروں

وحشتِ دل فزوں تو ہے حال مرا زبوں تو ہے
عشق نہیں جنوں تو ہے اس کے اثر کو کیا کروں

فرش سے مطمئن نہیں ، پست ہے ناپسند ہے
عرش بہت بلند ہے ، ذوقِ نظر کو کیا کروں

ہائے کوئی دوا کرو ، ہائے کوئی دُعا کرو
ہائے جگر میں درد ہے ، ہائے جگر کو کیا کروں

اہل نظر کوئی نہیں ، اِس لیے خود پسند ہوں
آپ ہی دیکھتا ہوں میں اپنے ہنر کو کیا کروں

ترکِ تعلقات پر گر گئی برقِ التفات
راہگزر میں مل گئے ، راہگزر کو کیا کروں

حیاتِ جاوداں والے نے مارا — زباں دے کر زباں والے نے مارا

بشر کو اس قفس میں تنگ کر کے — زمین و آسماں والے نے مارا

نگاہیں کام دیتی ہیں نہ راہیں — مکان و لامکاں والے نے مارا

گوارا ہے دوامی تلخ کامی — کسی میٹھی زباں والے نے مارا

نصیحت گر کو سمجھاؤ خدارا — کہ اِس سود و زیاں والے نے مارا

کوئی حد بھی ہے تسلیم و رضا کی — مسلسل امتحاں والے بنے مارا

وہ دل میں ہے دل آنکھوں میں نہاں ہے — نشاں دے کر نشاں والے نے مارا

سوئے منزل لیے جاتا ہے ظالم — ہمیں اس کارواں والے نے مارا

ہمیشہ کے لیے خاموش ہو کر — نئی طرزِ فغاں والے نے مارا

مجھے کم ظرف کہلانا پڑے گا
متاعِ دوجہاں والے نے مارا

○

چاند اور ستاروں کا یہ سماں کیا دلکش اور سہانا ہے
افسوس مجھے نیند آئی ہے افسوس مجھے سو جانا ہے
اک روز مجھے اس کوچے میں ناصح کو لیکر جانا ہے
کچھ دل کو راہ پہ لانا ہے کچھ دلبر کو سمجھانا ہے
معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے
دل شیشہ بنے پیمانہ بنے ہم دل کی حقیقت جانتے ہیں
بے رنگ سا اک قطرہ ہے جسے آنسو بن کر بہ جانا ہے
بازار نیا گاہک بھی نئے اب جنسِ وفا کی قدر نہیں
بے سود نمائش رہنے والے اے دل یہ مال پرانا ہے
اے طائرِ جاں کچھ روز ابھی اُڑنے کی ہوس میں رہنا ہے
اس تنگ قفس میں رہنا ہے دُکھ سہنا ہے غم کھانا ہے

○

جب سے دیکھا ہے جل مرنا ننھی ننھی جانوں کا
شمع کا پروانہ نہ سہی پروانہ ہوں پروانوں کا

یہ دامن ہے یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

سر کو سر اَفرازی دے کر سجدوں پر مامور کیا
سر دے کر بھی ہو نہ سکے گا بدلہ اِن احسانوں کا

محشر والوں نے بھی مجھ کو شاعر کہہ کر چھوڑ دیا
میری فردِ عمل کو سمجھے مجموعہ افسانوں کا

ایسی جنس فراہم کر لی جس کا گاہک کوئی نہیں
لادے لادے پھرتا ہوں اب پشتارا ارمانوں کا

لے چل ہاں منجدھار میں لے چل ساحل ساحل کیا چلنا
میری اتنی فکر نہ کر میں خوگر ہوں طوفانوں کا

بیڑا پار لگانے والے میرا منہ کیوں تکتا ہے
میں تو ساحل پر رہ کر بھی خوگر تھا طوفانوں کا

○

کیا ہو گئیں وہ عہدِ فراغت کی مستیاں
وہ دوستوں کی بزم وہ بادہ پرستیاں
آخر شکست کھا کے گرا پہلوانِ شوق
افکار کی چلیں وہ زبردست دستیاں
پیاروں کی موت نے مری دُنیا اُجاڑ دی
یاروں نے دُور جا کے بسائی ہیں بستیاں
جن سے خیال میں بھی جدائی نہ تھی پسند
وہ خواب ہو گئی ہیں خیالوں کی ہستیاں
ٹوٹے پڑے ہیں آج قرابے شراب کے
کیا جلد اُتر گئیں مرے نشوں کی مستیاں
کب تک اُٹھیں گے بہر دُعا دستِ التجا
آخر بلند ہو کے رہیں گی یہ پستیاں

○

دل کو ویرانہ کہو گے ، مجھے معلوم نہ تھا
پھر بھی دل ہی میں رہو گے مجھے معلوم نہ تھا

ساتھ دنیا کا میں چھوڑوں گا تمھاری خاطر
اور تم ساتھ نہ ہو گے ، مجھے معلوم نہ تھا

چپ جو ہوں، کوئی بری بات ہے میرے دل میں
تم بھی یہ بات کہو گے ، مجھے معلوم نہ تھا

لوگ روتے ہیں میری بدنظری کا رونا
تم بھی اِس رو میں بہو گے، مجھے معلوم نہ تھا

تم تو بے صبر تھے آغازِ محبت میں حفیظ
اس قدر جبر سہو گے ، مجھے معلوم نہ تھا

تلخابۂ شیریں

غزلیات(۱)

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

صفیؔ

کارِ مغاں یہ قند کا شربت بیچنے والے کیا جانیں
تلخی و مستی بھی ہے غزل میں خالی رس کی بات نہیں

حفیظؔ

---

(۱) عنوان۔ از مرتب

○

تو ہی بھروسا تو ہی سہارا
پروردگارا ! پروردگارا !

منظور منظور اے اہلِ دُنیا
اللہ میرا ' باقی تمھارا

یوں میں نے جیتی اُلفت کی بازی
اک بار کھیلا ' سو بار ہارا

حاضر ہوں میں بھی، حاضر ہے دل بھی
دل بھی تمھارا ' میں بھی تمھارا

یہ ناخدا ہے اے اہلِ کشتی!
شاید کسی وقت کر لے کنارا

سیراب کر دے دُنیا میں ساقی
عقبیٰ کی تلخی مجھ کو گوارا

روئے فلک پر چھائی سفیدی
چمکا ہے شاید میرا ستارا

آنکھوں میں آنسو' لب پر تبسم
ان کا تصور ' اپنا نظارا

جینا پڑے گا اے جانِ شیریں
کرنا پڑے گی تلخی گوارا

مٹی کے پتلے کیا چاہتا ہے
بختِ سکندر یا تختِ دارا

عفو و خطا میں ضد ہو گئی تھی
وہ بھی نہ ہارے میں بھی نہ ہارا

پھر یہ جہنم کس کے لیے ہے
آمرز گارا ! آمرز گارا !

○

ہم ہیں میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمھیں بھلا سکے

تم ہی نہ سن سکے اگر، قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زباں کھلے گی پھر ہم نہ اگر سنا سکے

ہوش میں آ چکے تھے ہم، جوش میں آ چکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اُٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں
دِل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے

شوقِ وصال ہے یہاں لب پہ سوال ہے یہاں
کس کی مجال ہے یہاں ہم سے نظر ملا سکے

اَیسا ہو کوئی نامہ بر، بات پہ کان دھر سکے
سن کے یقین کر سکے جا کے انھیں سنا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برہمیِ مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست جس کی سمجھ میں آ سکے

اہلِ زباں تو ہیں بہت کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظؔ درد کے گیت گا سکے

جوانی کے ترانے گا رہا ہوں
دبی چنگاریاں سلگا رہا ہوں

مری بزمِ وفا سے جانے والو
ٹھہر جاؤ کہ میں بھی آ رہا ہوں

بتوں کو قول دیتا ہوں وفا کا
قسم اپنے خدا کی کھا رہا ہوں

وفا کا لازمی تھا یہ نتیجہ
سزا اپنے کیے کی پا رہا ہوں

خدا لگتی کہو بت خانے والو
تمھارے ساتھ میں کیسا رہا ہوں

زہے وہ گوشۂ راحت کہ جس میں
ہجومِ رنج لے کر جا رہا ہوں

چراغِ خانۂ درویش ہوں میں
اِدھر جلتا اُدھر بجھتا رہا ہوں

نئے کعبے کی بنیادوں سے پوچھو
پرانے بتکدے کیوں ڈھا رہا ہوں

نہیں کانٹے بھی کیا اُجڑے چمن میں
کوئی روکے مجھے میں جا رہا ہوں

ہوئی جاتی ہے کیوں بے تاب منزل
مسلسل چل رہا ہوں، آ رہا ہوں

حفیظؔ اپنے پرائے بن رہے ہیں
کہ میں دل کو زباں پہ لا رہا ہوں

○

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں　　وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

بہ حالِ گمرہی پایا گیا ہوں　　حرم سے دیر میں لایا گیا ہوں

بلا کافی نہ تھی اِک زندگی کی　　دوبارہ یاد فرمایا گیا ہوں

برنگِ لالۂ ویرانہ بے کار　　کھلایا اور مرجھایا گیا ہوں

اگرچہ ابرِ گوہر بار ہوں میں　　مگر آنکھوں سے برسایا گیا ہوں

سپردِ خاک ہی کرنا ہے مجھ کو　　تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہوں

فرشتے کو نہ میں شیطان سمجھا　　نتیجہ یہ کہ بہکایا گیا ہوں

کوئی صنعت نہیں مجھ میں تو پھر کیوں　　نمائش گاہ میں لایا گیا ہوں

بقولِ برہمن قہرِ خدا ہوں　　بتوں کے حسن پر ڈھایا گیا ہوں

مجھے تو اس خبر نے کھو دیا ہے　　سنا ہے میں کہیں پایا گیا ہوں

حفیظؔ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

○

مرے مذاق سخن کو سخن کی تاب نہیں
سخن ہے نالۂ دِل نغمۂ رُباب نہیں
اگر وہ فتنہ کوئی فتنۂ شباب نہیں
تو حشر میرے لیے وجہِ اضطراب نہیں
نہیں ثواب کی پابند بندگی میری
یہ اِک نشہ ہے جو آلودۂ شراب نہیں
مجھے ذلیل نہ کر عذرِ لن ترانی سے
یہ اہلِ ذوق کی توہین ہے' جواب نہیں
جو کامیابِ محبت ہو سامنے آئے
میں کامیاب نہیں' ہاں میں کامیاب نہیں

قفس میں زمزمہ پیرا ہے روحِ آزادی
صدائے مرغِ نفس ہے نفیرِ خواب نہیں

اُسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
وہ بے حجاب سہی میں تو بے حجاب نہیں

سنا ہے میں نے بھی ذکرِ بہشت وحور وطہور
خدا کا شکر ہے نیت مری خراب نہیں

سخنورانِ وطن سب ہیں آفتابِ کمال
تو کیوں کہوں کہ میں ذرّہ ہوں آفتاب نہیں

بیانِ درد کو دِل چاہیے جناب حفیظؔ
فقط زبان یہاں قابلِ خطاب نہیں

○

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھ کو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے
ذرّے کا حسن ذرّہ نہیں آفتاب ہے
مشکل یہ آ پڑی ہے کہ زیرِ نقاب ہے
ہے اِک یہی جھلک تو مری جانِ جستجو
کیوں مان لوں کہ آب نہیں ہے سراب ہے
او مبتلائے زیست ٹھہر، خود کشی نہ کر
تیرا علاج زہر نہیں ہے شراب ہے
ساقی تری نظر نے یہ کیا کر دیا مجھے
جیسے رگوں میں خون نہیں ہے شراب ہے

نشہ شراب میں ہے نہ مستی شباب میں
اس رنگ سے بہشت میں رہنا عذاب ہے

ہے دستِ محتسب مرا جاں بخش ہجر میں
میں زہر پی رہا تھا وہ سمجھا شراب ہے

عرضِ سخن کا اب وہ زمانہ کہاں حفیظ
کہنے کا وقت ہے نہ سنانے کی تاب ہے

○

یا عقل کی افتاد سے دِیوانہ بنا دے
یا عشق کی اِمداد سے فرزانہ بنا دے
یا پردہ اُٹھا دے رُخِ جانانہ دِکھا دے
یا ذوقِ نظر سے مجھے بیگانہ بنا دے
یا کر دے مجھے اپنی حقیقت سے خبردار
یا میری حقیقت کو بھی افسانہ بنا دے
آخر کوئی صورت تو بنے خانۂ دِل کی
کعبہ نہیں بنتا ہے تو بت خانہ بنا دے
کرتا ہے تصور ترا اِس رنگ کی باتیں
سن لے کوئی اِک حرف تو افسانہ بنا دے

پروازِ خرد کیا ہے نری پست خیالی
اے ہمتِ عالی مجھے دِیوانہ بنا دے

اب میری حماقت پہ تاسف ہے تو کیوں ہے
کیا میں نے کہا تھا مجھے فرزانہ بنا دے

اے عقلِ جنوں خیز مبادا یہ تباہی
بستے ہوئے ہر شہر کو ویرانہ بنا دے

ہم خونِ جگر پی کے چلے جائیں گے ساقی
لے شیشۂ دِل توڑ دے پیمانہ بنا دے

ہے عشق حفیظؔ ایک ہی نسخہ کہ جو مل جائے
اپنوں کو مرے حال سے بیگانہ بنا دے

○

وفا جس سے کی بے وفا ہو گیا　　جسے بت بنایا خدا ہو گیا
کوئی بھی نہ سمجھا، یہ کیا ہو گیا　　فدا ہونے والا فدا ہو گیا
ہوا سے اُلجھتا رہا ناخدا　　سفینہ سپردِ خدا ہو گیا
یہاں ہم دعائیں ہی کرتے رہے　　وہاں اس نے جو کہہ دیا ہو گیا
بنے شیخ صاحب محبِّ وطن　　بتوں کو بھی سجدہ روا ہو گیا
بتوں کو تو خیر اک شکایت بھی تھی　　خدا مفت میں کیوں خفا ہو گیا
کریمائے سعدی کو پڑھ کر حفیظ
"اسیرِ کمندِ ہوا" ہو گیا

○

اب سازگار کیا مجھے ناسازگار کیا
میں چوبِ خشک، میری خزاں کیا بہار کیا

تم میرا حال پوچھتے ہو بار بار کیا
اپنی نگاہ پر بھی نہیں اعتبار کیا

دکھلا گئے شبیہ تری منکر و نکیر
اب نیند آئے گی مجھے زیرِ مزار کیا

تو بخش دے تو خیر، بڑی بات بھی نہیں
ورنہ مرے گناہ کا یا رب شمار کیا

خادم بھی ہوں، خطاؤں پہ نادم بھی ہوں حفیظؔ
اَب اَور چاہتے ہیں مرے دوست یار کیا

○

اب وہ نوید ہی نہیں صوتِ ہزار کیا کرے
نخلِ اُمید ہی نہیں ابرِ بہار کیا کرے

دِن ہو تو مہر جلوہ گر، شب ہو تو انجم و قمر
پردے ہی جب ہوں پردہ در، روئے نگار کیا کرے

عشق نہ ہو تو دل لگی، موت نہ ہو تو خودکشی،
یہ نہ کرے تو آدمی آخرِ کار کیا کرے

اہلِ ہوس بھی ہیں بہت، خیر نظر نہ آیئے
یہ تو مگر بتایئے، عاشقِ زار کیا کرے

موت نے کس اُمید پر، سونپ دیے ہیں بحر و بر
مشتِ غبار ہے بشر مشتِ غبار کیا کرے

شمع بھی ہے رہینِ یاس، پھول بھی ہیں اُداس اُداس
کوئی نہیں ہے آس پاس، کنجِ مزار کیا کرے

اپنے کیے پہ بار بار، کون ہو روز شرمسار
مل گیا عذرِ پائدار، قول و قرار کیا کرے

حدِ ہنر نہیں حفیظ تیرے خیال میں کوئی
اہلِ کمال میں کوئی تجھ کو شمار کیا کرے

○

دل ابھی تک جوان ہے پیارے
کس مصیبت میں جان ہے پیارے

تو مرے حال کا خیال نہ کر
اس میں بھی ایک شان ہے پیارے

تلخ کر دی ہے زندگی جس نے
کتنی میٹھی زبان ہے پیارے

وقت کم ہے نہ چھیڑ ہجر کی بات
یہ بڑی داستان ہے پیارے

جانے کیا کہ دیا تھا روزِ ازل
آج تک امتحان ہے پیارے

ہم ہیں بندے مگر ترے بندے
یہ ہماری بھی شان ہے پیارے

نام ہے اس کا ناصحِ مشفق
یہ مرا مہربان ہے پیارے

کب کیا میں نے عشق کا دعویٰ
تیرا اپنا گمان ہے پیارے

میں تجھے بے وفا نہیں کہتا
دشمنوں کا بیان ہے پیارے

ساری دُنیا کو ہے غلط فہمی
مجھ پہ تو مہربان ہے پیارے

تیرے کوچے میں ہے سکوں ورنہ
ہر زمیں آسمان ہے پیارے

خیر فریاد بے اثر ہی سہی
زندگی کا نشان ہے پیارے

شرم ہے' احتراز ہے' کیا ہے
پردہ سا درمیان ہے پیارے

عرضِ مطلب سمجھ کے ہو نہ خفا
یہ تو اک داستان ہے پیارے

جنگ چھڑ جائے ہم اگر کہ دیں
"یہ ہماری زبان ہے پیارے"

○

اور دِل توڑ کے جانے والے دِل کی بات بتاتا جا

اب میں دِل کو کیا سمجھاؤں، مجھ کو بھی سمجھاتا جا

ہاں میرے مجروح تبسم، خشک لبوں تک آتا جا

پھول کی ہست و بود یہی ہے، کھلتا جا مرجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی

اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جی

یہ دُکھ درد کی برکھا بندے، دین ہے تیرے داتا کی

شکرِ نعمت بھی کرتا جا، دامن بھی پھیلاتا جا

جینے کا ارمان کروں یا مرنے کا سامان کروں
عشق میں کیا ہوتا ہے ناصح، عقل کی بات بجھاتا جا
تجھ کو ابر آلود دنوں سے کام نہ چاندنی راتوں سے
بہلاتا ہے باتوں سے، بہلاتا جا بہلاتا جا
دونوں سنگِ راہِ طلب ہیں، راہنما بھی منزل بھی
ذوقِ طلب! ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا
نغمے سے جب پھول کھلیں گے، چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے، تو اپنی دُھن میں گاتا جا
آخر تجھ کو بھی موت آئی، خیر حفیظ خدا حافظ
لیکن مرتے مرتے پیارے وجہِ مرگ بتاتا جا

○

کوئی دوا نہ دے سکے ' مشورۂ دعا دیا
چارہ گروں نے اور بھی درد کا دل بڑھا دیا
دونوں کو دے کے صورتیں ساتھ ہی آئنہ دیا
عشق بسورنے لگا ' حسن نے مسکرا دیا
ذوقِ نگاہ کے سوا ' شوقِ گناہ کے سوا
مجھ کو بتوں سے کیا ملا ' مجھ کو خدا نے کیا دیا
تھی نہ خزاں کی روک تھام دامنِ اختیار میں
ہم نے بھری بہار میں اپنا چمن لٹا دیا

حسنِ نظر کی آبرو صنعت برہمن سے ہے
جس کو صنم بنا لیا ' اس کو خدا بنا دیا

داغ ہے مجھ پہ عشق کا میرا گناہ بھی تو دیکھ
اس کی نگاہ بھی تو دیکھ جس نے یہ گل کھلا دیا

عشق کی مملکت میں ہے' شورشِ عقلِ نامراد
ابھرا کہیں جو یہ فساد' دل نے وہیں دبا دیا

نقشِ وفا تو میں ہی تھا' اب مجھے ڈھونڈتے ہو کیا
حرفِ غلط نظر پڑا ' تم نے مجھے مٹا دیا

خبثِ دروں دکھا دیا' ہر دہنِ غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے ہنس دیا مسکرا دیا

○

لب شکرِ چارہ ساز کا نغمہ لیے ہوئے
دل وردِ جاں گداز کا شکوا لیے ہوئے

اب اشتیاقِ عرضِ تمنا نہیں رہا
اب ہر کوئی ہے عرضِ تمنا لیے ہوئے

میری یہ زندگی ہے کہ مرنا پڑا مجھے
اِک اور زندگی کی تمنا لیے ہوئے

توبہ کیے ہوئے ہوں وگرنہ یہاں کوئی
پھرتا نہ مے پیے ہوئے مینا لیے ہوئے

ساقی ہے آج کون کہ ہر کوزۂ سفال
آتا ہے ایک نور کا دریا لیے ہوئے

دریا سے موج اٹھی' سوئے دریا پلٹ گئی
مجھ کو لیے ہوئے مری توبہ لیے ہوئے

پروانہ دل لیے ہوئے جل جائے بھی تو کیا
جلتی ہے شمع صورتِ زیبا لیے ہوئے

یہ لن ترانیاں ہیں تو اب کون آئے گا
بیٹھے رہو گے برقِ تجلیٰ لیے ہوئے

مردودِ میکدہ کو بھلا منہ لگائے کون
بیٹھا ہوں خانقاہ میں توبہ لیے ہوئے

پیشِ خدا چلا ہوں فرشتے ہیں ساتھ ساتھ
ساغر لیے ہوئے کوئی مینا لیے ہوئے

احباب ہی نہیں ہیں تو کیا زندگی حفیظؔ
دُنیا چلی گئی مری دُنیا لیے ہوئے

○

کیوں ہجر کے شکوے کرتا ہے کیوں درد کے رونے روتا ہے
اب عشق کیا تو صبر بھی کر، اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے
آغازِ مصیبت ہوتا ہے، اپنے ہی دل کی شامت سے
آنکھوں میں پھول کھلاتا ہے، تلووں میں کانٹے بوتا ہے
احباب کا شکوہ کیا کیجیے، خود ظاہر و باطن ایک نہیں
لب اوپر اوپر ہنستے ہیں دل اندر اندر روتا ہے
ملاحوں کو الزام نہ دو تم ساحل والے کیا جانو
یہ طوفاں کون اٹھاتا ہے، یہ کشتی کون ڈبوتا ہے
کیا جانیے یہ کیا کھوئے گا، کیا جانیے یہ کیا پائے گا
مندر کا پجاری جاگتا ہے، مسجد کا نمازی سوتا ہے
خیرات کی جنت ٹھکرا دے، ہے شان یہی خودداری کی
جنت سے نکالا تھا جس کو تو اس آدم کا پوتا ہے

آخر ایک دن شاد کرو گے؟ میرا گھر آباد کرو گے
پیار کی باتیں، وصل کی راتیں یاد کرو گے یاد کرو گے
کس دل سے آباد کیا تھا کس دل سے برباد کرو گے
میں نے اپنی قیمت کہ دی تم بھی کچھ ارشاد کرو گے؟
زر کے بندو، عقل کے اندھو تم کیا مجھ کو شاد کرو گے
جب مجھ کو چپ لگ جائے گی پھر تم بھی فریاد کرو گے
اور تمھیں آتا ہی کیا ہے کوئی ستم اِیجاد کرو گے
تنگ آ کر اے بندہ پرور بندے کو آزاد کرو گے
میرے دل میں بسنے والو تم مجھ کو برباد کرو گے
حسن کو رُسوا کر کے مروں گا آخر تم کیا یاد کرو گے

حشر کے دِن اُمید ہے ناصح
تم میری اِمداد کرو گے

○

حسن پابند رضا ہو مجھے منظور نہیں
میں کہوں، تم مجھے چاہو مجھے منظور نہیں

شرطِ اظہارِ ندامت ہے جو بخشش کے لیے
اے جوانی کے گنا ہو مجھے منظور نہیں

حسن والے مرے قاتل ہیں یہ دعویٰ ہے مرا
حسن والوں کو سزا ہو مجھے منظور نہیں

جس نے اس دور کے انسان کیے ہیں پیدا
وہی میرا بھی خدا ہو مجھے منظور نہیں

حشر کے دن مجھے سچ کہنے کی توفیق نہ دے
کوئی ہنگامہ بپا ہو مجھے منظور نہیں

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یا رب
میرا اپنا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

اب کوئی راز نہیں، اب سے مرا محرمِ راز
کوئی بھی میرے سوا ہو مجھے منظور نہیں

جلوے لاکھوں ہیں خدا ایک ہے اے سجدۂ شوق
ہر قدم لغزشِ پا ہو مجھے منظور نہیں
مجھ کو اے کاتبِ تقدیر تماشا نہ بنا
عشق چہرے پہ لکھا ہو مجھے منظور نہیں
یہ بری بات ہے' ترغیبِ گنہ دل کو نہ دو
میری معصوم نگاہو مجھے منظور نہیں
اے بتو تم پہ اندھا دھند مرے خلقِ خدا
اور خدا دیکھ رہا ہو مجھے منظور نہیں
حرم و دیر کو بندوں سے ہے جو کچھ منظور
یہی منظورِ خدا ہو مجھے منظور نہیں
تیرا کردار سکندر تری رفتار خضر
تو مرا راہنما ہو مجھے منظور نہیں
خفگی' میکدہ والوں کی' الٰہی توبہ
کوئی خوش ہو کہ خفا ہو مجھے منظور نہیں

○

اپنے ہی دل کو مار لیا مار مار کے
دیکھے تو کوئی جبر مرے اختیار کے
ہارے ہوئے ہیں معرکۂ اعتبار کے
مارے ہوئے ہیں وعدۂ دیدارِ یار کے
گنتے ہیں سانس زندگیِ مستعار کے
بیٹھے ہیں انتظار میں روزِ شمار کے
یہ قیدِ زندگی یہ ستم روز گار کے
مدِ نظر ہے کیا مرے پروردگار کے
کس منہ سے اے تو مجھے بے موت مار کے
جاؤ گے سامنے مرے پروردگار کے

وہ کون تھے جو عشق کو اک کھیل جان کر
کھیلے بھی اور چل بھی دیے جیت ہار کے

کیوں کھیلتا ہوں میں یہ کسی کو خبر نہیں
احباب ہیر پھیر میں ہیں جیت ہار کے

ہم بار بار چاک گریباں نہ کر سکے
بے کار بار بار دن آئے بہار کے

کشمیر ہے وہ جلوہ مگر اس کی راہ میں
فرقت کی وادیاں ہیں پہاڑ انتظار کے

کشمیر میں حفیظؔ جلے دل کی یادگار
ڈھیری ہے ایک راکھ کی نیچے چنار کے

○

مجھے شاد رکھنا کہ ناشاد رکھنا
مرے دیدہ و دل کو آباد رکھنا

بھلائی نہیں جا سکیں گی یہ باتیں
تمھیں یاد آئیں گے ہم یاد رکھنا

وہ ناشاد و برباد رکھتے ہیں مجھ کو
الٰہی انھیں شاد و آباد رکھنا

تمھیں بھی قسم ہے کہ جو سر جھکا دے
اسی کو تہِ تیغِ بیداد رکھنا

ملیں گے تمھیں راہ میں بتکدے بھی
ذرا اپنے اللہ کو یاد رکھنا

جہاں بھی نشے میں قدم لڑکھڑائیں
وہیں ایک مسجد کی بنیاد رکھنا

ستاروں پہ چلتے ہوئے ابنِ آدم!
نظر میں فرشتوں کی افتاد رکھنا

حفیظ اپنے افکار کی سادگی کو
تکلف کی اُلجھن سے آزاد رکھنا

○

کبھی زمیں پہ کبھی آسماں پہ چھائے جا
اجاڑنے کے لیے بستیاں بسائے جا
خضر کا ساتھ دیے جا قدم بڑھائے جا
فریب کھائے ہوئے کا فریب کھائے جا
تری نظر میں ستارے ہیں اے مرے پیارے!
اُڑائے جا تہِ افلاک خاک اڑائے جا
نہیں عتابِ زمانہ خطاب کے قابل
ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا
اناڑیوں سے تجھے کھیلنا پڑا اے دوست
بچھا بچھا کے نئی چال، مات کھائے جا
شراب خم سے دیے جا، نشہ تبسم سے
کبھی نظر سے کبھی جام سے پلائے جا

میری کوئی خطا نہیں، مجھ پر خفا نہ ہو
اس بت کو دیکھ داورِ محشر خفا نہ ہو

چاہوں تو اب بھی جانبِ منزل پلٹ چلوں
گمراہ اس لیے ہوں کہ رہبر خفا نہ ہو

توہینِ حسن آہ بھی ہے ضبطِ آہ بھی
دونوں طرح کہیں وہ ستمگر خفا نہ ہو

ان زاہدوں میں بیٹھ کے میٹھی مے طہور
پیتا ہوں تا کہ ساقیٔ کوثر خفا نہ ہو

ساقی ہزار توبہ نثار اس عتاب پر
ہاں ہاں پلا پلا مجھے ساغر، خفا نہ ہو

بے وقت، بے محل، کوئی مقصد، نہ مدعا
یوں عرضِ حال ہو تو وہ کیونکر خفا نہ ہو

نالے کو ضبط کرتے ہوئے دَم اُلجھ گیا
کوشش یہ تھی کہ اب وہ مکرر خفا نہ ہو

پیشِ خدا بھی کھل نہ سکا بتکدے کا راز
اس خوف سے کہ وہ بتِ کافر خفا نہ ہو

اے مدعی یہ رنگ اُڑانا محال ہے
دیکھ اس غزل کو جانِ برادر خفا نہ ہو

ڈرتا ہوں اس نزاکتِ معنیٰ سے اے حفیظ
اِک بدمذاق فربہ سخنور خفا نہ ہو

○

ذکر بیدادِ بتاں پیشِ خدا کیا ہو گا
زندگی میں نہ ہوا بعدِ فنا کیا ہو گا
ہر قدم جس کو نئی چال نہ چلنی آئے
وہ تو رہزن بھی نہیں راہنما کیا ہو گا
کوئی بھی اب تو ٹھہرتا نہیں معیارِ نظر
آدمی شانِ خدا ہے تو خدا کیا ہو گا
حاصلِ عشق ہے رُسوائی بھی ناکامی بھی
حاصلِ عمر نہ جانے ابھی کیا کیا ہو گا
پھر کدھر جائیں گے راندے ہوئے بت خانے کے
درِ کعبہ بھی اگر وا نہ ہوا کیا ہو گا

تیری گفتار بہت تلخ ہے واعظ یہ بتا
خلد کی پاک شرابوں کا مزا کیا ہو گا
میں گنہگار بھی نکلا تو بہت معمولی '
حشر میں اور برا حشر مرا کیا ہو گا
شیخ کے منہ سے تو نکلی ہیں مزے کی باتیں
ہم یہ سمجھے تھے بجز نامِ خدا کیا ہو گا
بغض نے پھونک دیا گلشنِ اُردُو کو حفیظ
آنسوؤں سے ترے یہ باغ ہرا کیا ہو گا

○

بتوں کی کوئی بات سچی نہ مانیں
نہ ان کے دہن ہیں نہ ان کی زبانیں
لٹاتے ہیں ایمان شیخ و برہمن
بڑی رونقوں پر ہیں دونوں دُکانیں
نہ ٹوٹیں گی خاموشیاں بتکدوں کی
فضاؤں میں گونجا کریں گی اذانیں
جوانی گئی، پھر بھی ہم اور ناصح
جہاں مل گئے چھڑ گئیں داستانیں
جنوں سے نہ اُلجھیں ابھی اہلِ دانش
ابھی کچھ دنوں عقل کی خاک چھانیں
ہمیں عشق ہے ان سے ہم جانتے ہیں
وہ سمجھیں نہ سمجھیں وہ جانیں نہ جانیں
جہاں اہلِ دل آ گیا کوئی زد پر
کھنچے تیر اور جھک پڑیں دو کمانیں
بہت دِن گزارے ہیں قیدِ سخن میں
حفیظؔ آؤ آزاد ہونے کی ٹھانیں

○

نہ چلے گی حشر کے دن یہ تری سخن طرازی
کہ تو نامۂ عمل پر، نہ شہید ہے نہ غازی
نہ متاعِ نور حاصل نہ تو حور ہی سے واصل
نہ تو خود فریب واعظ نہ تو سادہ دل نمازی
یہ حقیقتِ مجازی ' تری داستانِ رندی
یہ درِ بتانِ ہندی ترا سجدۂ حجازی
تری زندگی ریا ہے، مگر اس کا غم ہی کیا ہے
کہ ابھی بچھا ہوا ہے ترا دامِ پاکبازی
تو مجھے بھی دے رہا ہے شرفِ نیاز مندی
تری شانِ بے نیازی تری شانِ بے نیازی

کوئی بات ہے کہ چپ ہوں تجھے کامراں سمجھ کر
مجھے بے زباں سمجھ کر نہ دکھا زباں درازی

سرِ سر بلند میرا، نہیں مستمند تیرا
میں شہیدِ عشقِ رومی، میں قتیلِ علمِ رازی

ترے ناز میں اٹھاؤں، اگر اب بھی دیکھ پاؤں
کوئی اک نظر فریبی، کوئی ایک دل نوازی

یہ محال تو نہیں تھا مرے دوست دوست رہتے
مگر اے حفیظؔ مجھ سے نہ ہوئی زمانہ سازی

○

حسینوں کو ہم اپنے قتل میں شامل سمجھتے ہیں
مگر وہ اور کوئی ہے جسے قاتل سمجھتے ہیں
ابھی کچھ لوگ زندہ ہیں خدا کو ماننے والے
بتانِ ہند جن کو دید کے قابل سمجھتے ہیں
ہوئے ہیں شیخ جب سے معتکف بت خانے کے اندر
انھیں ہم جیتے جی فردوس میں داخل سمجھتے ہیں
خدا رکھے ہمارے ناخدا ہیں موج کے بندے
جہاں خود ڈوبنا چاہیں وہیں ساحل سمجھتے ہیں
پگھلتی جائیں شمعیں اور جلتے جائیں پروانے
اسی کو اہل محفل گرمیِ محفل سمجھتے ہیں

وفا کے مسئلے میں کہہ گئے اِک حرفِ حق ہم بھی
ہمارے دوست ہم کو دار کے قابل سمجھتے ہیں

بڑھو، ہمت کرو، اندھے گڑھے میں جھانکنے والو
تمھارے رہنما تم کو سرِ منزل سمجھتے ہیں

بیان درد پر اہلِ زباں سے داد ملتی ہے
زبانِ درد لیکن چند اہلِ دل سمجھتے ہیں

حفیظؔ اپنی ترقی شعر میں یہ ہے کہ اس فن کو
بہت آساں سمجھتے تھے، بہت مشکل سمجھتے ہیں

○

بہت ہی مختصر ہے داستانِ گمرہی اپنی
قدم گھر سے نکالا اور منزل آ گئی اپنی
خدا ناظر تھا اپنا اور حاضر تھی خودی اپنی
مگر بندے کے در پر جھک رہی تھی بندگی اپنی
اٹھائے کیوں نہ طوفانِ ملامت عاشقی اپنی
سمندر پار سے لایا ہے دل اپنا خوشی اپنی
وہاں اک شوخیِ رنگیں کی صورت میں دلِ سادہ
یہاں دنیائے معنی بالارادہ سادگی اپنی

گل اندر گل بہار اندر بہار اس حسن کا گلشن
فقط اک خارِ دامن کو نظر آئی کمی اپنی

نتیجہ کامیابی کیوں نہ ہوتا امتحانوں کا
جفا تھی مبتدی اُن کی وفا تھی منتہی اپنی

حسیں ہم ان کو سمجھے تھے مگر اتنا نہیں سمجھے
کہ یہ دل کی لگی تھی یا فقط اک دل لگی اپنی

جہانِ درد آخر لے لیا اک دل کے بدلے میں
اسی سودے میں سودائی نے پائی بہتری اپنی

حفیظؔ اربابِ دُنیا جو بھی چاہیں شوق سے کہہ لیں
ہمیں اتنا ہی کہنا ہے کہ دُنیا بس گئی اپنی

عشق نے حسن کی بیداد پہ رونا چاہا
تخمِ احساسِ وفا سنگ میں بونا چاہا

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر
نا خدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

سنگدل کیوں نہ کہیں بتکدے والے مجھ کو
میں نے پتھر کا پرستار نہ ہونا چاہا

حضرت شیخ نہ سمجھے مرے دل کی قیمت
لے کے تسبیح کے رشتے میں پرونا چاہا

کوئی مذکور نہ تھا غیر کا لیکن تم نے
باتوں باتوں میں یہ نشتر بھی چبھونا چاہا

دیدۂ تر سے بھی سرزد ہوا اِک جرمِ عظیم
حشر میں نامۂ اعمال کو دھونا چاہا
مرتے مرتے بھی توقع رہی دلداری کی
رکھ کے سر زانوئے تقدیر پہ سونا چاہا
ہائے کس درد سے کی ضبط کی تلقین مجھے
ہنس پڑے دوست جو میں نے کبھی رونا چاہا
جنسِ شہرت بہت ارزاں تھی مگر میں نے حفیظؔ
دولتِ درد کو بے کار نہ کھونا چاہا

○

نہ پیتا ہوں نہ پینا چاہتا ہوں
سخن کا اک قرینا چاہتا ہوں
نگاہ و دل کی یک رنگی تھی درکار
وہ سمجھے جام و مینا چاہتا ہوں
مِرا مقصود پردہ ہے نہ جلوہ
فروغِ چشمِ بینا چاہتا ہوں
نہ توڑو دوستو رشتہ وفا کا
میں دل کے زخم سینا چاہتا ہوں
ابھی باقی ہے میعادِ مصیبت
ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں
حفیظ اس کا سبب مجھ سے نہ پوچھو
مگر میں آج پینا چاہتا ہوں

○

جس کا ظہور ہو نہ سکا مہر و ماہ میں
وہ جلوہ ہائے نور ہیں میری نگاہ میں
او ننگ شوق ! سجدہ گوارا ہوا تجھے
سر کاٹ کر نہ پھینک دیا سجدہ گاہ میں
تو عشق ہے کہ موت مجھے کچھ خبر نہیں
چلتا ہوں آنکھ بند کیے تیری راہ میں
تیرے سوا کہیں بھی ٹھہرتی نہیں نگاہ
تیرے سوا کوئی بھی نہیں ہے نگاہ میں
ترکِ وفا کیے سے بھی کیا فائدہ حفیظ
اب جب کہ عمر بیت چکی اس گناہ میں

○

ان گیسوؤں میں شانۂ ارماں نہ کیجیے
خونِ جگر سے دعوتِ مژگاں نہ کیجیے

مر جائیے نہ کیجیے ذکرِ بہشت و حور
اس خواب کو بھی خوابِ پریشاں نہ کیجیے

باقی ہو جو بھی حشر یہیں پر اٹھائیے
مرنے کے بعد زیست کا ساماں نہ کیجیے

دوزخ کو دیجیے نہ پراگندگی مری
شیرازۂ بہشت پریشاں نہ کیجیے

شاید یہی جہاں کسی مجنوں کا گھر بنے
ویرانہ بھی اگر ہے تو ویراں نہ کیجیے

کیا ناخدا بغیر کوئی ڈوبتا نہیں
مجھ کو مرے خدا سے پشیماں نہ کیجیے
ہے بتکدے میں بھی اسے ایمان کا خیال
کیوں اعتبارِ مردِ مسلماں نہ کیجیے
بارِ نگاہِ لطف اُٹھایا نہ جائے گا
احساں یہ کیجیے، کہ یہ احساں نہ کیجیے
آئینہ دیکھیے مری صورت نہ دیکھیے
میں آئنہ نہیں مجھے حیراں نہ کیجیے
تو ہی عزیزِ خاطرِ احباب ہے حفیظؔ
کیا کیجیے اگر تجھے قرباں نہ کیجیے

○

ناکامیِ عشق یا کامیابی
دونوں کا حاصل خانہ خرابی

آنکھیں سیہ مست چہرہ کتابی
بادہ شبانہ جام آفتابی

پھولوں میں دو پھول رنگوں میں دو رنگ
لب لعلِ نابی عارض گلابی

دنیا و دیں سے بیگانہ ہو جا
دیوانہ ہو جا بن جا شرابی

ان کا بہانہ برجستہ گوئی
میرا تبسم حاضر جوابی

دیں دار کر دے کافر بنا دے
یہ پردہ داری یہ بے حجابی

ہیں تختِ دل پر سرکار، ورنہ
تختہ اُلٹ دیں، ہم انقلابی

دربان سے ہوں دست و گریباں
الحمد للّٰہ یہ باریابی!

رُت سنگیت

نغمے سے جب پھول کھلیں گے
چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے
تو اپنی دھن میں گاتا جا

تیری منزل دور

ساغرِ آب و گل سے

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

نظارے اس آب و گل کے

رہزن ہیں تیری منزل کے

نغمہ ہو یا رنگِ گل ہو

سب پردے ہیں نگاہ و دل کے

تو ہے طالبِ نور

مسافر

تیری منزل دور

دل بستگی سے

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

لیلیٰ کے محمل سے نکل جا

شیریں کی محفل سے نکل جا

حسن و ادا دونوں کے در پر

دل رو کے تو دِل سے نکل جا

دل سے نہ ہو مجبور

مسافر

تیری منزل دُور

رہبانیت اور خود کشی سے

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

کوہ و بیاباں جن کا ٹھکانا
ان کی راہ نہ ہرگز جانا
ہمت سے اور فکر سے عاری
قیس بچارا اِک دیوانہ
کوہکن اِک مزدور

مسافر

تیری منزل دُور

<u>شغل سوتیانہ سے</u>

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

دنیا کے بازاری دھندے
زر کے گنگا جمنی پھندے
کیا اندھی ہے دُنیا جس پر
اندھے ہیں دُنیا کے بندے.

عاجز اور مغرور

مسافر

تیری منزل دور

حور و قصور سے

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

جس میں نہ ہو چلنے کا یارا

وہ کر لے جنت کو گوارا

شیخ کو لینے دے یہ سہارا

یہ بے چارہ ضعف کا مارا

حور سے ہے مسحور

مسافر

تیری منزل دور

<u>خالی عقل و فکر سے</u>

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

جس منزل کی تجھ کو لگن ہے

اُس منزل کی راہ کٹھن ہے

اُس منزل تک عشق ہی جائے

عقل بچاری خستہ تن ہے

فکر وہاں معذور

مسافر

تیری منزل دُور

عکسِ تجلی سے

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

راہ میں حائل کوہ سینا

جس کی چوٹی پہلا زینہ

دل آئینہ ہے تو تجھ پر

جھلکیں گے انوارِ مدینہ

بجلیوں میں مستور

مسافر

تیری منزل دور

جذباتی تسلی نے

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

اور بڑھیں تو قیامت ٹوٹے

روشنیوں کا چشمہ پھوٹے

موسیٰ نے پہلے ہی قدم پر

غش کھایا اور رستے چھوٹے

جل کر رہ گیا طور

مسافر

تیری منزل دور

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

جو پیچھے مطلوب کے جائے

دوارے پر محبوب کے جائے

تیر کے نکلے صحرا صحرا

دریا دریا ڈوب کے جائے

اُلٹا سب دستور

مسافر

تیری منزل دور

سکون و آرام

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

بعض تو بے خود ہو جاتے ہیں

بعض خودی میں کھو جاتے ہیں

رہ جاتے ہیں سر کٹوا کر

دار پہ چڑھ کر سو جاتے ہیں

سرمد اور منصور

مسافر

تیری منزل دور

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

خضر رفیق راہ نہیں ہے

منزل سے آگاہ نہیں ہے

اس رستے میں سنگی ساتھی

کوئی بجز اللہ نہیں ہے

وہ بھی تحتِ شعور

مسافر

تیری منزل دور

تن آسانی سے

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

خانقہوں میں درسِ فقیری
چلّہ کشی اور گوشہ گیری
راحت کے حجروں سے نکل کر
دامِ آزادی کی اسیری
کون کرے منظور

مسافر

تیری منزل دور ہے

حوصلہ افزائی سے

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

دیوانہ فرزانہ جانے

فرزانہ دیوانہ جانے

کوئی تیری بات نہ سمجھے

ہر کوئی بیگانہ جانے

کوئی نہ ہو مسرور

مسافر

تیری منزل دور

فلم بالی سے

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

شمع مثال پگھلتے جانا

پروانہ ساں جلتے جانا

جلنا اور پگھلنا ، لیکن

چلنا ، چلنا ، چلتے جانا

کس کا ہے مقدور

مسافر

تیری منزل دور

منجدھار

کامی کھیون ہار

جھوٹا سب سنسار
پیارے
جھوٹا سب سنسار
موہ کا دریا لوبھ کی نیا
کامی کھیون ہار
موج کے بل پر چل نکلے تھے
آن پھنسے منجدھار
پیارے
جھوٹا سب سنسار

ڈھن کی ڈھن اسوار

جھوٹا سب سنسار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

تن کے اجلے من کے میلے

ڈھن کی ڈھن اسوار

اوپر اوپر راہ بتائیں

اندر سے بٹ مار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

بیچیں سرگ اُدھار

جھوٹا سب سنسار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

گیان دھیان کے پتر باچیں

بیچیں سرگ اُدھار

گیانی پاتر بن کرناچیں

نقد کریں بیوپار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

نکلے چور چکار

جھوٹا سب سنسار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

چولے دھار کے دِین دھرم کے

نکلے چور چکار

ان چولوں کی آڑ سے چمکے

دو دھاری تروار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

درشن درشن

درشن درشن میرا
بس
درشن درشن میرا

مالی لاکھ کرے رکھوالی
بھونرا گونجے ڈالی ڈالی
پھول پھول پر ڈیرا
بس
درشن درشن میرا

ہر کوئی ہے قیدِ قفس میں بلبل رنگ میں، مکھی رس میں
اپنا من ہے اپنے بس میں
جوگی والا پھیرا
بس
درشن درشن میرا

درشن درشن میرا

بس

درشن درشن میرا

جس ہردے میں شیام براجے

جس گوکل میں مرلی باجے

سادھو کریں بسیرا

بس

درشن درشن میرا

رنگ رنگ سے جلے جوالا   انگ انگ کا رُوپ نرالا

نین جپیں درشن کی مالا

سانجھ سانجھ سویرا

بس

درشن درشن میرا

بسنت رُت

بسنت کی رُت آ گئی
ترے وطن پہ چھا گئی

ہوا کا رُخ پلٹ گیا
خزاں کا زور گھٹ گیا
اَلم کا ابر چھٹ گیا

پہن کے جامۂ نمو
چمن ہرا بھرا ہوا

کوئی نہیں۔۔بس ایک تو
ہے آج بھی مرا ہوا

بسنت کی رُت آ گئی
ترے وطن پہ چھا گئی

بسنت کی رُت آ گئی
ترے وطن پہ چھا گئی
بگاڑ کو سنوار کے
دلوں کا میل اتار کے
دِن آ گئے بہار کے
اُتار دے اُتار دے
یہ خول تُو بھی ہوش کا
طرب کدہ سنوار دے
جنونِ گرم جوش کا
بسنت کی رت آ گئی
ترے وطن پہ چھا گئی

بسنت کی رُت آ گئی
ترے وطن پہ چھا گئی

مٹا بھی دے کدورتیں
کہ نیک ہیں مہورتیں
گلوں کی دیکھ صورتیں

امید کی مہک تو ہے
یہ پھول زرد ہی سہی

نوید کی لہک تو ہے
ہوائیں سرد ہی سہی

بسنت کی رُت آ گئی
ترے وطن پہ چھا گئی

بسنت کی رُت آ گئی
ترے وطن پہ چھا گئی

جو تو وفا سرشت
تو سُرخرو یہ کِشت ہو
یہی چمن بہشت ہو

یہ زرد رنگ خوب ہے
مگر جنوں کا رنگ ہے

پھر اس سے بڑھ کے خوب شے
ترے ہی خوں کا رنگ ہے

بسنت کی رُت آ گئی
ترے وطن پہ چھا گئی

گھر پھونک تماشا

قفس کے راحت پسند پنچھی مزے میں ہیں چہچہا رہے ہیں
چمن پہ آتش برس رہی ہے
بسنت کے گیت گا رہے ہیں
اٹھے ہیں صیاد لے کے پھندے قدم قدم پر بچھا رہے ہیں
خزاں رسیدہ چمن میں شاید
بہار کے دن پھر آ رہے ہیں
لگا کے آگ اس چمن کے مالی جلا چکے پھول پات ڈالی
بہار کے اب فقط خیالی پلاؤ بیٹھے پکا رہے ہیں

ہوا کے یہ سرد سرد جھونکے
یہ گرم گرم اشک بلبلوں کے
لگی ہوئی کو بجھا رہے ہیں، بجھی ہوئی کو جگا رہے ہیں
دبی ہوئی حسرتوں میں شاید
کہیں کہیں آگ لگ گئی ہے
گری ہوئی پتیوں کے تودے دھوئیں کے بادل اٹھا رہے ہیں
حفیظ صاحب سے کوئی کہہ دے
خزاں کی سختی کو بھول جائیں
ترانے گائیں غزل سنائیں جلی کٹی کیوں سنا رہے ہیں

منتر

کیوں تکرار کریں
ہم آخر
کیوں تکرار کریں
اے ساجن اے میرے بھیا لوبھ کے مارے لڑیں کھویا
ڈول رہی ہے دیش کی نیا
یاد کریں کیوں کڑوی یادیں آؤ ان یادوں کو بھلا دیں
آؤ یہ مردے دفنا دیں
سب آشائیں ہاتھ بٹائیں
نیا پار کریں
کیوں تکرار کریں

تم نے ستایا ہم نے جفا کی　　　ہم سے ہوئی یا تم نے خطا کی

دونوں بھولے رسم وفا کی

دونوں مورکھ بھولے بھالے　　　پڑ گئے ہم سانپوں کے پالے

ڈس گئے ہم کو ڈسنے والے

کرودھ کپٹ ہے ساتھی کس کا　　　پریت ہی منتر ہے اس بس کا

آؤ پریم کی جوت جگائیں

من تیار کریں

کیوں تکرار کریں

ہم آخر

کیوں تکرار کریں

افرنگ کی دنیا

وہ جس کی گرہ میں نہ جوانی ہو نہ زر ہو
اس راہ سے اللہ نہ کرے اُس کا گزر ہو

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
رشکِ عدن ہے باغِ وطن بھی
گل بھی ہیں موجود گل پیرہن بھی
نازک بدن بھی غنچہ دہن بھی
لیلیٰ روش بھی شیریں سخن بھی
کچھ کم نہیں وہ
اُجڑا چمن بھی
اس کے بھی اِک بار کر لے نظارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

اس حسن میں ہے — ہلکا نمک بھی
مے کا نشہ بھی — لطفِ گزک بھی
رنگین کلیاں — جن میں مہک بھی
دل میں وفا بھی — درد اور تپک بھی

روئے زمیں بھی
چشمِ فلک بھی

سب ہی بھکاری — بھارت کے دوارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

حسن و نظر کی خاموش گھاتیں
عشق و ہوس کی دھومیں براتیں
سب ہیں وہاں بھی یہ وارداتیں
دیکھی نہیں کیا تو نے وہ راتیں
دُولھا دُلھن جب
کرتے ہیں باتیں
ہنستی ہیں کلیاں کھلتے ہیں تارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

مے خانے بھی ہیں　　پیرِ مغاں بھی
ہنگامے بھی ہیں　　خاموشیاں بھی
لطفِ بہاراں　　رنگِ خزاں بھی
ساگر بھی موجود　　آبِ رواں بھی
جو کچھ یہاں ہے
سب ہے وہاں بھی
پھرتے ہو بے کار　　کیوں مارے مارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

سودے وہاں بھی کرتے ہیں شہری
چلتے ہیں ہر سو سکے سنہری
دیہات پر ہے اک نیند گہری
لہریں وہاں بھی لیتے ہیں لہری

بازار منڈی
تھانہ کچہری

کرتے ہیں دن رات سب وارے نیارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن کے دن رات نیارے
وہ چاند سورج نوری غبارے
وہ ندیاں ہیں امرت کے دھارے
دنیا کے اونچے پربت ہمارے
باغ اور آکاش
پھول اور تارے
سب منتظر ہیں میرے تمھارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

وہ سیدھی سادی بچوں کی مائیں
زلفیں ہیں جن کی کالی گھٹائیں
آنچل میں جن کے ٹھنڈی ہوائیں
بھولو گے کب تک ان کی وفائیں
کب تک کرو گے
ان پر جفائیں
چھوڑا ہے اُن کو کس کے سہارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

معصوم ' معصوم بھولی نگاہیں
دِل ڈھونڈتا ہے جن کی پناہیں
کن حسرتوں سے تکتے ہیں راہیں
وہ گرم آنسو وہ سرد آہیں
مانیں نہ مانیں
چاہیں نہ چاہیں
کھینچیں گے اِک دن اُن کے اشارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

گردن جھکاؤ تصویر دیکھو
بنگال دیکھو کشمیر دیکھو
خوابِ جناں کی تعبیر دیکھو
با وصفِ تخریب تعمیر دیکھو
آنکھوں سے اپنی
تقصیر دیکھو
اَپنے خزانے تم نے بسارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

سب کچھ ہے پیارے اپنے وطن میں
ہے مست زردار مال اور دھن میں
مزدور اب تک مردہ کفن میں
لیکن ہے وہ بھی اپنی لگن میں
پھر گونجتی ہے
گوکل کے بن میں
لے بنسری کی جمنا کنارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

ماضی سے بہتر بے شک نہیں حال
علم و ہنر کا پھر بھی نہیں کال
ٹیگور کا ساز جادوئے بنگال
پنجاب کا ناز اعجازِ اقبالؔ
اَور یہ مسافر
آوارہ پامال
ہیں قابلِ دید سارے کے سارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

دل میں اگر ہے کوئی حسینہ
کرلے اسے بھی تعویذِ سینہ
لے چل وطن میں اپنا خزینہ
ہو زیبِ خاتم یہ بھی نگینہ
ساحل پہ پہنچے
جس دم سفینہ
تو اپنے منہ سے خود ہی پکارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

نیرنگِ فرنگ

نیرنگِ طلسمات ہے افرنگ کی دنیا
قسمت نے دکھائی یہ نئے رنگ کی دنیا
رقص و طرب و نغمہ و آہنگ کی دنیا
ہنگامہ و ہول و فتن و جنگ کی دنیا
فردوس بھی ہے خوف سے خالی بھی نہیں
اصلی جو نہیں ہے تو خیالی بھی نہیں ہے

رنگینیِ گل ، بارِ ثمر دیکھ رہا ہوں
حسنِ عمل و حسنِ نظر دیکھ رہا ہوں
ہر سمت فراوانیِ زر دیکھ رہا ہوں
سرمایہ و محنت کا اثر دیکھ رہا ہوں
اس عقل نے ہمت سے بڑا کام لیا ہے
تکلیف اٹھائی ہے تو آرام لیا ہے

حیراں ہوں سرِ راہ گزر دیکھ رہا ہوں
اک حشر سا تا حدِ نظر دیکھ رہا ہوں
ہنگامۂ انبوہِ بشر دیکھ رہا ہوں
ہر فرد کو بے خوف و خطر دیکھ رہا ہوں
اس بھیڑ میں ٹکرا کے گزرتا نہیں کوئی
کمزور کی توہین بھی کرتا نہیں کوئی
آفاق پر از فتنہ و شر دیکھ رہا ہوں
یہ روز و شب و شام و سحر دیکھ رہا ہوں
قوموں کی ہلاکت کا ہنر دیکھ رہا ہوں
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
جو دیکھ رہا ہوں وہ بیاں ہو نہیں سکتا
"آنکھوں سے کبھی کارِ زباں ہو نہیں سکتا"
مٹی ہی نہیں آگ بھی پانی بھی ہوا بھی
مغلوب نظر آتے ہیں زنجیر بہ پا بھی
اک زلزلہ ہے زیرِ زمیں' زیرِ سما بھی
حیران فرشتے بھی ہیں شاہد ہے خدا بھی
دیوار شکستہ ہوئی زندانِ بقا کی
انسان کے پنجے میں ہے تقدیر فنا کی

شاعر ہوں مرا کام نہیں فلسفہ رانی
کھلتی ہے مجھے ٹھوس نتائج کی گرانی
انسان کی تصویر نئی ہو کہ پرانی
مطلوب مجھے حسن ہے اور حسنِ معانی
اللہ کے بندوں سے مجھے بیر نہیں ہے
پیارے مری دُنیا میں کوئی غیر نہیں ہے

مغرب میں جمایا ہے جو خورشید نے ڈیرا
لازم ہے کہ چندے رہے مشرق میں اندھیرا
جب رات گزر جائے گی آئے گا سویرا
ایام پہ کچھ زور نہ تیرا ہے نہ میرا
یہ دورِ شب و روز و مہ و سال رہے گا
گردش ہے جو قائم تو یہی حال رہے گا

مشرق بھی نہیں علم و کمالات سے خالی
مشرق ہی کے در پر کبھی مغرب تھا سوالی
ہاں ایک ادا دیکھی ہے مغرب میں نرالی
مجبور ہے مشرق کی جہاں ہمتِ عالی
یہ ایک ادا ' ناز ہے عورت کی لقا پر
مشرق مرا قرباں ہے اسی ایک ادا پر

یہ فلسفہ یہ علم یہ حکمت یہ کمالات
یہ فکر، یہ تدبیر یہ اعمال و خیالات
یہ بحث یہ تمحیص، جوابات، سوالات
یہ گولہ یہ بارود، ہلاکت کے یہ آلات
ہر صبح، جلال و غضب و طیش کی صورت
ہر شام، جمال و طرب و عیش کی صورت
یہ قول و عمل، ولولہ و عقل و فراست
یہ ضبط یہ نظم اور یہ تدبر یہ سیاست
یہ شان یہ شوکت یہ تکلف یہ نفاست
حاوی ہے ہر اک بات پہ اک حرفِ ریاست
اس حرف میں ہر کام کی تحریک نہاں ہے
پھر اس میں بھی اِک نکتۂ باریک نہاں ہے
یہ نکتۂ باریک ہے بے شک سبق آموز
عریاں ہے اس آئینے میں اِک شکلِ دل افروز
مقصود ریاست کا ہے روشن صفتِ روز
اس ابر میں خنداں ہے عجب برقِ جہاں سوز
یہ برقِ جہاں سوز ہے حسنِ زنِ مغرب
حسنِ زنِ مغرب ہی سے ہے خرمنِ مغرب

بازار میں ہے گرمیِ بازار اسی سے
آتے ہیں دکانوں میں خریدار اسی سے
سودا یہی چلتا ہے بیوپار اسی سے
اشرفیوں کی جیبوں میں ہے کھنکار اسی سے
ہر کوچہ و برزن میں ہے تشہیر اسی کی
دیکھی در و دیوار پہ تصویر اسی کی
میخانوں میں ہے رنگِ مے و جام اسی کا
کس کا ہے لہو بادۂ گلفام ——اسی کا
تصویر کے پردے پہ بھی ہے کام اسی کا
اخبار کے صفحوں میں بھی ہے نام اسی کا
اور سازِ سیاست کی بھی دمساز یہی ہے
ظاہر کبھی ہوتا نہیں جو راز، یہی ہے
کہتے ہیں ترقی کی ہے بنیاد اسی پر
ایجاد ہے یہ عالمِ ایجاد اسی پر
ظاہر میں تو افرنگ ہے آباد اسی پر
باطن کو جو دیکھو تو ہے بیداد اسی پر
عورت کو جوانی میں بناتے ہیں تماشا
ڈھل جائے جوانی تو سمجھ لیتے ہیں لاشا

مشرق میں جو زینت ہے چھپانے کے لیے
مغرب میں مگر جلوہ دکھانے کے لیے ہے
مشرق میں تو زن گھر ہی بسانے کے لیے ہے
مغرب میں یہ بیچاری کمانے کے لیے ہے
آزاد — معیشت کے سر انجام کی خاطر
مجبور ہے معصوم — ہر اِک کام کی خاطر
تشریح بدن کرتی ہیں لندن کی دکانیں
ہیرے کے یہ بازو ہیں' یہ بلور کی رانیں
پلکیں ہیں یہ تیر اور یہ ابرو ہیں کمانیں
آئینوں میں آئینہ ہیں جوبن کی اٹھانیں
یہ جلوہ مذمت نہ ستائش کے لیے ہے
بیوپار کی خاطر ہے نمائش کے لیے ہے
بے جان نمونوں میں جو یہ رنگِ ادا ہے
جاندار حسینوں کا تو پھر ذکر ہی کیا ہے
جس بت پہ نظر ڈالیے اک شانِ خدا ہے
یہ شانِ خدا ہے تو بہت ہوش ربا ہے
اللہ' جو یہ جلوہ نمائی ہے بتوں کی
تیری ہے خدائی کہ خدائی ہے بتوں کی

پیرس میں یہ انوار ہیں لندن سے زیادہ
وہ حسن ہے رنگین، یہاں حسن ہے سادہ
وہ رقصِ برہنہ، وہ اچھل کود، وہ بادہ
ہر جوش نمائش میں نہاں ایک ارادہ
یعنی کوئی ترکیب کوئی چال نکالو
جیبوں سے مسافر کی زر و مال نکالو

مہلک ہیں یہ سب رہگزر و کوچہ و بازار
ہر گام پہ صد فتنۂ محشر ہے نمودار
ایمان تو کیا جان کا بچنا بھی ہے دشوار
آنکھوں سے بھی ہشیار ہو دل سے بھی خبردار
اے دوست خطرناک ہے افتاد نظر کی
پھسلا جو قدم خیر نہیں کاسۂ سر کی

اس حسن کے انبوہِ قیامت کو تو دیکھو
اس نازو ادا و قدوقامت کو تو دیکھو
میں دیکھ رہا ہوں مری شامت کو تو دیکھو
نادار مسافر کی ندامت کو تو دیکھو
خفت وہ ملی ہے، کہ اٹھائی نہیں جاتی
دل خاک ملے، آنکھ ملائی نہیں جاتی

دیکھی ہے عجب سیر سمندر کے کنارے
تھے ریت کے ذرے فلکِ حسن کے تارے
وہ رنگ، وہ نغمہ، وہ شرارت، وہ اشارے
شمشیرِ برہنہ کے نظر سوز نظارے
پانی میں تھرکتی ہوئی سیلاب کی موجیں
اور دھوپ میں خورشیدِ جہانتاب کی موجیں

جل پریوں میں رقصاں تھے یہاں مردمِ آبی
مستی وہ فضا میں تھی کہ منظر تھا گلابی
صوفی تھے وہ سب ایک فقط میں تھا شرابی
چاہی مری آنکھوں نے مرے دل کی خرابی
ساحل نہیں میرے لیے گردابِ بلا تھا
اللہ نے بچایا مجھے میں ڈوب چلا تھا

اللہ رے ملبوسِ حسینانِ طرحدار
عریاں بھی ہے مستور بھی ہر سادۂ پرکار
خلوت کدۂ حسن و محبت ہیں چمن زار
بیٹھے ہوئے لیٹے ہوئے خوابیدہ و بیدار
گل آپ ہی سرمستِ ہوا جھوم رہے ہیں
غنچے نگہِ اہلِ رضا چوم رہے ہیں

ڈھونڈے سے بھی ملتی نہیں آنکھوں کو پناہیں
لڑتی ہیں سرِ راہِ نگاہوں سے نگاہیں
لیکن یہ تعجب ہے کہ اٹھتی نہیں آہیں
چڑھتے ہیں نشے زیبِ کمر ہوتی ہیں باہیں
اس جوشِ ملاقات میں حائل نہیں کوئی
فرسودہ خیالات کا قائل نہیں کوئی

کمزور دلائل کی پناہوں میں جوانی
بے باک ہوسناک نگاہوں میں جوانی
اٹھلائی ہوئی پھرتی ہے راہوں میں جوانی
مشغول ہے معصوم گناہوں میں جوانی
بجلی کی چمک خندۂ گفتار سے پیدا
شعلے کی لپک گرمیٔ رفتار سے پیدا

قانون جہاں برسرِ بیداد نہ آئے
کیوں وصل سے ہر اہلِ ہوس شاد نہ آئے
خود حسن پہ جب تک کوئی افتاد نہ آئے
کوشش یہی ہوتی ہے خدا یاد نہ آئے
مادر پدر آزاد سے کیا کام خدا کا
مجبور ہی لیتے ہیں فقط نام خدا کا

افرنگ میں دراصل حسینوں کی ہے شاہی
قبضے میں انھی کے ہے سفیدی و سیاہی
ہوتی ہے انھی کے لیے اوروں کی تباہی
فوجیں اسی خاطر، اسی خاطر ہیں سپاہی
توپوں سے جو ہوتی ہے یہ اقوام کی خاطر
اے حسن یہ ہے سب ترے آرام کی خاطر
خوش ہو مرے مشرق تری قسمت ہے نرالی
مغرب کے لبوں پر ہے ترے خون کی لالی
کالا ہے یہ چہرہ، مری ہڈی نہیں کالی
پس کر بھی مری خاک نہیں جھینپنے والی
یہ باغ ہے میرے ہی لہو سے تر و تازہ
ہے راکھ مری ہی رخِ افرنگ کا غازہ
اب میرا اسلام اے مرے اربابِ عنایات
جاتا ہوں کہ مطلوبِ وطن ہیں مری خدمات
رکنے کی اجازت نہیں دیتے مرے حالات
اور یاد بھی ہیں شیخِ طریقت کی ہدایات
شاعر کے لیے دور کا دیدار ہی بس ہے
نظارہ بڑی بات ہے باقی تو ہوس ہے

صحت کی خرابی نے بھی کچھ بات نباہی
کچھ قلتِ زر سے بھی کوئی چیز نہ چاہی
ماتم میں جوانی کے یہ گزری ہے پچھاہی
اس پر بھی گنہگار ہوں توبہ ہے الٰہی!
یہ دیدہ و دل تیرا کرم تیری عطا ہے
پھر بھی نہیں تسکیں مجھے' میری ہی خطا ہے

محض بہرِ مضحکہ

(لندن کے ایک سٹوڈیو میں)

موقلم کی جنبشیں
یہ ہاتھ...... رنگ رنگ کی گھلاوٹیں، سنوارتا نکھارتا ہوا
یہ سامنے نشستہ
اپنے گرسنہ شکم پہ دست بستہ ایک اجنبی
تیرے شاندار شہر میں نئی ''گھر نٹ'' کا یہ آدمی
کسی قدیم نسل اور وحشیانہ دور کا یہ فرد
میرے جنگجو قبائلِ وطن کا شیر مرد
جس کے سر پہ ہے بندھا ہوا
پشاوری بنت کا ایک پارچہ
مٹے ہوئے سے رنگ کی کلاہِ زرنگار پر
جبینِ نصف جس کے خم سے ہے ڈھکی ہوئی

ٹکے ہوئے ہیں جس پہ دو سیاہ ابروؤں کے شاہکار
جیسے در نیام منتظر ہوں بہرِ کار تیغ ہائے آب دار
جن کے تحت تابدار و دور بین و شعلہ ریز
اک عقاب کی نگاہ، بے پناہ و تند و تیز
اک نگاہ، جس کی قہرمانیوں کے سامنے
کبھی تھے گرد برد، یہ زمین و آسمان و مہر و ماہ
اور یہ انگارہ برق پارہ
یہ جمالِ رنگِ رخ، جلالِ آفتابِ ضوفشاں
سیاہ ریش، جس کے سائے میں
حیاتِ تازہ کا دفینہ زیر سینہ ہے نہاں
اور مصوری کا یہ ''سٹوڈیو''
تیرا ''معملِ'' خموش
جس میں آٹھ دس شلنگ کے عوض
تو نے لا کے بھر لیا ہے
ایشیا کے قلب کا خروش
محض بہرِ مضحکہ، محض بہرِ مضحکہ جسے
جگا رہی ہیں بار بار
تیرے موقلم کی جنبشیں......!

شکاری اور شکار

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

از رومیؔ

شیروں کو آزادی ہے

شیروں، سانپوں، شاہینوں، گھڑیالوں اور نہنگوں کی آزادی ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی تھی دنیائے انسانی کی آج کیا صورت حال ہے ؟ یہ ایک سوال ہے...... جس کا جواب شاید کوئی دوسرا شاعر لکھے۔ (۱۹۵۸ء)

شیروں کو آزادی ہے
آزادی کے پابند رہیں
جس کو چاہیں چیریں پھاڑیں
کھائیں پئیں آنند رہیں

سانپوں کو آزادی ہے
ہر بستے گھر میں بسنے کی
ان کے سر میں زہر بھی ہے
اور عادت بھی ہے ڈسنے کی

شاہیں کو آزادی ہے
آزادی سے پرواز کرے
ننھی منی چڑیوں پر
جب چاہے مشقِ ناز کرے

پانی میں آزادی ہے
گھڑیالوں اور نہنگوں کو
جیسے چاہیں پالیں پوسیں
اپنی تند اُمنگوں کو

انساں نے بھی شوخی سیکھی
وحشت کے ان رنگوں سے
شیروں، سانپوں، شاہینوں
گھڑیالوں اور نہنگوں سے

انساں بھی کچھ شیر ہیں
باقی بھیڑوں کی آبادی ہے
بھیڑیں سب پابند ہیں،
لیکن شیروں کو آزادی ہے

شیر کے آگے بھیڑیں کیا ہیں
اک من بھاتا کھاجا ہے
باقی ساری دنیا پرجا
شیر اکیلا راجا ہے

بھیڑیں لا تعداد ہیں لیکن
سب کو جان کے لالے ہیں
ان کو یہ تعلیم ملی ہے
بھیڑیے طاقت والے ہیں

ماس بھی کھائیں کھال بھی نوچیں
ہر دم لاگو جانوں کے
بھیڑیں کاٹیں دورِ غلامی
بل پر گلہ بانوں کے

شیر ہیں دعویدار کہ ہم سے
امن ہے اس آبادی کا
بھیڑیں جب تک شیر نہ بن لیں
نام نہ لیں آزادی کا

انسانوں میں سانپ بہت ہیں
قاتل بھی زہریلے بھی
ان سے بچنا مشکل ہے
آزاد بھی ہیں پھرتیلے بھی

سانپ تو بننا مشکل ہے
اس خصلت سے معذور ہیں ہم
منتر جاننے والوں کی
محتاجی پر مجبور ہیں ہم

شاہیں بھی ہیں چڑیاں بھی ہیں
انسانوں کی بستی میں
ان کو ناز بلندی پر
یہ نالاں اپنی پستی میں

شاہیں کو تادیب کرو
یا چڑیوں کو شاہین کرو
یوں اس باغِ عالم میں
آزادی کی تلقین کرو

بحرِ جہاں میں ظاہر و پنہاں
انسانی گھڑیال بھی ہیں
طالبِ جان و جسم بھی ہیں
شیدائے جاہ و مال بھی ہیں

پیٹ پھٹے پڑتے ہیں ان کے
یہ منہ پھاڑے بیٹھے ہیں
ہر بازار میں ہر منڈی میں
جھنڈے گاڑے بیٹھے ہیں

ان کی ہستی سے بستی ہے
بستی قبرستانوں کی
ان کی توندیں قبریں ہیں
انسانوں کے ارمانوں کی

مزدوری کا تذکرہ چھوڑو
سرمائے کا ذِکر کرو
خون کی اک اک بوند نچوڑو
ان کے پیٹ کی فکر کرو

جائیں کہاں ہر سمت کھلے ہیں
منہ سرمایہ داروں کے
ان کے منہ میں دانت نہیں
پھل ہیں خونی تلواروں کے

کھا جانے کا کون سا گُر ہے
جو ان سب کو یاد نہیں
جب تک اِن کو آزادی ہے
کوئی بھی آزاد نہیں

زر کا بندہ جتنا چاہے
عقل و خرد پر ناز کرے
مٹی میں دھنس جائے
یا بالائے فلک پرواز کرے

اس کی آزادی کی باتیں
ساری جھوٹی باتیں ہیں
کھا جانے کی ترکیبیں ہیں
پی جانے کی گھاتیں ہیں

جب تک ایسے جانوروں کا
ڈر دُنیا پر غالب ہے
پہلے مجھ سے بات کرے
جو آزادی کا طالب ہے

عزمِ آدم

بن کے بیٹھے ہیں یہ مغرور یہاں صاحب تاج
دیوتاؤں سے بشر کو ابھی لینا ہے خراج
المدد، المدد اے جذبۂ دشوار پسند
قلۂ کوہ ذرا اور بلند اور بلند
باد و باراں سے کہو جوشِ جوانی دکھلائیں
طبع حاضر ہو تو کچھ اپنی روانی دکھلائیں
سر پہ ہر ایک بلا آئے دمِ سر بازی
ژالہ کیا بامِ فلک سے ہو کلوخ اندازی

آسمانوں سے ہو یخ بستہ چٹانوں کا نزول
سرد مہری بھی یہ منظور، یہ سختی بھی قبول
امڈے سیلاب کہ طوفان قیامت توڑے
اس پہ لعنت ہے جو منہ راہِ طلب سے موڑے
ہم اولوالعزم ہیں، پیچھے نہیں ہٹنے والے
اور ہوں گے کوئی رستے سے پلٹنے والے
مٹ گئے ہم تو یہ کام اور بشر کر لیں گے
کوہ کیا چیز ہیں، افلاک کو سر کر لیں گے
بن کے بیٹھے ہیں جو مغرور یہاں صاحبِ تاج
دیوتاؤں سے بشر کو ابھی لینا ہے خراج

دیوانہ بکار......

اب ہوش آیا' حال زمانہ اب معلوم ہوا
سب فرزانے' میں دیوانہ اب معلوم ہوا

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

شعر کی تعریف میں یہ شرط بیان کی گئی ہے کہ اس کے موزوں ہونے میں شاعر کا ارادہ ضرور شامل ہو۔

(دورانِ سیاحت کشمیر) ۳۱ اگست اور یکم ستمبر ۳۹ء کی درمیانی شب یہ نظم کاغذ پر لاتے ہوئے میں اس شرط کا پابند نہیں تھا...... لہٰذا مطمئن ہوں کہ یہ فقط دیوانے کی ہنسی ہے یعنی بے معنی...... دوسری جنگِ عظیم اور اس کے بعد اور حالات کے سبب...... میرے بہت سے سخن سنج احباب کو اس میں معنی ہی معنی نظر آئے۔ مجھے اس نظم کے بارے میں ان کی سخن فہمی پر حسن ظن کا شک ہے۔

(۱)

گرم جوشی

اب سورج سر پر آ دھمکے گا
ٹھنڈا لوہا چمکے گا
اور دھوپ جواں ہو جائے گی
سٹھیائے ہوئے فرزانوں پر
اب زیست گراں ہو جائے گی
ہر اصل عیاں ہو جائے گی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب آگ بگولے ناچیں گے
سب لنگڑے لولے ناچیں گے
گردابِ بلا بن جائیں گے
روندی ہوئی مٹی کے ذرّے
طوفان بہ پا بن جائیں گے
صحرا دریا بن جائیں گے
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب سستی جال بچھائے گی
اب دھونس نہ چلنے پائے گی
مزدوروں اور کسانوں پر
اب سوکھا خون نچوڑنے والے
روئیں گے نقصانوں پر
ان کھیتوں ان کھلیانوں پر
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب پیلی دھات کی بیماری
پھیلا نہ سکیں گے بیوپاری

لوہے کا لوہا مانیں گے
سونے کی گہری کانوں میں
سو جانا بہتر جانیں گے
دَر دَر کی خاک نہ چھانیں گے
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب خون کے ساگر کھولیں گے
انسان کے جوہر کھولیں گے
چڑھ جائے گی تپ صحراؤں کو
اُٹھے گی اٹھ کر لال آندھی
پی جائے گی دریاؤں کو
باندھے گا تندہواؤں کو
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

ہر زُلف سے بچھو لپکیں گے
آنکھوں سے شرارے ٹپکیں گے
صیادوں حسن شکاروں پر
غصے کا پسینہ پھوٹے گا

موتی بن کر رُخساروں پر
اس دھوپ میں چاند ستاروں پر
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب دودھ نہ دیں گی بھینسیں گائیں
اُف اُف کرنے لگیں گی مائیں
بچے مم مم چیخیں گے
اب اونگھنے والے نکھٹو شوہر
"عقلِ مجسم" چیخیں گے
سب درہم برہم چیخیں گے
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب خانقہوں کی مردہ اُداسی
روزِ ازل کی بھوکی پیاسی
جھومے گی مے خانوں پر
اب ساقی ' مغبچے ' پیرِ مغاں
نیچیں گے وعظ دکانوں پر
ان زہر بھرے پیمانوں پر
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

زور آوری سے کمزوروں کی
اب جیب کٹے گی چوروں کی
اور منڈی ساہو کاروں کی
اک بھوکی ''ہوحق'' سیر کرے گی
منڈیوں اور بازاروں کی
گت دیکھ کے دنیا داروں کی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

جینا ' دل گردہ ڈھونڈے گا
ہر زندہ ''مردہ'' ڈھونڈے گا
کوئی کونا کھدرا تہ خانہ
اب ہر جنگل میں منگل ہو گا
ہر بستی میں ویرانہ
اک نعرہ لگا کر مستانہ
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۲)

سرد مہری

اب جاڑا جھنڈے گاڑے گا
اور فیلِ فلک چنگھاڑے گا
اب بادل شور مچائیں گے
اب بھوت فلک پر چڑھ دوڑیں گے
دھرتی کو دہلائیں گے
ہنسنے کے مزے اب آئیں گے
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

ایوان کریں گے بھائیں بھائیں
پھونس کی جھونپڑیوں میں ہوائیں
سائیں سائیں گونجیں گی
اِس گونج میں بھوکے ننگوں کی
سنسان صدائیں گونجیں گی
ویران سرائیں گونجیں گی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ
اب بجلی کے کوڑوں سے ہوا
شمشیر بکف ' زنجیر بہ پا
لوہے کے رتھوں کو ہانکے گی
ایک ایک دھوئیں کے محمل سے
صد حسن کی ملکہ جھانکے گی
اب آگ انگارے پھانکے گی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ
اب ٹھنڈی آہوں کے پرنالے
پالے ' آفت کے پرکالے
کندے تولے برسیں گے

اب آہن ٹھنڈا پڑ جائے گا
آہن کے گولے برسیں گے
ہر سر پر اولے برسیں گے
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

تخریب کی توپیں چھوٹیں گی
تعمیر کی کلیاں پھوٹیں گی
ہر گور ستانِ شاہی میں
بالائے ہوا ، زیرِ دریا
غل ہو گا مرغ و ماہی میں
اس نو آباد تباہی میں
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب ناگن بانبی گرمائے گی
سانپ کی لالی لہرائے گی
کالے آتش دانوں میں
دانائیاں کینچلی بدلیں گی
شہروں کے بندی خانوں میں
اور دور کھلے میدانوں میں
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

بھس خالی پیٹ میں بھر نہ سکے گا
کوئی تجارت کر نہ سکے گا
سکڑی سکڑی کھالوں کی
اب منڈھ بھی جائے تو بج نہ سکے گی
نوبت پیسے والوں کی
بے کاری پر دلالوں کی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب دال نہ جاگیروں کی گلے گی
آگ مگر دن رات جلے گی
چمڑے کے تنوروں میں
اب کال پڑے گا غلّہ گا
بیوپاریوں بے مقدوروں میں
اور پیٹ بھرے مزدوروں میں
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب گاڑھا پسینہ بننے والے
اوڑھے پھریں گے شال دوشالے
مفت نہ جھولیں جھولیں گی
پھولے ہوئے گال اب پچکیں گے
پچکی ہوئی توندیں پھولیں گی
سب عقلیں چوکڑی بھولیں گی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

کدھر جاتا ہے دیوانے!

بہت سی بستیاں ہیں محشرستاں سرد لاشوں کے
طلسمی کارخانے چلتی پھرتی زرد لاشوں کے

بہت سی وادیوں میں رنگِ ہستی ننگِ ہستی ہے
جہاں اُفتاد ہی اُفتاد ہے پستی ہی پستی ہے

بہت سی محفلیں ہیں بے زبانی کے عزاخانے
جہاں بے چارگی کہتی ہے محرومی کے افسانے

بہت سی خلوتوں میں جرم ہے اقدامِ سرگوشی
مسلسل ایک سناٹا مسلسل ایک خاموشی

بہت سے دل ہیں جن میں کوئی کروٹ ہے نہ انگڑائی
بہت آنکھیں ہیں اب تک جن میں بینائی نہیں آئی

یہ لاتعداد فرزانے ہیں غیر آباد ویرانے
بہت سا کام باقی ہے کدھر جاتا ہے دیوانے

رُومان وعرفان

فغاں کاندریں لاجوردی قفس چو من بلبلے را گرفتہ نفس
دریغا کہ در صحنِ ایں کہنہ باغ چہ آوائے قمری چہ غوغائے زاغ
چو شد یادہ یاوہ گویاں بلند اُمیدی لب از نکتہ سنجی مبند

خروسِ سحر چوں بر آرد خروش
چرا بلبلِ مست گردد خموش

اُمیدیؔ رازی

نغمۂ تصویر

شورشِ ہستی کا ہنگامہ ہے میرے سامنے
کشمکش کا محشر[1] برپا ہے میرے سامنے
اک طرف سے آ رہی ہے شادیانوں کی صدا
اک طرف فریاد ہے، غوغا ہے میرے سامنے

حاصلِ محنت خزان و پائے لنگ و خارزار
رنگِ سرمایہ گل اندر گل بہار اندر بہار
سرنگون و زار و نالاں، عاجزی مزدور کی
سرفراز و شاد و خنداں نخوتِ سرمایہ دار

ہاں یہ سب کچھ ہے مگر مجھ پر اثر کچھ بھی نہیں
سب اذیت جسم پر ہے روح پر کچھ بھی نہیں
زلزلے آئے تہ و بالا ہوا نظمِ جہاں
میری دنیائے سکوں زیر و زبر کچھ بھی نہیں

---

۱ ... درست نہیں مگر ہر ایڈیشن میں اسی طرح چھپا ہے۔ (مرتب)

میں کسی بے اعتنائی پر بھی افسردہ نہیں
دوستوں کی بے وفائی پر بھی آزردہ نہیں
جب یہ حالت ہو گئی ہو قوتِ احساس کی
پھر یہ کیسے مان لوں، زندہ ہوں میں، مردہ نہیں

اب یہ ذکرِ جام و بادہ گردشِ تقدیر ہے
فکرِ رنگیں ہو کہ سادہ، شعر بے تاثیر ہے
ہاں یہی نقاشیِ فطرت ہے جو بے رنگ ہے
ہاں اسی عالم کا نغمہ، نغمۂ تصویر ہے

ڈھونڈ کر لاؤں کوئی ایسا مصور باکمال
جو مری آنکھوں میں کھینچے میری ہی تصویرِ حال
موقلم کی ٹھوکروں سے کام لے مضراب کا
جس سے آخر چیخ چیخ اٹھے مرا سازِ خیال

زندگی کا ساز چھیڑوں پھر نئے انداز سے
جس سے روحِ درد ہو بیدار خوابِ ناز سے
جاگ اُٹھے پھر مرے گونجے ہوئے نغمے کی گونج
راکھ میں شعلے بھڑک اٹھیں مری آواز سے

۱۹۲۸ء

نعرۂ تکبیر

دیکھ اُفق پر ہے ہویدا صبح صادق کا سپیدا
سرخ، نیلے، کالے، پیلے بادلوں کو چیر کر
چھا رہی ہے پھر اسی خورشید کی تابندگی
جس سے پیدا ہے ازل سے تا ابد
نور اَللّٰہُ الصَّمَد
مشرق و مغرب کی واحد زندگی
تفرقوں کے دشت میں کھوئے ہوئے سب کارواں
ہو رہے ہیں ہم رکاب و ہم عناں

اے بہانہ باز، حیلہ ساز، انبوہِ فراری
اختیاری ذِلت و خواری پہ کب تک فخر و ناز!

دیکھ ابنائے زمانہ، چل رہے ہیں کس طرح شانہ بشانہ
دیکھ، اعجازِ اخوت
کثرتِ انساں کی وحدت خیز قوت
سرفرازی، سروری کا پا گئی ہے راستہ
ہو رہی ہیں پھر صفیں آراستہ
منزلِ مقصود،
اب نہیں نابود

۱۹۳۴ء

میری جوانی

درد سے ہے لبریز پیالہ ہو گیا بے کیفی کا ازالہ
میرا قفلِ خموشی ٹوٹا قید سے چھوٹے نغمہ و نالہ

اب کی مرتبہ اک ظالم کو سوجھا ہے مضمون نرالا
میری جوانی کے منصوبے پوچھ رہا ہے پوچھنے والا

مقصد یہ ہے اپنی بیتی جگ کو پھر اک بار سنا دوں
میں یہ دکھڑے رو تو چکا ہوں کیوں نہ کلام اپنا ڈہرا دوں

میری جوانی کے منصوبے　　میرا سخن میری تحریریں
میرے ارادوں کے افسانے　　میری حسرت کی تصویریں

تو یہ سمجھا میں نے شاید　　لطف کی بات چھپا رکھی ہے
آنسوؤں کی تلخی کے سوا بھی　　اَور کوئی لذت چکھی ہے

تو یہ سمجھا میری جوانی　　اک بدمست جوانی ہو گی
رندی کا اک دریا ہو گا　　دریا میں طغیانی ہو گی

اک مے خانہ ہو گا جس میں　　بھاری بھاری مٹکے ہوں گے
دیکھ کے میری بادہ پرستی　　زاہدوں کے منہ لٹکے ہوں گے

تو یہ سمجھا میری تسکیں　　ناچ رنگ کی محفل ہو گی
اور اس منصوبے کی تہ میں　　کوئی حور شمائل ہو گی

حسن کی منڈی میں بھی شاید　　میرا آنا جانا ہو گا
رقاصہ کی چاہت ہو گی　　مطرب سے یارانہ ہو گا

کوئی ایک پری بھی ہو گی　　میرے خوابوں کی محبوبہ
جس کو اُڑا کر لایا ہو گا　　میری جوانی کا منصوبہ

یا اک حسنِ راہگزر پر　　میں نے ڈالے ہوں گے ڈورے
میری بھونڈی گردن ہو گی　　اس کے بازو گورے گورے

تیری منشا یہ ہے میں بھی　　یہ افسانے گھڑ کے سناؤں
لڑکوں کو ترغیب گنہ دوں　　بڈی بوڑھوں کی گرماؤں

تو سچا ہے تو نے دیکھا　　کچھ بھی نہیں جز نفس پرستی
جس کے بیاں سے پا لیتے ہیں　　ہلکے شاعر شہرت سستی

ڈھونڈے لے کوئی رنگیں شاعر　　جو بن پئے نہ رہ سکتا ہو
آگ نہ جب تک پیٹ میں اترے　　منہ سے حرف نہ کہ سکتا ہو

جس کے منہ کا حرف ہو گالی　　ناموسِ اشراف کے حق میں
جس کو سن کر فرق نہ سوجھے　　پاجی شاعر یا احمق میں

اہلِ نظر سے آنکھ چرائے   عاجز اور نااہلِ ہو فن سے
نا فہموں کی بزم میں جائے   نام اُچھالے مسخرہ پن سے

قہقہوں کو تحسین سمجھ لے   سر کو ہلائے، نشے میں جھومے
محنت کا حامی کہلائے   سرمائے کی چوکھٹ چومے

خون پیے مزدور کا دن کو   رات کوئی مزدورنی تاکے
جس کی جوانی کا منصوبہ   اکثر پلٹے جوتے کھا کے

اپنے بیوی بچے تج کر   چوک میں گھومے بن کر چھیلا
جس محفل جس بزم میں پہنچے   منہ سے نکلے مے لاے لا

فرش سے اچھلے ذکرِ خدا پر   عرش پہ جھپٹے گھونسہ تانے
خبطی ہے یہ، ہر کوئی سمجھے   چاہتا کیا ہے کوئی نہ جانے

جس کے شعر میں ہو بے ربطی   جس کے مضموں ہو بازاری
جس کی منزل ہو بد راہی   جس کا مقصد ہو بدکاری

اپنی ملت کا ہو دشمن   گانٹھے غیروں سے یارانہ
طعن کرے پاکانِ سلف پر   بہرِ حصولِ آب و دانہ

باہر سے ابلہ نظر آئے   اندر سے ہو پکا شاطر
دکھلائے ہر کھیل مداری   اپنے پاپی پیٹ کی خاطر

ایسا شاعر ڈھونڈ لے پیارے   اس سے رونقِ محفل ہو گی
اس کی جوانی کے منصوبے   سن کر دنیا خوش دل ہو گی

جس مسلک پر میں ہوں اس میں   رندی کو ترجیح نہیں ہے
میری جوانی کے قصے میں   سامانِ تفریح نہیں ہے

میری جوانی ہندوستانی   بے چاری مجبور جوانی
قوم و وطن کے درد میں شامل   آزادی سے دور جوانی

میری جوانی نے بھی دیکھے   جوشِ ہوس کے یہ نظارے
شرم نے لیکن پھیر لیں آنکھیں   ہوتے رہے گو لاکھ اشارے

میری جوانی کے منصوبے   شیدائے تحصیلِ ہنر تھے
جب میں جواں تھا، میرے رہبر   اہلِ دِل تھے اہلِ نظر تھے

جب بھی اکثر ہم عصروں سے   میرا نصب العین جدا تھا
یعنی شرمِ خلق تھی مجھ کو   یعنی مجھ کو خوفِ خدا تھا

۱۹۴۵ء

......کیا ہوں میں......؟

یہ خیالات عظیم
کیا ہوں میں؟
درمیانِ قعرِ دریا
اِک یتیم!
ایک تنہا درد
ایک اشکِ گرم
ایک آہِ سرد
خونِ انسانی کے ایسے قلزمِ ذخار میں
تہلکوں میں، زلزلوں میں

صاعقوں میں
اِک نوائے بے نوا
کوئی بھی سنتا نہیں
اے مرے ربِّ کریم
کیا ہے یہ اُمید و بیم
یہ خیالاتِ عظیم
کیا ہوں میں؟

۱۹۴۱ء

میرا کلامِ بہتریں

آج کل میرے کلام بہتریں کی ہے تلاش
آپ بیتی آپ کو اپنی سنا سکتا میں کاش
اک طرف فکرِ سخن تھی اک طرف فکرِ معاش
اس تصادم سے ہوا تھا شیشۂ دِل پاش پاش
عرش پر گونجی تھی اُس دم ایک آوازِ حزیں
تھی یہ آوازِ حزیں
میرا کلام بہتریں

مدتوں جنسِ سخن کے بیچنے پر تھا مدار
میری مزدوری چکاتے تھے مرے سرمایہ دار
کوڑیوں میں رولتے تھے جب وہ موتی بار بار
دید کے قابل ہوا کرتے تھے میرے شاہکار
خندہ آتا مرے لب پر، مگر اندوہگیں
خندۂ اندوہگیں
میرا کلام بہتریں

شعر کا دامن گزوں سے ناپتے تھے بے شعور
پھر سیاہی بن کے ڈھلتا تھا مری آنکھوں کا نور
بعد ازاں ہوتی تھی میری حاضری اُن کے حضور
سرد مہری دیکھتی تھی گرمیِ چشمِ غیور
پانی پانی ہو کے بہ جاتی تھی آہِ آتشیں
میری آہِ آتشیں
میرا کلامِ بہتریں

میرے دم سے جن دنوں روشن تھی ہر بزمِ سخن
شمع کہہ کہہ کر' جلاتی تھی مجھے ہر انجمن
میری بولی بولتے تھے ہم صفیرانِ چمن
پھر سرِ بازار کرتے تھے نمودِ ما و من
تھا مرے نخلِ ہنر سے خرمنِ ہر خوشہ چیں
خرمنِ ہر خوشہ چیں
میرا کلامِ بہتریں

اس نرالی گرم بازاری سے میں تنگ آ گیا
عارضِ عرضِ سخن پر اک نیا رنگ آ گیا
میرے ہاتھ اک اور ساز اک اور آہنگ آ گیا
کچھ نہ کہنے سنتے رہنے کا مجھے ڈھنگ آ گیا
اب اُڑائی جا نہیں سکتی یہ طرزِ دل نشیں
ہے یہ طرزِ دل نشیں
میرا کلامِ بہتریں

خامشی میرے سخن کا اِک نیا انداز ہے
اس نئے انداز پر تخلیقِ فن کو ناز ہے
یہ عجب نیرنگ ہے جو سر بسر اعجاز ہے
یہ عجب آہنگ ہے جو بے نیازِ ساز ہے
صورتِ بے حرف ہے اور معنیِ وجد آفریں
معنیِ وجد آفریں
میرا کلامِ بہتریں

اب چراغ اپنا تہِ دامن جلا لیتا ہوں میں
جب بھی تنہائی ملے محفل جما لیتا ہوں میں
نغمۂ دل دل ہی دل میں گنگنا لیتا ہوں میں
دل ہی دل میں رقص کر لیتا ہوں گا لیتا ہوں میں

یہ کلامِ بہتریں اب لب تک آتا ہی نہیں
لب تک آتا ہی نہیں
میرا کلامِ بہتریں

ہر ستارا اکملیت میں ہے آپ اپنی مثال
ہر گلِ رنگیں بجائے خود ہے دنیائے کمال
اے کہ تیرے لب پہ ہے "قدرِ افادی" کا سوال
دیکھ میرے آنسوؤں کا رنگ، داغوں کا جمال

ہے کلامِ بہتریں میرا نمایاں ہر کہیں
ہے نمایاں ہر کہیں
میرا کلامِ بہتریں

۱۹۴۰ء

بکوشید

مقامی بن کے آیا ہے نہ راہی بن کے آیا ہے
یہ دنیا رزم گہ ہے تو سپاہی بن کے آیا ہے

ترے شایاں نہ دنیا دار کا جامہ نہ زاھد کا
ملا ہے درگہِ حق سے تجھے عہدہ مجاہد کا

تجھے فرصت کہاں ہے محوِ ناؤ نوش ہونے کی
گھڑی سر پر کھڑی ہے اب کفن بردوش ہونے کی

۱۹۲۷ء

میری شاعری

مری شاعری ہے نظاروں کی دُنیا

یہ نغمہ سرا جوئباروں کی دُنیا
یہ ہنگامہ زا آبشاروں کی دُنیا
فلک آشنا کوہساروں کی دُنیا
یہ پھولوں کی بستی، بہاروں کی دُنیا
یہی ہے مرے شاہکاروں کی دُنیا
مری شاعری ہے نظاروں کی دُنیا

مری شاعری چاند تاروں کی دنیا
یہ رنگیں گھروندا، طلسمِ زمانہ
کھلونوں کا ہے اک بڑا کارخانہ
ہوا باندھنا اور غبارے بنانا
غبارے بنا کر فضا میں اُڑانا
مرے شعر کا شعبدہ ہے پرانا
مری شاعری چاند تاروں کی دُنیا

مری شاعری بخت یاروں کی دنیا

فلک شامیانہ ہے' پربت قناتیں

اسی اوٹ میں دیدہ و دل کی گھاتیں

ہجومِ تمنا' خوشی کی براتیں

جوانی کے دن' کامرانی کی راتیں

مرے شعر کی یہ بھی ہیں وارداتیں

مری شاعری بخت یاروں کی دنیا

مری شاعری خار زاروں کی دُنیا

تہی دستی و پستی و خستہ حالی

بگولوں سے معمور پھولوں سے خالی

وہ بیشہ کہ ہے مزرعِ خشک سالی

جہاں ابر بھولا ہے دریا نوالی

نہ بھولی اُسے بھی مری فکرِ عالی

مری شاعری خارزاروں کی دنیا

مری شاعری شہسواروں کی دنیا

بہادر، جری، سورما اور جیالے
قضا جن کی ڈھالیں، قدر جن کے بھالے
تہور کے گھوڑوں کی باگیں سنبھالے
چلے ہیں سوئے رزمگہ عزم والے
مرے شعر ہیں غازیوں کے رسالے
مری شاعری شہسواروں کی دُنیا

مری شاعری دل فگاروں کی دُنیا

یہ فریادِ خاموش نیچی نگاہیں
یہ ارماں کہ مسدود ہیں جن کی راہیں
فریبِ وفا سے کہاں تک نباہیں
مرے دیدہ و دل ہیں ان کی پناہیں
مرے شعر آنسو مرے شعر آہیں
مری شاعری دل فگاروں کی دنیا

مری شاعری بے قراروں کی دنیا

وہ ذرّہ کہ راہِ سکوں میں مخل ہے
وہ قطرہ کہ صد آتشِ مشتعل ہے
وہ دیدہ کہ بیداریِ مستقل ہے
وہ دل جس سے دل گرمیِ آب و گل ہے
مرے شعر میں بھی وہی ایک دل ہے

مری شاعری بے قراروں کی دنیا

مری شاعری خاکساروں کی دُنیا

بسیرا خس و خار و خاشاک پر ہے
مگر ہاتھ ہر خوشۂ تاک پر ہے
اگرچہ سرِ بے خودی خاک پر ہے
دماغِ خودی اوجِ افلاک پر ہے
مرے شعر کی آنکھ ادراک پر ہے

مری شاعری خاکساروں کی دُنیا

مری شاعری بادہ خواروں کی دُنیا

چلے جامِ جم بھی، جمے بزم کے بھی
مگر ساقیا دیکھ اِک اور شے بھی
یہ فریاد میری کہ ہے جس میں لے بھی
یہ نالہ مرا جو ہے پابند نے بھی
مرا شعر شیشہ بھی، نشہ بھی، مے بھی
مری شاعری بادہ خواروں کی دُنیا

مری شاعری دوستداروں کی دنیا

یہ دنیا جہاں سے الگ اک جہاں ہے
یہاں دل نوازی کا سکہ رواں ہے
یہاں آسماں ہے مگر مہرباں ہے
نہ جانے عداوت کی دُنیا کہاں ہے
مرا شعر اخلاص کا ترجماں ہے
مری شاعری دوستداروں کی دُنیا

مری شاعری غمگساروں کی دُنیا

فلک مہر پرور زمیں مہ جبیں ہے
نہ وہ سرد مہر اور نہ یہ گرمِ کیں ہے
فلک بھی حسیں ہے، زمیں بھی حسیں ہے
وہ نور آفریں یہ ظہور آفریں ہے
مرے آئنے میں کدورت نہیں ہے
مری شاعری غمگساروں کی دنیا

مری شاعری میرے پیاروں کی دنیا

وہ پیارے کہ سوئے عدم جا چکے ہیں
وہ کلیاں وہ غنچے جو مرجھا چکے ہیں
ترانے جو آرام فرما چکے ہیں
خزانے جنھیں لوگ دفنا چکے ہیں
مرے شعر میں زندگی پا چکے ہیں
مری شاعری میرے پیاروں کی دُنیا

مری شاعری انتظاروں کی دُنیا
کبھی میں بھی ہو جاؤں آزاد شاید
اسیری کی گھٹ جائے میعاد شاید
سنی جائے اک روز فریاد شاید
وہ بھولے سے کر لے مجھے یاد شاید
وہاں کام آئے یہ رُوداد شاید
مری شاعری انتظاروں کی دُنیا

مری شاعری ہے اشاروں کی دنیا
فلک پر ہیں گردش میں چاند اور تارے
زمیں پر بہار و خزاں کے نظارے
برابر چلے جا رہے ہیں بچارے
کہ ذوقِ نظر دے رہا ہے سہارے
مگر کون سمجھے یہ نازک اشارے
مری شاعری ہے اشاروں کی دُنیا

۱۹۴۰ء

یارانِ تیز گام

نے منزل کو جا لیا

مثالِ گردِ میری خاک بھی گرمِ تعاقب ہے
کہ اُترے گا کہیں تو شہسوارِ نازِ توسن سے

وفات کی برات

رُوح مجروح، تن بدن مفتوح
واہ وا، کیا حیات پائی ہے
ابرِ راحت کا جس پہ سایہ ہو
دِن ملا ہے نہ رات پائی ہے
حوصلے تھے بہت مگر سب نے
رفتہ رفتہ وفات پائی ہے
تابِ نظارہ پائی ہے لیکن
قیدِ شش جہات پائی ہے
کائنات اپنی جانتا ہوں میں
بس یہی کائنات پائی ہے

وادیٔ اشک آفریں ہے جہاں
بارشِ واردات پائی ہے
پا چکا ہوں وہ دردِ دل جس نے
مجھ میں بھی کوئی بات پائی ہے
یاد ہے جس کو دوست کا احساں
ایک اپنی ہی ذات پائی ہے
غم نہیں ہے کہ موت سے میں نے
راحتِ التفات پائی ہے
اے خوشا یہ شکستِ کعبۂ دِل
دولتِ سومنات پائی ہے
مل گیا ہے نشانِ منزلِ دوست
جستجو سے نجات پائی ہے
یہ شبِ زندگی ہے صبحِ مراد
تیرگی میں برات پائی ہے

آغا حشر

حشر کا بھی کام پورا ہو گیا
لو یہ ہنگامہ بھی آخر سو گیا
اور اک روشن ستارہ ٹوٹ کر
رات کی تاریکیوں میں کھو گیا

ختم ہوتی جا رہی ہے زندگی
موت کو شرما رہی ہے زندگی
ہے اگر مرنا بھی جینے ہی کا نام
زندگی کو کھا رہی ہے زندگی

کس قدر آباد ہے دنیائے دوں
مُردہ و افسردہ و خوار و زبوں
خاک کا پیوند ہونے کے لیے
صورتِ اشکِ ندامت سرنگوں

اہلِ دل کی زندگی ہے زندگی
رُوح کی تابندگی ہے زندگی
ہو گئے رخصت جہاں نور و سرور
کچھ نہیں شرمندگی ہے زندگی

حیف وہ آنکھیں جو مے خانہ نہیں
خاک اُس دِل پر جو پیمانہ نہیں
موت ہے نشہ اُتر جانے کا نام
زندگی جز رقصِ مستانہ نہیں

حشر تھا ہنگامہ عیش و نشاط
اک تلاطم خیز موجِ انبساط
آسمانوں کو تہ و بالا کرے
اے خدا، اک آدمی کی یہ بساط

عاقلی فرزانگی کی بات ہے
عاشقی دیوانگی کی بات ہے
عاقلی اس پر مسلسل عاشقی
واقعی مردانگی کی بات ہے

کون ہے جو حشرؔ کا ہو جانشیں،
عرش ہو جس کے تخیل کی زمیں
نعرہ زن ہو گنبدِ افلاک پر
ہے کوئی ایسا ؟ نہیں کوئی نہیں

کون عاقل ہے جو دیوانہ بنے
غمکدے میں غم سے بیگانہ بنے
زندگی جس کی حقیقت ہو حفیظؔ
اور مر جائے تو افسانہ بنے

سر سید راس مسعود

یہ ہست و نیست 'یہ' ہے اور نہیں 'یہ بود و نبود
خدا ہی جانے خدا کو ہے اس سے کیا مقصود
نہاں ترنمِ بلبل میں نالۂ ماتم،
عیاں تبسمِ گل سے ہے چشمِ اشک آلود
کمالِ عقل جہالت، مآلِ عشق جنوں
مثالِ حسن ہے شعلہ، زوالِ شعلہ ہے دُود
"زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است"
اسی کا نام ہے دنیا، یہی ہے بزمِ شہود؟
گناہگار ہوں بے شک اس ایک ساعت کا
کہ اک نظارۂ دل کش سے روح تھی خوشنود
دو جلوے مجھ کو نظر آئے ایک صورت میں
وہ عشق و عقل کہ دنیا سے آج ہیں مفقود

وہ جس کی ذات سے زندہ تھا عشقِ سرسید
وہ جس کی بات میں قائم تھی دانشِ محمود
وہ اک نمونۂ اخلاص و پیکرِ ایثار
جسے نہ ذوقِ نمائش نہ شوقِ نام و نمود
وہ عزمِ حوصلہ مند اور وہ نگاہِ بلند
وہ طبعِ فقر پسند و مزاجِ قلزمِ جود
مری جبینِ عقیدت کو چومنے والا
مرا شفیق، مرا قدر داں، مرا مسعود
وہ ایک دارِ اماں تھا مرا بروئے زمیں
وہ اِک پناہ تھی میری بزیرِ چرخِ کبود
میں اس کی بزم میں آیا تو اٹھ گیا وہ بھی
طلب نے ہاتھ بڑھایا تو کچھ نہ تھا موجود
شریکِ بزمِ وجود آج بھی ہوں میں لیکن
نہیں ہوں اپنی خوشی سے شریکِ بزمِ وجود
خدا و خلق سے جب تک ہے واسطہ اے دوست
نہ خامشی کی اجازت نہ اذنِ گفت و شنود
حفیظ مرگِ احبا کے بعد زندہ ہوں
یہ زندگی ہے کہ پابندیِ رسوم و قیود

اقبالؔ

زِندگی میں

اک تھکا ہارا مسافر ہوں اندھیری رات ہے
کوئی سنگی ہے نہ ساتھی' بس خدا کی ذات ہے
کارواں غولانِ صحرائی کو ''رہبر'' مان کر
ہو چکا گمراہ ' گمراہی کو منزل جان کر
ہمرہوں کے اِس چلن سے دامنِ دل چاک ہے
آہ اس اقدام کا انجام عبرت ناک ہے
دیدہ ہائے غول کو سمجھے چراغاں کی بہار
توڑ کر عزمِ سفر' سب چھٹ گئے پروانہ وار
جانتا ہوں اس روش کی پیروی بے سود ہے
اب مجھے تنہا تلاشِ منزلِ مقصود ہے
پیچھے پیچھے شور و شیون کی صدا سنتا ہوا
آگے آگے جا رہا ہوں اپنا سر دُھنتا ہوا

وادیٔ ظلمات ہے کوئی نہیں ہے رہنما
ابر سے پیدا و پنہاں ہے ستاروں کی ضیا
اک ستارا ان ستاروں میں مرا دمساز ہے
نور اس کا 'میری اپنی روشنی کا راز ہے
ایک سیلابِ بقا ہے یا رواں ہے زندہ رود
میری فطرت سن رہی ہے اس کا نورانی سرود
اس کا دامانِ ضیا تو دسترس سے دور ہے
دور کے جلوے سے ہاں میری نظر معمور ہے
کیا یہی تابندگی پنہاں مرے سینے میں ہے؟
یا اسی کا عکس میرے دل کے آئینے میں ہے؟
ناظرِ جلوہ ہے وہ میں طالبِ نظارہ ہوں
عرش پر اس کی نظر' میں فرش پر آوارہ ہوں
تاہم اک نسبت تو اُس اختر کو میرے دل سے ہے
واسطہ دونوں کا شاید ایک ہی منزل سے ہے
ہے ازل کی اس غلط بخشی پہ حیرانی مجھے
عشق لافانی ملا ہے 'زندگی فانی مجھے
جس طرف جاتا ہے وہ اس سمت راہی میں بھی ہوں
طالبِ نظارہ ہائے صبح گاہی میں بھی ہوں

یہ رہِ تاریک، یہ محدود بینائی مری
یہ سفر، یہ رات کا عالم، یہ تنہائی مری
اور گھر کر آ رہی ہیں کالی کالی بدلیاں
چھا گئی ہیں بجلیاں چمکانے والی بدلیاں
ہوتی جاتی ہے فضا کچھ اور بھی تاریک و تار
سنگ قدموں سے الجھنے لگ گئے، دامن سے خار
ہوتا جاتا ہے گھنا جنگل گھنیرا اور بھی
بجلیاں چمکیں تو بڑھتا ہے اندھیرا اور بھی
خیرگی میری دلیلِ راہ بن سکتی نہیں
بجلیاں تمثیلِ جلوہ گاہ بن سکتی نہیں
سن رہا ہوں بھیڑیوں کی غرفشیں غراہٹیں
آتی ہیں کانوں میں دل دہلانے والی آہٹیں
چار سو غولوں کی آنکھیں آگ بھڑکاتی ہوئی
ٹولیاں بھوتوں کی ہنستی بولتی گاتی ہوئی
اور دیوانی ہوا بھی چیختی چنگھاڑتی
رقص کرتی، خاک اُڑاتی، گردِ دامن جھاڑتی
پُرخطر ماحول ہے لیکن چلا جاتا ہوں میں
وادیٔ پر ہول ہے لیکن چلا جاتا ہوں میں

اس سفر میں چلتے جانے کے سوا چارہ نہیں
تھک گیا ہوں میں یقیں میرا تھکا ہارا نہیں

رفتہ رفتہ سب ستارے بدلیوں نے چھا لیے
نور پارے کالی کالی ڈائنوں نے کھا لیے
ہاں فقط میرا ستارا آشکارا ہے ابھی
اس زمیں پر آسمانی اِک سہارا ہے ابھی
تیز پا تاریک عفریتوں سے ٹکراتا ہوا
چل رہا ہے نور برساتا ہوا' گاتا ہوا
ہر قدم پیغام ملتا ہے ستارے سے مجھے
سو تسلی مل رہی ہے اِک اشارے سے مجھے
کہ رہا ہے کیا ہوا گھاٹی اگر تاریک ہے
صبحِ صادق' منزلِ مقصود بھی نزدیک ہے
تو اگر گرمِ سفر ہے' راستہ کٹ جائے گا
آسماں سے ابرِ ظلمت بار بھی چھٹ جائے گا
امتحان رکھے گئے ہیں جن کی راہوں کے لیے
جلوہ خود بے تاب ہے ان کی نگاہوں کے لیے

اے مرے پیارے ستارے، میرے نورانی رفیق
ذرۂ خاکی ہوں لیکن میں ہوں تیرا ہم طریق
دیکھ، میری آنکھ سے اوجھل نہ ہو جانا کہیں
اس ہجومِ ابر میں مجھ سے نہ کھو جانا کہیں
تو اگر چاہے تو حاضر سینہ ہے تیرے لیے
یہ مری آنکھیں نہیں ہیں زینہ ہے تیرے لیے
میرے دل میں بیٹھ، مجھ کو سوئے منزل لے کے چل
ناخدا ہے تو، یہ کشتی تابہ ساحل لے کے چل
تیرا درسِ زندگی میرا شریکِ حال ہے
اے مرے روشن ستارے تو مرا اقبال ہے

اِقبال کی خبرِ مرگ

غم حوصلہ مند ہو گیا ہے
دل صبر پسند ہو گیا ہے
دریا دریا تھے میرے آنسو
اب چشمہ ہی بند ہو گیا ہے
جل جاتا ہے اشک سوزِ دل سے
یہ قطرہ سپند ہو گیا ہے
کیا لطف ہے ایسی زندگی کا
ہر سانس گزند ہو گیا ہے
اُڑنے کا قفس سے ہر بہانہ
پروازِ پرند ہو گیا ہے
گردن کے لیے یہ رشتۂ عمر
واللہ کمند ہو گیا ہے

غم کھانے کی ہو چکی ہے عادت
یہ زہر بھی قند ہو گیا ہے

اندازِ حیات و مرگِ اِقبال
میرے لیے پند ہو گیا ہے
یہ کس کو خبر تھی وصل کا شوق
پہلے سے دو چند ہو گیا ہے
شاہینِ زمیں فلک پہ خورشید
بھرتے ہی زقند ہو گیا

اقبالؔ بلند تھا ہمارا
اب اور بلند ہو گیا

۱۹۳۸ء لندن

اقبالؔ کے مزار پر

لحد میں سو رہی ہے آج بے شک مشتِ خاک اُس کی
مگر گرمِ عمل ہے جاگتی ہے جانِ پاک اُس کی
وہ اک فانی بشر تھا' میں یہ باور کر نہیں سکتا
بشر اقبال ہو جائے تو ہر گز مر نہیں سکتا
بزیرِ سایۂ دیوارِ مسجد ہے جو آسودہ
یہ خاکی جسم ہے ستر برس کا راہ پیمودہ
یہ خاکی جسم بھی اس کا بہت ہی بیش قیمت تھا
جسے ہم جلوہ سمجھے تھے' وہ پردہ بھی غنیمت تھا
اسے ہم ناپتے تھے لے کے آنکھوں ہی کا پیمانا
غزل خواں اس کو جانا ہم نے شاعر اس کو گردانا
فقط صورت ہی دیکھی اس کے معنی ہم نہیں سمجھے
نہ دیکھا رنگِ تصویر آئنے کو دل نشیں سمجھے

ہمیں ضعفِ بصارت سے کہاں تھی تابِ نظارا
سکھائے اس کے پردے نے ہمیں آدابِ نظارا
یہ نغمہ کیا ہے زیرِ پردہ ہائے ساز' کم سمجھے
رہے سب گوش بر آواز لیکن راز کم سمجھے
شکستِ پیکرِ محسوس نے توڑا حجاب آخر
طلوعِ صبحِ محشر بن کے چمکا آفتاب آخر
مقید اب نہیں اقبالؔ اپنے جسم فانی میں
نہیں وہ بند حائل آج دریا کی روانی میں
وجودِ مرگ کی قائل نہیں تھی زندگی اس کی
تعالی اللہ اب دیکھے کوئی پائندگی اُس کی
جسے ہم مردہ سمجھے زندہ تر' پائندہ تر نکلا
مہ و خورشید سے ذرّے کا دِل تابندہ تر نکلا
ابھی اندازہ ہو سکتا نہیں اس کی بلندی کا
ابھی دنیا کی آنکھوں پر ہے پردہ فرقہ بندی کا
مگر میری نگاہوں میں ہیں چہرے ان جوانوں کے
جنہیں اقبالؔ نے بخشے ہیں بازو قہرمانوں کے

لاہور-۱۹۳۸ء

ہم سفر

جستجوئے ہم سفر سے در گزر ذوقِ سفر
اب تو جگنو بھی نظر آنے لگے تابندہ تر

کرمکِ شب تاب مہر و ماہ بن سکتے نہیں
یہ مسافر کے رفیقِ راہ بن سکتے نہیں

روشنی ان کی اُنھی کی ذات تک محدود ہے
اتنے دنبالوں کے پیچھے دوڑنا بے سود ہے

راہ خود بن جائے گی نور آفریں میرے لیے
مکتفی ہے لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْن میرے لیے

تعمیر و تخریب

بہشت اور دوزخ کی راہوں سے گزرے
یہ دونوں ہماری نگاہوں سے گزرے

بنجارہ پربت

بارہ پربت: (حیدرآباد دکن) :انسان کے حسن کار ہاتھوں کے تعمیر کیے ہوئے ایک فردوس برروئے زمیں کی یاد میں

دو جانب تا حدِ نظر، پھیلے ہوئے بن کے نظارے
کوہ و دمن کے سنگ و شجر کے دشت و چمن کے نظارے
اور دو جانب حور و قصور و خلد و عدن کے نظارے
یہ بنجارہ پربت، یہ فردوسِ دکن کے نظارے
جنت میں بھی کون کرے گا ان سے زیادہ شاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

میں نے اس ویرانے کو بستی میں بدلتے دیکھا ہے
پتھر حسنِ صورت کے سانچے میں ڈھلتے دیکھا ہے
رنگ رنگ کی صنعت کا نیرنگ اچھلتے دیکھا ہے
سنگ سنگ پر شاخ و شجر کو پھولتے پھلتے دیکھا ہے
اب تک ہے یہ دید کی دنیا عید مبارکباد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

پربت کی دیو زاد چٹانیں' بنیادیں تعمیروں کی
قدرت جرأت دیکھ رہی ہے انسانی تدبیروں کی
صنعت منہ سے بول رہی ہے حاجت کیا تقریروں کی
خاموشی سے دیکھتے جاؤ دنیا ہے تصویروں کی
یہ مزدور نظر آتے ہیں مانؔی اور بہزاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اِس دنیا کی یاد مجھے

یاد مجھے تڑپائے گی اُن باہمت انسانوں کی
جن کے حسنِ عمل سے بدلی ماہیت ویرانوں کی
جن کے قدم کی ٹھوکر سے جاگی تقدیر چٹانوں کی
جن کے ہاتھوں پتھر ٹوٹے شکل بنی ایوانوں کی
ان کی ندرت کاری پر دینا ہے خراجِ داد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اِس دنیا کی یاد مجھے

کوہکن و شیریں کا قصہ' ناکامی کا افسانہ
معمولی سی نہر کی خاطر یوں سر پھوڑ کے مر جانا
دوسروں کا منظورِ نظر فرہاد سا جاہل دیوانہ
اور مرا موضوعِ سخن اک عالی ہمت فرزانہ
میں ہوں مجنوں مہدؔی کا' مطلوب نہیں فرہاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اِس دُنیا کی یاد مجھے

صبح کمندیں پھینکتی ہے جب پست و بلند ہستی پر
پہلی کرنیں سورج کی لہراتی ہیں اس بستی پر
اس بستی کے حسن کا پرتو پڑتا ہے ہر پستی پر
لاکھوں مندر کھل جاتے ہیں چشم حسن پرستی پر
سجدوں پر اکساتی ہے ہر صبح نئی اُفتاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

اس دنیا میں ذوقِ نظر پر وا ہے در آزادی کا
آزادی سے کرتا ہوں نظارا اس آبادی کا
پس منظر کہسار مسلسل ' سامنے منظر وادی کا
شاید باغِ خاص یہی ہے فطرت کی شہزادی کا
جس میں نظر آتا ہے نہ گلچیں اور نہ کوئی صیاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

مست ہوائیں پھولوں پر شبنم کے موتی رولتی ہیں
شاخوں کے آغوش میں ننھی کلیاں آنکھیں کھولتی ہیں
بلبل گل پر منڈلاتی ہے' پیڑ پہ چڑیاں بولتی ہیں
میرے دل میں توبہ کی کمزور بنائیں ڈولتی ہیں
یاد آتے ہیں گشتِ مصلیٰ' آبِ رکنا باد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

زیرِ چرخِ نیلی ساگر گہرے نیلے پانی کا
آنکھیں ہیں اور لطفِ تماشا لہروں کی جولانی کا
پہلی سی وہ کشتیِ دل ہے اور نہ جوش جوانی کا
موجِ ہوائے سیر میں لیکن عالم ہے طغیانی کا
نغموں کا اک طوفاں ہے آہنگِ آب و باد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

کرنیں دن بھر اس ساگر پر نور کا مینہ برساتی ہیں
اور ہوائیں آبِ رواں پر نقش و نگار بناتی ہیں
موجیں موج زنی کرتی ہیں اور لہریں لہراتی ہیں
نقرئی پریاں کھیلتی ہیں لڑتی ہیں پھر مل جاتی ہیں
ظالم قہقہے مارتی ہیں کہ کہ کر آدم زاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

مغرب میں ہر شام یہاں ساقی کا دریچہ کھلتا ہے
رنگِ شفق سیلاب کی صورت بامِ فلک سے ڈھلتا ہے
نیلم کے ہر ساگر میں یاقوت کا جوہر گھلتا ہے
کس کو خبر یہ خونابہ کس شے سے ملتا جلتا ہے
ہائے یہی شے ہے یہی شے ہے جس نے کیا برباد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

دن کا مسافر کرتا ہے جب فکر آسودہ ہونے کی
پچھم میں ہوتی ہے نمائش اک رنگین بچھونے کی
سورج دیوتا ٹھانتے ہیں زرین محل میں سونے کی
سوجھتی ہے دہقانِ فلک کو کھیت میں موتی بونے کی
محوِ حیرت کرتا ہے یہ مالِ لا تعداد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

جس دم نیند کی ماتی دنیا بستر پر جا سوتی ہے
قمقمہ ہائے برق سے برپا بزمِ چراغاں ہوتی ہے
پریم کی دیوی جل مندر میں چندر ہار پروتی ہے
پریم کی آنکھیں جل مندر ہیں پریم کا آنسو موتی ہے
ہر موتی کی جوت پہ دیوی کہتی ہے دَھنباد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

پینٹھ میں جیسے بنج بجریا سب بنجارے کرتے ہیں
بات بات میں گھات، مگر ہنس ہنس کے اشارے کرتے ہیں
ایسی ہی کچھ جلوہ فروشی چاند ستارے کرتے ہیں
رات رات میں لاکھوں ہی کے وارے نیارے کرتے ہیں
کیا کیا سیر دکھاتی ہے یہ دُنیائے شب زاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

ہاں یہ میرے شام و سحر ہیں' یہ دن ہیں یہ راتیں ہیں
میں ہوں اور مری آنکھوں کی عیدیں ہیں' شبراتیں ہیں
چاند ہے' سورج ہے' ساگر ہے' بادل ہے' برساتیں ہیں
تنہائی ہے' خاموشی ہے' دل کی دل سے باتیں ہیں
حاصل ہے اس دُنیا میں تخیلِ سخن ایجاد مجھے
جنت میں کب نکلنے دے گی اِس دُنیا کی یاد مجھے

ایک مہذب شہر

بمبئی میں آغازِ فساد کی ایک شام

اِک مہذب شہر رونق پر ہے، قربِ شام ہے
کوچہ و بازار میں انبوہِ خاص و عام ہے
ہر درندہ ان میں خوں آشام ہے
شاہراہوں پر ہے رفتار ترقی تیز تیز
ہر قدم ہے ولولہ انگیز اور ہنگامہ خیز
بھیڑیے ہونے کو ہیں گرمِ ستیز
ہمرکاب برق و آہن تیرگی تابندگی
موت دوڑی جا رہی ہے یا بشر کی زندگی
زیر و بالا آلۂ درّندگی
شہر زہر آلودہ ہے لیکن یہ ہوتا ہے گماں
بہ رہی ہیں چار جانب رنگ و بو کی ندیاں
مذبحوں میں خون ہو جیسے رواں

ہر دکاں شیشے میں تہذیب و تمدن کی پری
مشتری تصویرِ خوش اندامی وخوش منظری
ہر کوئی ہے درپئے غارت گری

طرّے، دستاریں، کلاہیں باوقار و وضعدار
مشرق و مغرب برابر ہم عنان و ہم کنار
شامتِ اعمال ہر سر پر سوار

ساڑھیوں، برقعوں، دوپٹوں کی ادائیں رنگ رنگ
سادہ و پرکار نسوائی قبائیں تنگ تنگ
ہائے لٹنے کو ہے یہ ناموس و ننگ

اختلافِ نسل و ملبوساتِ خوش رنگی کے ساتھ
مختلف نغمے اٹھیں جیسے ہم آہنگی کے ساتھ
پھٹ پڑے گا نعرۂ جنگی کے ساتھ

عید یا تیوہار یا تقریبِ شادی ہے کہیں
شاد ہیں کچھ اس طرح شہرِ مہذب کے مکیں
ہے کمینہ پن مگر اندر کہیں

بمبئی ۱۹۴۴ء

تقدیرِ کشمیر

کیا واقعی اب خون کے چراغ بغیر اس بہشت کی دید ممکن نہیں؟

کشمیر ہے وہ جلوہ مگر اس کی راہ میں
فرقت کی وادیاں ہیں پہاڑ انتظار کے

حفیظ

تصویرِ کشمیر

معرکہ در پیش ہے جذبات کی تفسیر کا
ہو رہا ہے تذکرہ کشمیر میں کشمیر کا
کھینچنا تصویر کا لانا ہے جوئے شیر کا
رنگ بھر دے اے قلم الفاظ میں تاثیر کا
لطف جب ہے کہ اٹھے ہر نقش اس تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چار سو پہرے کھڑے ہیں ساکت و صامت خموش
تاجِ نور ان کے سروں پر جسم ان کے سبز پوش
ایک ہی قانون قدرت کے ہیں یہ حلقہ بگوش
کچھ نہیں جز خدمتِ کشمیر کہساروں کو ہوش
روکتے ہیں راستہ ہر دشمنِ بے پیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

برف کی اونچائیاں برفاب کی گہرائیاں
رنگ و بو کی شوخیاں، پھولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پہ دیوداروں کی بزم آرائیاں
بنتے تنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں
آ گے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

برف کے دیو زاد تودے نور کے آئینہ دار
نقرئی جھیلوں میں صبح و شام عکس زر نگار
نغمہ خواں جوشاں خروشاں آبشار و جوئبار
خندۂ قدرت گل اندر گل بہار اندر بہار
کیوں شگفتہ ہو نہ دل اک شاعر دلگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ندیاں ہر سو تھرکتی ناچتی گاتی ہوئیں
کسمساتی لڑکھڑاتی پیچ بل کھاتی ہوئیں
آدمی کیا پتھروں کو وجد میں لاتی ہوئیں
اپنی اپنی منزل مقصود کو جاتی ہوئیں
کرتی جاتی ہیں نگاہوں پر عمل تسخیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تا بہ دامانِ نظر چیلوں کے دیوداروں کے بن
سینۂ ہر سنگِ خارا سے رواں نہرِ لبن
بوالہوس کے واسطے لیکن یہ رستے ہیں کٹھن
مر گیا سر پھوڑ کر ان پتھروں سے کوہکن
سن لیا تھا نام بے چارے نے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دامنِ سن مرگ سے قائم ہے فطرت کا سہاگ
حسن کی مورت امر ناتھ آئنہ ہے شیش ناگ
ہائے چشموں کی روانی ہائے چرواہوں کے راگ
اک مری آنکھوں کی ٹھنڈک اک مرے سینے کی آگ
نقشِ حیرت ہوں مجھے یارا نہیں تقریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دل ربا دو شیزگی ہے چہرۂ لولاب پر
حسنِ سادہ ہنس رہا ہے عالمِ اسباب پر
کوثر و تسنیم غش ہیں اس ردائے آب پر
رشک ہے فردوس کو اس سبزۂ شاداب پر
آب میں مے کا اثر ہے خاک میں اکسیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عام شاعر کہہ گئے کشمیر کو جنت نشاں
ورنہ جنت میں یہ حسن و رنگ و شادابی کہاں
کیا ہے جنت ' چند حوریں اِک چمن دو ندیاں
خیر زاہد کی رعایت سے یہ کہتا ہوں کہ ہاں
عالمِ بالا پہ ہے پرتو اسی کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

خوبصورت کھیت بھی ' گلزار بھی ' کہسار بھی
خوبصورت پھول بھی ' اشجار بھی ' اثمار بھی
خوبصورت ہر بشر ' مفلس بھی اور زر دار بھی
ظاہر کشمیر رنگیں بھی ہے اور پُر کار بھی
باطنِ کشمیر لیکن پیٹ ہے انجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حسن کی افراط خوبی کی فراوانی یہاں
ہے نظر کو اعترافِ تنگ دامانی یہاں
بہرِ جان و جسم ہر نعمت کی ارزانی یہاں
بے کس و محتاج لیکن نوعِ انسانی یہاں
نقش فریادی ہے یہ تقدیر کی تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کا تصویر کا

وادی و کہسار پر ایسی بہار آئی ہوئی
نخلِ آدم زاد پر لیکن خزاں چھائی ہوئی
اس قدر خوش رنگ کلیاں اور مرجھائی ہوئی
راکھ میں چنگاریاں جیسے ہوں کجلائی ہوئی

حسرت آلودہ ہے چہرہ ہر جوان و پیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اک طرف مہمانِ خوش اوقات، خوش دل، خوش لباس
اک طرف ہے، میزبان، فاقہ زدہ تصویرِ یاس
اک طرف مے کا نشہ، پھل کا مزا، پھولوں کی باس
اک طرف بے کیف مزدوری کا حاصل، بھوک پیاس

اک تماشائی ہے اک فرزند ہے کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہائے جہلم کے یہ بجرے، ہائے یہ آنچل کی اوٹ
چادرِ آبِ رواں دونوں طرف رنگین گوٹ
ہائے ہانجی کا یہ کنبہ جس کا سرمایہ ہے بوٹ
یہ مشقت، یہ فلاکت، لب پہ نغمہ، دل پہ چوٹ

شیر سے محروم ہے مالک ہے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کشتیوں کی استراحت اور باغوں کی بہار
دن چناروں کی فضائیں شب چراغوں کی بہار
ہے یہ زر داروں کی اور اونچے دماغوں کی بہار
ان کے چاکر دیکھتے ہیں دل کے داغوں کی بہار
ہے دھواں چولھے کا ان کو مشغلہ کفگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

جس کی محنت سے چمن میں روئے گل پر خندہ ہے
اس کا گھر تاریک اس کا اپنا منظر گندہ ہے
نقش صناعی کا جس کی لوح دل پر کندہ ہے
اس کی مجبوری کو دیکھو بندگی کا بندہ ہے
سانس لینے میں بھی اس کو خوف ہے تعزیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مجمعِ اضداد ہیں دیہات بھی اور شہر بھی
موت بھی طاری ہے ان پر زندگی کی لہر بھی
اس زمیں پر آسماں کا لطف بھی ہے قہر بھی
اپنے بچوں کے لیے یہ شہد بھی ہے زہر بھی
آب و گل کا یہ عجوبہ ہے عجب تخمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ چمن اغیار کی شعلہ خرامی کے لیے
یہ ثمر شیریں ہیں اپنی تلخ کامی کے لیے
زندگانی ہے یہاں مرگِ دوامی کے لیے
مائیں جنتی ہیں یہاں بچے غلامی کے لیے
ہر نفس اک سلسلہ ہے قیدِ بے زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حاکم و محکوم میں تیغ و گلو کا امتیاز
اور دونوں پائے مغرب پر ہیں مجبورِ نیاز
یہ برہمن کے بھجن یہ شیخ صاحب کی نماز
کر رہے ہیں قید نا محسوس کی رسی دراز
ہے نگاہوں سے نہاں صیاد اس نخچیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

خیر ہم کو کیا غرض اس قوم کے حالات سے
بدگماں ہوتی ہے دُنیا اک ذرا سی بات سے
ہم تو لطف اندوز ہونے آئے ہیں باغات سے
ہم کو دلچسپی نہیں ہے مالیوں کی ذات سے
لطف کیوں کھوئیں ہم اپنی چشمِ لذت گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چشمۂ شاہی پہ آؤ لے کے اک بوتل چلیں
شہر کے جھگڑوں سے گاندھر بل کی جانب ٹل چلیں
آؤ ویری ناگ دیکھیں آؤ اچھا بل چلیں
ہستیِ مزدور کو پیروں کے نیچے مل چلیں
اس کی یہ مسکین صورت دام ہے تزویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ غریب و مفلس و مجبور ہیں ہم کیا کریں!
کم سخن، کمزور دل مزدور ہیں ہم کیا کریں!
حسن و صنعت کے لیے مشہور ہیں ہم کیا کریں!
ان کے گھر افلاس سے معمور ہیں ہم کیا کریں!
ان کی صورت ہے نوشتہ کاتبِ تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دیکھ کر باشندۂ کشمیر کو اندوہگیں
ہنستے ہیں اہلِ تماشا کوئی ہمدردی نہیں
غیر ملکی زائروں کو ہو گیا ہے یہ یقیں
جنتی ہے مزدور ہی اس باغِ جنت کی زمیں
یہ نتیجہ ہے کسی ناگفتنی تقصیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

زائروں کا موسم گرما میں رہتا ہے ہجوم
اہلِ دل کم ' بیشتر ان میں نظر آتے ہیں شوم
منحصر مزدوریِ ارزاں پہ ہیں ان کے قدوم
ہیں تو یہ جگنو مگر خود کو سمجھتے ہیں نجوم
یہ زمیں گوشہ ہے ان کی خانگی جاگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ان کے دم سے رونقِ گلمرگ شانِ پہلگام
لیکن ان دونوں میں ہے بد ذوقیوں کا اِزدِحام
رات دن آلودہ کرتا ہے اُنھیں انبوہِ عام
حسنِ فطرت کا نہیں ان کے دلوں میں احترام
کام ہے تفریح سے جذبہ نہیں توقیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس گروہِ عام کا ہے ذوق کتنا بے بساط
یا شکم کی پرورش یا مرد و زن کا اختلاط
آ دکھاؤں میں تجھے راہِ حصول انبساط
"شام در باغِ نسیم و صبح در باغِ نشاط"
دیدۂ و دل کے لیے سامان ہے تطہیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس سے بڑھ کر اور کچھ چاہے تو شالامار دیکھ
آنکھ رکھتا ہے تو یہ رنگ گل و گلزار دیکھ
کچھ نہیں دیکھا ابھی، پھر دیکھ پھر اک بار دیکھ
شانِ مغلیہ کے یہ مٹتے ہوئے آثار دیکھ
تو نے دیکھا ہے کہیں ایسا بھی فن تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کیا تجھے معلوم ہے یہ نہر کیوں ہے بے قرار
سر پٹکتے ہیں زمیں پر کس لیے یہ آبشار
سرو کیوں ہیں پابہ گل اور دم بخود ہیں کیوں چنار
سر جھکائے کیوں کھڑے ہیں نخل ہائے باردار
سبزہ کیوں منہ تک رہا ہے آسمانِ پیر کا؟
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کون جانے کس لیے رنگین گل روتے ہیں خوں
اس حسیں بارہ دری پر سوگ سا طاری ہے کیوں
محوِ عبرت کیوں کھڑے ہیں سنگِ موسیٰ کے ستوں
کیوں شکستہ قلب فواروں کو ہے جوشِ جنوں
منتظر ہے باغ کس کے خواب کی تعبیر کا؟
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چشم شاعر کے ہیں آنسو ان کو مٹی میں نہ رول
بے خبر انمول جوہر کو ترازو سے نہ تول
ایک گوشے میں ادب سے بیٹھ جا منہ سے نہ بول
او تماشائی! تصور شرط ہے آنکھیں نہ کھول
چشم دل سے دیکھ نقشہ گردشِ تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عامیوں سے کوئی کہ دے بند کر دیں کھیل کود
باغ کو خالی کرے اہلِ نمائش کا وجود
ہو گئی ہے رات سو جائے کہیں بزمِ نمود
ہونے والا ہے یہاں اب پاک روحوں کا ورود
پیش خیمہ آگیا اک بزم خلوت گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اِک سہانی چاندنی رات اور شالامار باغ
دیکھ روشن ہو گیا ہر ایک لالے کا چراغ
خود بخود پُر کر لیے رنگین پھولوں نے ایاغ
عرش پر جانے لگا پامال سبزے کا دماغ
رنگ و بو کو بھی سہارا مل گیا تشہیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مطرب آئے نے نواز آئے مزامیر آ گئے
نغمۂ خاموش کی بن بن کے تصویر آ گئے
دفعتہً بیرونِ در کچھ اہلِ شمشیر آ گئے
اندرونِ در شہنشاہِ جہانگیر آ گئے
ساتھ اک پر نور حلقہ عدل کی زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باغ کا در پھر کھلا بادِ بہاری آ گئی
اک ردائے سبز' بہرِ پردہ داری آ گئی
صد نقاب اوڑھے ہوئے پرہیز گاری آ گئی
لیجیے نورِ جہاں کی بھی سواری آ گئی
گرد جھرمٹ عقل کا تہذیب کا تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

غنچہ و گل میں مثال بو ہوئے دونوں نہاں
باغ میں داخل ہوا شاہِ جہاں صاحبقراں
سخت گیر و داد گستر' قہرمان و مہربان
ہمرکاب اقبالِ شاہی' شان و شوکت ہم عناں
میرِ ساماں ساتھ اور سامان بھی تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

محو سیر باغ ہے یہ مرکزِ توقیر بھی
اب چمن میں گونج اٹھا اک نعرۂ تکبیر بھی
غل ہوا وہ آئے شاہنشاہِ عالمگیر بھی
فقر کے قبضے میں تخت و بخت بھی تسخیر بھی
سامنے قرآن' قبضہ ہاتھ میں شمشیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہے عجب دھندلی ضیا اجلا اندھیرا باغ میں
ہر چمن کو نور پوشوں نے ہے گھیرا باغ میں
ہے شناسا اب کوئی تیرا نہ میرا باغ میں
بانیانِ باغ کا اترا ہے ڈیرا باغ میں
خوف ہے تعزیر کا ان کو نہ دارو گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تو نے دیکھا اے تصور کیا ہے اب پھولوں کا رنگ؟
آبشاروں کا یہ نغمہ' نہر کا یہ جلترنگ
ڈل کے اندر نقرئی لہروں کی پریاں محوِ جنگ
چاند تاروں کو زمیں پر لوٹ جانے کی امنگ
بے خودی طاری ہے عالم ہے عجب تاثیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چاند ڈل میں ڈوبنے کو ہے سحر ہونے کو ہے
روز کا ہنگامہ پھر پیش نظر ہونے کو ہے
ہائے یہ منظر بھی اب زیر و زبر ہونے کو ہے
سوئے بالا پاک روحوں کا سفر ہونے کو ہے
ہم نشیں عالم ہے یہ اک نالۂ شب گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باغ کے در پر بسر راتیں کیا کرتا ہوں میں
نذر خاموشی مناجاتیں کیا کرتا ہوں میں
ماضیِ کشمیر سے باتیں کیا کرتا ہوں میں
بادشاہوں سے ملاقاتیں کیا کرتا ہوں میں
پوچھتا رہتا ہوں مقصد ان سے اس تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہنس کے فرماتے ہیں وہ اے شاعر رنگیں بیاں
تو نے دیکھے شوکتِ انسانِ فانی کے نشاں
دیکھنے والا اگر ہو زندگی کا رازداں
وہ بھی کر سکتا ہے یوں ہی حسنِ فطرت کو عیاں
ہے یہ اِک ادنیٰ نمونہ قوت و تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دیکھنے والے مگر اس بات کو سمجھے نہیں
حوصلے والوں کی نفسیات کو سمجھے نہیں
ان سبق آموز تعمیرات کو سمجھے نہیں
اور کیا سمجھیں گے اپنی ذات کو سمجھے نہیں
توڑ کر ہمت کھلونا بن گئے تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

زندگانی چار دن کی زندگانی ہی سہی
شوکتِ مغلیہ اب قصہ کہانی ہی سہی
اک سبق دیتی ہیں تعمیریں ' پرانی ہی سہی
نقش باقی ہے ہمارا نقش فانی ہی سہی
راز تو کھلتا ہے اس سے عالم تغییر کا
ایک پہلو یہ بھی کشمیر کی تصویر کا

کیا مجال دم زدن شاہوں کے ارشادات پر
شاہدِ عادل ہے تاریخ ان کے احسانات پر
جو نظر تھی قصر و ایوانات پر باغات پر
کاش وہ مرکوز ہوتی آدمی کی ذات پر
پھر بجا ہوتا گلہ کوتاہیِ تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی کشمیر کی تصویر کا

نسلِ انسانی کو ٹھہرایا گیا بے کار و زشت
رائیگاں ہوتی رہی دہقان کی زرخیز کشت
رنگ و نغمہ ساغر و مل، سبزہ و گل سنگ و خشت
خواب کے عالم کو اہلِ مقدرت سمجھے بہشت
خواب دیکھا منہ نہ دیکھا خواب کی تعبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اک جہاں کشمیریوں کے حال پر ہنستا ہے آج
نام ہے ان کا فریبی، حیلہ گر، روبہ مزاج
بے دلی، بے اعتمادی، مفلسی اور احتیاج
بندگی صدہا برس کی اور مسلسل سامراج
کس قدر ساماں فراہم ہے یہاں تحقیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اہلِ حشمت کی یہ قبریں یہ شکستہ کاخ و کو
زنگ خوردہ اسلحہ، ٹوٹے ہوئے جام و سبو
ہڈیاں مزدور کی ہیں اور کسانوں کا لہو
جس کھنڈر کو دیکھ کر اے دوست افسردہ ہے تو
یہ خرابہ ہے خدا کی بہتریں تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عشرتِ ماضی کی ہے خمیازہ کش دنیائے حال
عیش چند افراد کا لایا جماعت پر وبال
ہائے یہ مغموم مائیں زیست کے غم سے نڈھال
ہائے یہ مدقوق بچے ' ہائے روٹی کا سوال
ہائے کترا کر نکلنا ان سے ہر رہگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہم وطن ہی جب نہ اپنے ہم وطن کے کام آئے
سر پہ ہمسائے کے ہمسایہ ہی جب طوفاں اُٹھائے
کیا بنا سکتی ہے پھر اے دوست تیری ہائے ہائے
یہ مناظر دیکھتا جا اور نہ کر اظہارِ رائے
ورنہ فتویٰ ایک دن لگ جائے گا تکفیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

لبیک

مدینہ کی راہ میں

راہ پر آ ہی گئی گردشِ ایام آخر
ہو گیا روئے سفر سوئے مدینہ میرا
معجزہ جس نے نہ دیکھا ہو وہ مجھ کو دیکھے
کس طرح ڈوب کے ابھرا ہے سفینہ میرا
اپنے در پر جو بلاتے ہیں تو اتنا بھی کریں
اب کہیں اور نہ مرنا ہو نہ جینا مرا

عرفاتِ مکہ میں

اے مرے آقا! مبرا از خطا تو ہے کہ میں؟
بخش دینا کام کس کا ہے خدا تو ہے کہ میں؟
منزلِ مقصد نہیں ملتی' تو اب میں کیا کروں
راہ تیری ہے کہ میری' رہنما تو ہے کہ میں؟
دل کی یہ افتاد میں کب تک لیے پھرتا رہوں
درد تیرا ہے کہ میرا ہے' دوا تو ہے کہ میں؟

غرور

میری آنکھوں کو نور ملے نہ ملے
میرے دل کو سرور ملے نہ ملے
مگر اتنا غرور ضرور ملے
کہ جھکے میری لوحِ جبیں نہ کہیں

مجھے دامِ وفا میں پھنسا کے رکھو
تہِ دامنِ لطف چھپا کے رکھو
میرے عشق کی ہو نہ کسی کو خبر
مجھے دیکھ لے کوئی حسیں نہ کہیں

عجز

ہوا کو دیکھ نا خدا
محل نہیں غرور کا
تو ساتھ ساتھ ہے تو کیا
خدا بھی ساتھ ساتھ ہے

اُٹھا ہے دھوم دھام سے
جنازہ میرے عشق کا
حسیں بھی ساتھ ساتھ ہیں
وفا بھی ساتھ ساتھ ہے

۱۹۳۸ء

چراغِ سحر

انتساب

(ہم سفرو ہم خیال احباب کے نام)

پاکستان کے وجود مقصود پر میرا آپ کا ایمان واحد ہے۔ ہم اپنے اپنے رنگ سے ایک ہی نقابت میں ہم آہنگ ہیں۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت میں نے خود سپردگی کے لیے لاکھوں میں سے آپ کو چن لیا ہے۔ آپ میں سے کوئی ایک بھی نہیں جس کا دامن اپنے اپنے دائرہ کار و افکار میں ان نوجوان اہلِ قلم اور طلبہ پر محیط نہ ہو جو متاعِ پاکستان کے وارث ہیں۔ یہ چراغِ سحر بھی نقابت ہے ع بمصطفےٰ برساں خویش را، ہی کی۔ اگر "بولہبی" کے نتائج دکھانے میں آپ اسے مفید پائیں تو مجھے یقین ہے کہ نژادِ نو کی آنکھیں کھولنے کے لیے اس کی مدھم روشنی بھی کام آئے گی۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ نئی نسل کو روس   کے دلال کس گڑھے میں ہانکے لیے چلے جا رہے ہیں۔ میں پرانی والہانہ بے تکلفی کے ساتھ آپ سے براہِ راست خطاب کر رہا ہوں۔ جناب سب کے لیے واحد ہے اور آپ کے اسمائے گرامی میرے قلم کی زبان پر ہیں۔

لاہور: مصورِ مشرق چغتائی، احمد ندیم قاسمی، چودھری عبدالحمید مکتبۂ کارواں، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، آغا شورش، عبدالعزیز خالد، صفدر محمود، پروفیسر حمید احمد خاں، حمید کوثر، حافظ لدھیانوی۔

گجرات: پروفیسر شریف کنجاہی، جہلم: راجہ محمد افضل خاں، لائل پور: خلیق قریشی، راولپنڈی: ضمیر جعفری، عزیز ملک، ممتاز مفتی، اسلام آباد: قدرت اللہ شہاب، اے ڈی شیخ،

مختار مسعود (آواز دوست) پشاور: فضل حق شیدا، بہاولپور: کرنل نذیر علی شاہ۔

کراچی: جی الانہ، مختار حسن احسن، رئیس امروہوی، ابن انشاء اور اس کے بعد جو نام میرے نسیان کے نذر ہو گئے ہوں، ان سب کو میرا آخری سلام پہنچا دینا آپ میں سے ہر ایک کے ذمے ہے۔ آپ پاکستان کے فرزندوں کو تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ ان کو بتا سکتے ہیں کہ پاکستان علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر محض زمین نہیں، نو جوان مسلمان فرزندانِ اسلام ہیں۔

اب میں اور میرا بے تکلفانہ طرز خطاب رخصت ہوتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ ع

ہم یہاں کام آ گئے۔ آگے تمھارا کام ہے

حفیظ

مقدمہ

(پروفیسر محمد منور گورنمنٹ کالج لاہور)

میں اور ابوالاثر حفیظ جالندھری کے اس گلدستۂ فکروفن کا تعارف کراؤں ——— نہ حفیظ صاحب محتاجِ تعارف ہیں اور نہ ان کا کلام...... انھوں نے آج سے کوئی پچیس برس قبل خود ہی کہا تھا۔

تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے!
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

اور پھر یہ نہیں کہ حفیظ صاحب کسی گوشے میں بیٹھ کر شعر کہتے رہے ہوں اور اپنے شعروں کو ہوا نہ لگنے دی ہو وہ اس بات کے قائل کبھی نہ تھے کہ ع

سرِ ایں شیشہ فروبند کہ بادے نخورد

انھوں نے شعر کہے، دوستوں کو سنائے، اخباروں اور رسالوں میں چھپوائے نیز مشاعروں میں پڑھے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے نشر کیے۔ بالخصوص جہاں تک مشاعروں کا تعلق ہے وہ بقول خود پچیس برس کی عمر سے لے کر تقریباً ساٹھ برس کی عمر تک برعظیم کے دوتین چوٹی کے ''مشاعرہ باز'' شعرا میں سے ایک تھے۔ اس ضمن میں استاذ الاساتذہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا قول بڑا دلچسپ ہے۔ آپ ایک روز حفیظ صاحب کی شہرت و مقبولیت کا ذکر کرتے کرتے فرمانے لگے۔

''میں ابھی طالب علم تھا اور حفیظ صاحب شمالی ہند کے فرمانروا تھے۔''

لہٰذا حفیظ صاحب کو کون نہیں جانتا؟ ......اس کے برعکس تعارف کرانے والا سراسر غیر معروف ہے۔

اس وقت حفیظ صاحب کی عمر تہتر برس اور چند ماہ ہے۔ آج سے تقریباً تین برس پہلے یعنی

جب حفیظ صاحب ستر برس کے ہو گئے تو ان کے نیاز مند اور دوست اور میرے کرم فرما چودھری عبدالحمید صاحب (مکتبہ کارواں لاہور) نے اپنے گھر پر ایک تقریب منعقد کی جس میں بہت سے مشترک دوست مدعو تھے۔ وہاں میں نے بھی ایک مضمون (مقالہ نہیں) حفیظ صاحب کی شان میں عرض کیا تھا جس میں حفیظ صاحب کی شاعرانہ کثیرالجہتی پر بالفاظ ذیل اظہار خیال ہوا تھا:

"حفیظ صاحب کے کئی روپ ہیں اور انھیں ہر روپ کی وجہ سے الگ الگ لقب بھی حاصل ہے مثلاً: شاعر اسلام حفیظ، شاعر نعت حفیظ، شاعر کشمیر حفیظ، شاعر فطرت حفیظ، شاعر غزل حفیظ، شاعر شباب حفیظ، شاعر افواج حفیظ، گیتوں کا حفیظ، بچوں کا حفیظ، کھیتوں کا حفیظ، یہ حفیظ، وہ حفیظ، شاعر کیا ہیں اچھے بھلے عذاب الٰہی ہیں۔"

ایسے آسان اور ایسے گریز پا شاعر کے کسی مجموعہ کلام پر کوئی مربوط تعارفی تبصرہ کرنا...... بڑی ذمہ داری کی بات ہے چنانچہ اپنی طرف سے ایسی جسارت کو بڑی غیر ذمہ دارانہ حرکت جانتا ہوں۔ مگر خدا شاہد ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ قصہ یہ ہے کہ چند روز ہوئے حفیظ صاحب نے مجھے مکتبہ کارواں پر آن پکڑا اور فرمایا:

"یا منور! تم میرے آخری مجموعہ کلام ترانہ و نظم، غزل وغیرہ کا مقدمہ لکھ دو۔"

میں نے پوچھا: "آخری کیوں؟"

جواب دیا: "فی الحال یہی فیصلہ ہے۔"

میں نے کہا: "مگر آپ کے مجموعہ کلام کا مقدمہ لکھنا تو بڑا نازک کام ہے، میں اس کام کے لائق نہیں۔"

بولے: "حفیظ صاحب بہتر جانتے ہیں۔"

میں چپ ہو رہا۔

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ باتوں باتوں میں میں نے پوچھا:

"اس مجموعہ کلام کا اسم گرامی کیا ہے؟"

جواب ملا: "چراغ سحر"

میں نے عرض کیا: ''حفیظ صاحب! یہ نام مجھے پسند نہیں۔ اس نام کے سنتے ہی مجھے یہ مصرع یاد آ گیا ہے ع

''چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں''

اس نام کے پڑھنے اور سننے والوں کی اکثریت کا ذہن اسی طرف جائے گا۔ لہٰذا آپ نام بدل دیں۔

حفیظ صاحب بولے۔ ''قائداعظم کی رحلت کے ساتھ گویا قوم اور وطن کے اقبال کا مہر تاباں ڈوب گیا، رات چھا گئی، میں اس رات کی محفلوں کا تماشا بھی رہا ہوں اور تماشائی بھی ع

بساطِ بزم شبانہ کا میں ہوں افسانہ

ہاں میں ہنستا بھی ہوں، ہنسایا بھی ہے۔ میں اس وحشت ناک سناٹے میں ڈرا بھی ہوں، چوکنا بھی رہا ہوں اور للکارتا بھی رہا ہوں کہ عزیزو جاگتے رہنا، بڑا اندھیرا ہے......اور اب میں سحر کو چراغ کی طرح روشن کر رہا ہوں۔ چراغ جس کو تہ درتہ اندھیروں نے گھیر رکھا ہے۔

اب تو کچھ اور بھی اندھیرا ہے
یہ مری رات کا سویرا ہے

حفیظ صاحب نے یہ شعر پڑھا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے، آنکھیں بند کر لیں، چند لمحوں کے بعد آنکھیں کھولیں، میری طرف دیکھا، بولے:

''مقدمہ لکھو گے نا؟''

میں نے عرض کیا۔ ''ہاں''

اس پر حفیظ صاحب نے چمڑے کا سیاہ بیگ کھولا، دو بنڈل نکالے اور میرے حوالے کر دیئے۔ ایک بنڈل میں غزلیں تھیں اور دوسرے میں نظمیں، گیت، ترانے وغیرہ۔

تو یہ ہے وہ کلام جو حفیظ صاحب نے تقسیم برِعظیم کے اردگرد اور بعد قلمبند کیا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ غزل یا کوئی ایسی نظم بھی ہو جو سوز و ساز، یا، تلخابہ شیریں، میں شامل ہونے سے رہ گئی ہو اور اس مجموعے کی زینت بن رہی ہو...... ان نظموں، غزلوں اور گیتوں میں سے بیشتر

چیزیں میں نے حفیظ صاحب کی زبانی سن رکھی ہیں۔ بہت سے اشعار اہل ذوق کے یہاں مثل سائرہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں مثلاً:

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

ہر نئے دن کو ہوں میں رات سمجھنے والا
ہے کوئی آج مری بات سمجھنے والا!

کیسے بند ہوا میخانہ اب معلوم ہوا
پی نہ سکا کم ظرف زمانہ، اب معلوم ہوا

نظر آتی ہی نہیں صورت حالات کوئی
اب یہی صورت حالات نظر آتی ہے

پری رُخوں کی زباں سے کلام سن کے مرا
بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

یہ اوپر کا طبقہ خلا ہی خلا ہے
ہوا و ہوس کے غبارے چلا چل

جھگڑا دانے پانی کا ہے دام و قفس کی بات نہیں!
اپنے بس کی بات نہیں، صیاد کے بس کی بات نہیں

تیرا پھولوں کا بستر بھی راہگزار سیل میں ہے!
آقا! اب یہ بندے ہی کے خاروخس کی بات نہیں

تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے،
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

یہ اور اسی طرح کے بہت سے دیگر اشعار دلجو ہیں جو حفیظ صاحب کے دوستوں کو اور ان کے کلام سے شغف رکھنے والوں کو زبانی یاد ہیں...... رہیں نظمیں اور گیت اور ترانے تو ان میں سرفہرست ترانۂ پاکستان کا سا شاہکار ہے۔ ترانۂ پاکستان کے بعد اس دَور کی سب سے معروف

نظمیں، ترانۂ جم خانہ، مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ، جزیرے، خطبۂ صدارت اور مرثیۂ حضرتِ قائداعظم ہے۔

''چراغِ سحر'' کو سرسری نظر سے بھی دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ اس مجموعے اور سابق مجموعوں کے مابین قدرے فرق ہے اور وہ ہے رُومانی نظموں اور گیتوں کی کمی۔ اس مجموعے میں شاید ایک نظم ایسی ہے جو حفیظؔ صاحب کی رُومانی نظموں کے حلقے میں شامل کی جا سکتی ہے اور وہ ہے ...... ''مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ''...... مگر اس نظم کا حسرت ناک لہجہ صاف کہہ رہا ہے:

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

یہ نظم حفیظؔ صاحب نے اپنی گولڈن جوبلی کے موقع پر تحریر کی تھی اور اس میں اپنے ماضی کا جائزہ پیش کیا تھا۔ ترنم تو حفیظؔ صاحب کی تقریباً ہر شعری کاوش کی جان ہے۔ یہی عالم اس نظم کا ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے اور نغمگی کے ساتھ ساتھ لفظی و معنوی تناسبات کا پُرلطف منظر دیکھیے:

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

کہیں خشک پتوں میں جا کر کھڑکنا ۔۔۔ کہیں کونپلوں کے دلوں میں دھڑکنا
کہیں کاہ میں مثلِ شعلہ بھڑکنا ۔۔۔ کہیں کوہ پہ رَعد بن کر کڑکنا
کہیں قبضۂ گل میں شمشیر دینا ۔۔۔ کہیں پتھروں کے جگر چیر دینا
اگر کوہکن کو جوئے شیر دینا ۔۔۔ تو پھر پیرزن کو بھی تزویر دینا
اُجالوں کے نیچے اندھیرا دکھانا ۔۔۔ ہواؤں کا سایہ گھنیرا بنانا!
خلا میں نگاہوں کا ڈیرہ لگانا! ۔۔۔ کھلی دوپہر کو سویرا بتانا،
کبھی شاخساروں سے مل جل کے گانا ۔۔۔ کبھی ان کی سارنگیاں توڑ جانا
کبھی ابرِ لطف و کرم بن کے آنا ۔۔۔ کبھی برف باری کے طوفان اُٹھانا
کہیں چھپ کے غنچوں کی خوشبو چرانا ۔۔۔ کلی کی طبیعت کہیں گدگدانا
کفِ گل سے شبنم کے موتی گرانا ۔۔۔ سرِ برگ تھالی پہ تالی بجانا!

غزل، زمزمہ، گیت، نغمہ، ترانہ!
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ!

کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ	سرِ راہ گاتے ہوئے اک ترانہ
قدم باقدم اور شانہ بشانہ	نہ جانے کہاں سے ہوئے تھے روانہ
کوئی مبتدا تھے خبر کو چلے تھے	کہ حرفِ دعا تھے اثر کو چلے تھے
فقط سیر تھی یا سفر کو چلے تھے	نہیں جانتے تھے کدھر کو چلے تھے

چلے جا رہے تھے مگر والہانہ!
لگاتے ہوئے نعرۂ عاشقانہ

آپ نے اپنا پرانا ابوالاثر حفیظ پہچانا؟...... اور وہی اثر محسوس کیا جس کا اعتراف سرعبدالقادر نے شاہنامے کی جلد اوّل کے دیباچے میں کیا تھا، فی الواقع اثر ان کے کلام کا غلام خانہ زاد ہے۔"

یہ ٹھیک ہے کہ حفیظ صاحب کے سابق مجموعوں میں "جاگ سوزِ عشق جاگ"......"دل ہے پرائے بس میں"......"چاند کی سیر"......"سپنا"......"ابھی تو میں جوان ہوں"......"پنے جا" وغیرہ کی سی مترنم اور دلآویز نظمیں موجود ہیں جو دلوں پر جادو کا سا اثر کرتی ہیں، مگر وہ نظمیں بھی سراسر رُومانی نہ تھیں اور نہ محض فکری حظ اور جذبی سرشاری کا مرقع تھیں۔ پطرس نے جو کچھ نغمہ زار کی نظموں کے بارے میں کہا وہ دوسرے مجموعوں کی نظموں کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے۔ پطرس کے الفاظ ہیں:

"مگر یہ ایک گم کردہ راہ کی آوارگی نہیں۔ ایک مست کی لغزشیں ہیں، مستانہ لغزشیں اور بس۔" اس لیے وہ تمام حسین ترین گیت اور نظمیں بھی شانہ بشانہ چل رہی تھیں جو حقیقت کے جواہرِ بے بہا کے حسن سے مالا مال اور ترجمانِ حیات تھیں مثلاً "تیری منزل دور"، "جھوٹا سب سنسار"، "نئی بسنت"، "تلاش رہنما"، "مری شاعری ہے نظاروں کی دنیا"، "میرا کلامِ بہترین"، "اب خوب ہنسے گا دیوانہ"، "خون کے چراغ"، "ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا"، "رقاصہ"، "شیروں کو آزادی ہے" وغیرہ

تاہم قاری کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ "چراغِ سحر" کی نظموں اور ترانوں پر مقصدیت حاوی

ہے...... رومانوں کا دور ہو چکا۔ نظم کے میدان کو وسیع کرنے کا شوق جی بھر کے پورا کیا جا چکا۔ نظم کے پیکر میں غزل کی رُوح دل کھول کر دوڑائی جا چکی۔ بحور کے نئے نئے تجربات کامل ساحرانہ فنکاری کے ساتھ قابل تقلید بنا دیئے گئے۔

آپ کہیں گے اب مقصدیت کا حاوی ہونا ثابت کرتا ہے کہ حفیظ صاحب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ حفیظ صاحب فرمائیں گے، میں بدستور جوان ہوں۔ آپ کہیں گے، پھر شعر ذیل کس خوشی میں ارشاد ہوا ہے۔

یہ عجب مرحلۂ عمر ہے یا رب کہ مجھے
ہر بری بات، بری بات نظر آتی ہے

حفیظ صاحب جواب دیں گے: یہ شاعرانہ مضمون آفرینی ہے۔ اگر اعتبار نہیں تو میری یہ طویل غزل ملاحظہ فرمایئے۔ جوان ہوں یا بوڑھا؟

اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی!
ہمیشہ وصل ہی کی رات ہوتی

آپ کہیں گے اس سے تو بس تمنا کی جوانی ٹپکتی ہے نہ کہ آپ کی...... چلئے صاحب، اگر آپ نے بہتر برس کے حفیظ سے منوا بھی لیا کہ وہ بوڑھے ہو گئے ہیں تو جب بھی کون سا قلعہ سر کر لیا، آخر لوگ بوڑھے ہوتے ہی آئے ہیں۔ حفیظ صاحب کا اپنا قول ہے ع

اگر زندہ رہے انساں بڑھاپا آ ہی جاتا ہے

"چراغ سحر" کی نظموں اور گیتوں کو دیکھنے سے احساس ہوتا ہے کہ تقسیم برعظیم اور ظہور پاکستان کے بعد جب حفیظ نے ایک طرح سے ملک و ملت کے نقیب کا منصب سنبھال لیا اس لیے کہیں نعرۂ تکبیر ہے کہیں نوید فتح، کہیں احتجاج، کہیں سرزنش، کہیں شیرینی، کہیں تلخی، اور تلخی کا سبب واضح ہے۔ برعظیم کے عام مسلمانوں کی طرح حفیظ صاحب کو بھی امید تھی کہ پاکستان صحیح معنوں میں ایک فلاحی مملکت بنے گا جس میں اسلام کے روشن اصولوں پر استوار ایک معاشرہ وجود میں آئے گا۔ اس معاشرے میں اخوت و مساوات کا دور دورہ ہوگا۔ سب کے لیے حسب صلاحیت ترقی کے مواقع برابر ہوں گے۔ اخوت عوام کی قوت ہی حکومت کی طاقت ہوگی وغیرہ

......''تلخابہ شیریں'' کی ایک نظم ''شیروں کو آزادی ہے'' میں انھوں نے یہی آواز اٹھائی تھی کہ آیا آزادی کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے یہاں کے شیر اور چیتے، بھیڑوں اور بکریوں کو بدستور چیرتے پھاڑتے رہیں، سرمایہ دار اور اہل جاگیر اپنے زیردستوں اور مزدوروں کا اسی طرح خون چوستے رہیں۔ اس نظم کے آخری دو شعر یہ تھے:

جب تک ایسے جانوروں کا ڈر دنیا پر غالب ہے
پہلے مجھ سے بات کرے جو آزادی کا طالب ہے

مطلب یہ کہ حفیظ صاحب آزادی کا مفہوم صرف یہی نہیں سمجھتے تھے کہ انگریز چلا جائے اور عدو کی بالادستی سے جان چھوٹ جائے۔ ان کے نزدیک آزادی کا مطلب ہر نوع کے انتفاع ناجائز، ہر رنگ کے ظلم اور ہر طرح کی بے انصافی کا خاتمہ تھا، چنانچہ اس خیال کو انھوں نے پاکستان کے ظہور میں آنے سے چودہ روز پہلے یعنی یکم اگست ۱۹۴۷ء کو اپنی ایک نظم ''نئے دور میں'' کھل کر بیان کیا۔

یہ نظم بقول حفیظ صاحب ۳ اگست کو ایک تقریب میں پڑھی گئی جس میں قائداعظمؒ، لیاقت علی خاں اور ڈاکٹر زاہد حسین موجود تھے۔ پانچ روز بعد یہی نظم آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر کی گئی۔ نظم مذکور کا ایک بند یہ تھا ۔

نئے دور میں محنت سرمایہ گردانی جائے گی!
مفت خور کی توند نہ عالی پایہ جانی جائے گی
قدرِ ہنر معیارِ ہنر ہی سے پہچانی جائے گی
پیسے پر منقوش کوئی بھی رائے نہ مانی جائے گی

اسی چیز کو انھوں نے پاکستان کے قومی ترانے میں ''قوتِ اخوتِ عوام'' کہہ کر تعبیر کیا لیکن جس طرح دیگر ہر سوچنے والے پاکستانی کی دل شکنی ہوئی، اسی طرح حفیظ صاحب کو بھی صدمہ پہنچا۔ چنانچہ انھوں نے نظموں اور غزلوں میں بارہا اس صورت حال پر اظہارِ افسوس کیا اور اہل سیاست اور اربابِ اقتدار پر کھلے بندوں تنقید کی۔ برعظیم کی مسلم ملت نے بے حساب قربانیاں دے کر جو وطن اسلام کی خاطر اور اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ اس وطن میں جو جتنا

بااختیار تھا اتنا ہی خودغرض اور ہوس پرست ثابت ہوااور جو جتنا بے بس اور بے وسیلہ تھا وہ اتنا ہی مجرم رہا۔ اس صورت حال کی ایک جھلک ذیل کے بندوں میں ملاحظہ کیجئے جو حفیظ کی نظم ''جزیرے'' سے لیے گئے ہیں۔

قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا
مطمئن ہیں قافلہ سالار اپنے کام سے!
عہدہ و منصب کی بازی جیت کر گھڑ دوڑ میں
تھان پر ہیں درشنی گھوڑے بڑے آرام سے
قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

رہنماؤں کو سجا کر منزلِ مقصود پر،
ٹھوکریں کھاتا ہے تاریکی میں اُمت کا جلوس
جن بہشتی مقبروں پر ہو گئے روشن چراغ
ملت بیضا یہی تھے چند گنتی کے نفوس
قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

کیوں گروہِ عام کی ذلت کا غم کھائیں خواص
جن کو اس ذلت میں لذت کے ذخیرے مل گئے
کشتیاں گرداب میں چھوڑیں، خدا حافظ کہا
ناخدا خوش ہیں کہ اُن کو تو جزیرے مل گئے
قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

حیرت یہ ہے کہ اس کھلی تنقید کو اربابِ اقتدار نے سنا اور حفیظ صاحب سے باز پرس کی یعنی حفیظ صاحب تو سرکاری ملازم تھے پھر ایسی جسارت؟ مگر خود ان کے بقول...... ''میں ہر ملازمت کے دور میں حفیظ جالندھری زیادہ تھا اور ملازم کم'' ...... پھر اگر راہبروں کا عالم یہ ہو تو ان کی ''روشن مثالیں'' چھوٹوں کو کیوں متاثر نہ کریں؟

بہر حال برعظیم کا مسلمان پاکستان بنا کر اس کی تعمیر سے غافل ہو گیا جو اس وطن عزیز میں ''مقامی'' تھا وہ بھی بڑوں کی دیکھا دیکھی زر و مال کی دوڑ میں معروف ہو گیا اور جو ''مہاجر'' تھا وہ بھی۔ لاکھوں جانیں برعظیم کی تقسیم کے موقع پر برباد ہوئیں، ہزاروں عصمتیں جو لٹیں، ہزاروں مسلمان بیٹیاں جو ——— مائیں بن رہی تھیں، بھلا دی گئیں، قصاص و انتقام تو دور کی بات ہے چلو جو بسیرا بسایا تھا اسی کو مضبوط بنا لیتے تا کہ اس قلعے میں آرام سے رہتے اور خود کو ہر خطرے سے محفوظ جانتے مگر جس کا جتنا بس چلا اس نے ہوس اور غرض کے بت کا طواف کیا اور خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو بھلا دیا۔ حفیظؔ صاحب نے اس اندوہناک اور افسوسناک کیفیت پر بارہا لے دے کی۔ مثلاً ان کی نظم ''میں ہوں اب تک اسیر دانہ و دام'' کے یہ تین شعر دیکھیے:

شور و ہنگامہ نفسی نفسی کا　　ہے ثبوتِ اُخوتِ اسلام
یہ ہمارا معاشرہ یہ نظام　　کیا اسی شے کا ہے ترقی نام

دسترس ہو تو سب حلال حلال
جس پہ قابو نہیں حرام حرام

یہی فریاد اس نظم میں دہرائی گئی ہے جس کا نام ''خطبۂ صدارت'' ہے اور جس میں ملک کے اہل قلم حضرات کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ملک میں رواج پذیر بے انصافی، غربت، عدم مساوات، بے دینی اور بے اصولی کی طرف متوجہ کیا گیا اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس پریشان کن صورتِ حال کی اِصلاح کی جانب متوجہ ہوں اور متوجہ کریں۔ انہی خیالات کو علامہ اقبال کا واسطہ دے کر ''جوانوں کا اقبال'' اور ''جس کی یہ تصویر ہے'' میں دہرایا گیا ہے مگر قوم بڑے ''ضبط نفس'' کے ساتھ دیکھا دیکھی سیدھی راہ سے ہٹتی چلی گئی اور اس کی نگاہوں سے مقصودِ پاکستان اوجھل ہوتا چلا گیا۔ اہل اقتدار زینہ بہ زینہ بے مہر اور عیاش ہوتے چلے گئے۔ زردار قدم بہ قدم خونخوار اور حرام معاش ہوتے چلے گئے اور ان کی مثالیں چھوٹے حاکموں، ملازموں اور چھوٹے تاجروں اور زمینداروں کو خراب کرتی رہیں۔ نتیجہ یہ کہ طاؤس و رباب کا شوق قمار و شراب کی لت اور دیگر متعلقہ ''عفت مآب'' کارروائیاں تہذیب کا حصہ اور شرافت کا نشان بن

گئیں۔ حفیظ صاحب کی نظم ترانۂ جمخانہ اس نظارہ عبرت کا عکس بڑی خوبی سے پیش کرتی ہے۔ چند شعر دیکھیے:

عورتیں ہیں، مرد ہیں، یارانہ جمخانے میں ہے
اب تو ہر مستانی ہر مستانہ جمخانے میں ہے
یہ ثقافت ہر کلب میں ہے شرافت کا مقام
ناچ گھر موجود ہے، میخانہ جمخانے میں ہے
ناچنے میں مرد و زن پر حال طاری ہو اگر
ان کی خاطر خاص خلوت خانہ جمخانے میں ہے
ہاں جوا ہاں میگساری، ہاں بہت کچھ اور بھی
ضابطے کے ساتھ آزادانہ جمخانے میں ہے

آخری شعر انتباہ ہے اور بڑا شدید انتباہ ہے ۔

ناچتی گاتی ہوئی مٹ جانے والی قوم کا
ایک جیتا جاگتا افسانہ جمخانے میں ہے

مگر یہ قوم بڑے ذوق وشوق کے ساتھ تباہ ہوئی۔ اِنتباہ پر کان نہ دھرا۔ یہاں تک کہ آدھی سے زیادہ آبادی اور اس کا علاقہ دے بیٹھی مگر غیرت مند ایسی ہے کہ پھر بھی ناچتی اور گاتی رہی۔

حفیظ صاحب کی یہی جھنجھلاہٹ اور تلخی اس شعر غزل میں ہے ۔

بے رزم دن گزار لیا، رتجگا مناؤ!
اے اہل بزم جاگ اُٹھو رات ہو گئی،

تاہم شاعرانہ حیثیت سے آپ نے دیکھا کہ ''ترانۂ جمخانہ'' ہو۔ یا ''جزیرے'' خوش آہنگی وہی ہے جو حفیظ صاحب کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے نیز یہ کہ زندگی کے ساتھ محکم رابطہ قائم ہے...... پنڈت ہری چند اختر نے سوز وساز کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''کسی مصنف کی تصانیف کو خلا کی پیداوار سمجھنے کے بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے زمانے کی داستان

لکھنے میں کس قدر حصہ لیا ہے اور یہ حصہ کس خوبی سے لیا گیا...... حق یہ ہے کہ حفیظ صاحب نے اپنی زندگی کے ہر دور کی داستان لکھی اور ''بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب کے ساتھ لکھی''...... اوزان اور قوافی کی پابندی مانع ابلاغ نہیں ہوئی۔ اس پابندی نے آہنگ کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ مفہوم کو مزید چمکا دیا ہے۔ انھوں نے دو نظمیں ''آزاد'' بھی رقم کی ہیں جو تفنن طبع کی تخلیق معلوم ہوتی ہیں، وہ قافیے اور وزن کے ہاتھوں بے بس ہو کر نہیں لکھی گئیں۔ الفاظ پر قدرت حاصل ہو اور ان کی شناخت کا جوہر میسر ہو تو پھر بے بسی کیسی ابن خلدون لکھتا ہے کہ:

''مضامین تو راہ میں پڑے ہیں جب کہ اصل بات ہے بلیغ، سلیس اور متناسب و موزوں کلمات میں انھیں اس طرح بیان کرنا کہ حسب دلخواہ ابلاغ عمل میں آجائے''

مضامین کے باب میں ابن خلدون سے کسی قدر اختلاف کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ عام مضامین تو واقعی سامنے کی اور روبرو کی چیز ہیں اور عام آدمی کو بھی سوجھ سکتے ہیں، مگر وہ مضامین بھی تو ہیں جو بلند ہیں، باریک ہیں لہٰذا ہر ایک کو نظر نہیں آتے۔ چنانچہ جو کچھ بیدل نے دیکھا وہ غالب کو نظر نہ آیا، جو کچھ غالب نے دیکھا وہ داغ کے سامنے نہ تھا، جو کچھ علامہ اقبال نے دیکھا اس تک سینکڑوں معاصر اہل نظر کی نگاہ نہ پہنچ سکی، تاہم حقیقت یہ ہے کہ مضامین کے شایانِ شان کلمات کا انتخاب واقعی جان جوکھوں کا کام ہے اور پھر کلمات کے انتخاب کا مسئلہ محض زبان دانی اور قاموس شناسی نہیں۔ اگر یہی بات ہو تو مولوی نذیر احمد دہلوی کو مرزا غالب سے، سید سلیمان ندوی کو علامہ اقبال سے اور مولانا ابوالکلام آزاد کو حفیظ جالندھری سے بڑا شاعر ہونا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے کہ کلمات قاموس و لغات کے برف خانے میں منجمد پڑے ہیں۔ شاعر کا جذبۂ تپاں منجمد کلمات کو ان کے متحجر معانی کے سانچوں سے نکال کر اپنی مرضی کا حلیہ عطا کر دیتا ہے اور اس طرح محدود کو غیر محدود بنا دیتا ہے یعنی ایک کلمہ قاموس میں کچھ اور ہوتا ہے اور شعر میں کچھ اور، پرویز اور فرہاد اسمائے معرفہ ہیں اور معنی کے لحاظ سے معین و جامد مگر علامہ اقبال کے کلام ذیل میں دیکھیے انھیں کیا سے کیا بنا دیا گیا ہے اور معنی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا ہے:

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد!

مگر یاد رہے کہ قاموس سے یہ فنکارانہ تجاوز بہر حال بہتر سے بہتر ''ابلاغ'' کی خاطر ہے نہ کہ اغلاق و انسداد کے لیے البتہ ابلاغ اور اغلاق و انسداد کے درمیان نازک فرق کو وہی سمجھتے ہیں جنھوں نے الفاظ کی رُوح میں آتر کر اس کی حدود و قیود کو پوری طرح سمجھ لیا ہو، یہ جوہری ہی جانتا ہے کہ یہ موتی یا وہ کس مزاج کا ہے اس کے لیے کتنی ضرب قابل برداشت ہو گی اور جوہری ہی جانتا ہے کہ اس کو تراشنے کے لیے کون کون سے نازک، مضبوط، دقیق، تیز اور نکیلے آلات کی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ کس کس موتی کو کس طرح کے زیور یا نگینے کی صورت دی جاسکتی ہے۔ یہ کام دقت نظر اور طویل تجربہ چاہتا ہے جب کہیں فنی مہارت کا کوئی درجہ میسر آتا ہے، یہ نہیں کہ جو چاہے تیشہ، ہتھوڑی، چھینی اور جمور خرید کے جوہری بن بیٹھے، بڑے صبر کی ضرورت ہے۔ پتہ پانی کرنا پڑتا ہے بقول کسے ''فن کی نمود میں ننانوے فیصد حصہ خون پسینے کا ہوتا ہے اور ایک فیصد حصہ وجدان کا......''

کبھی کبھی حفیظ صاحب الفاظ کے ساتھ بڑی شریر بے تکلفی فرماتے ہیں۔ ان کے معانی کو اصل سے دور تو نہیں لے جاتے مگر اپنے ایک مخصوص لہجے کی مدد سے اور طنز کا رنگ و روغن مل کر انھیں خاصا انوکھا بنا دیتے ہیں۔ اب چند کلمات کا ''حفیظی'' استعمال دیکھیے:

ملاقات:۔ سامنے کا مضمون ہے مگر حفیظ صاحب کے شعر میں یہ کلمہ اپنے قاموسی معنی کے ساتھ کیا کچھ اضافہ کر رہا ہے۔

دیکھا جو کھا کے تیر کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

احترام:۔ عام معانی کے ساتھ کچھ اور اہتمام بھی ہے:۔

ماتمِ اہلِ ظرف کے دن ہیں
احتراماً ہیں بند میخانے

غبارہ:۔ بظاہر ایک ناشعری سا کلمہ ہے مگر شاعر نے جس غبارے کو اڑایا ہے اور گرایا ہے وہ قاموسی غبارے سے مختلف ہے:۔

خبر نہ تھی کہ غبارے گرا بھی کرتے ہیں
زمیں پہ دیکھ رہے تھے تم آسماں سے مجھے

تواضع:۔ بڑا برخوردار اور مسکین سا کلمہ ہے مگر یہاں دیکھیے اس کی شوخی اور غمزۂ غماز۔

احباب نے حفیظ تواضع تو کی بہت
لیکن ہماری شان کے شایاں نہ کر سکے

فرمانا:۔ بظاہر فرمائشی سے مضمون کا حامل ہونا چاہیے مگر حفیظ صاحب نے اسے میدانِ طنز کا غزالِ رعنا و گریز پا بنا دیا ہے۔

ہم نے روکا حفیظ کو ورنہ
اور بھی کچھ لگے تھے فرمانے

خاروخس:۔ ہوا کے نرم جھونکے اور بارش کے قطرے خاروخس کو خوابِ غفلت سے جگا بھی دیں تو انھیں بلندی پر نہیں پہنچا سکتے، اس کے برعکس آندھی اونچا اڑاتی ہے۔ طوفان سطح کو بلند کر دیتا ہے مگر کون سی آندھی؟ کون سا طوفان؟ یہ خاروخس قاموسی اور نہ آندھی قاموسی اور نہ یہ طوفان قاموسی۔

آندھی اُمڈی طوفاں آیا
قسمت جاگی خار و خس کی

حفیظ صاحب نے نغمہ زار، سوز و ساز اور تلخابۂ شیریں کے تقسیم برعظیم کے بعد کے ایڈیشنوں کے ساتھ اپنے ''بقلم خود'' لگا دیے ہیں اور اس طرح اپنی زندگی کی مختلف منازل، تعلیمی حادثات اور معاشی وقائع کے علاوہ اپنی شاعری کے ''سوانح'' سے بھی ایک حد تک آگاہ کر دیا ہے۔ انھوں نے یہی مضمون اپنے انتخابِ کلامِ حالی میں بھی دہرائے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنے ناقدوں کی رہبری بھی کی ہے اور انھیں پریشان بھی کیا ہے۔ پریشان ان معنوں میں کہ حفیظ صاحب نے اپنے ''بقلم خود'' اس وقت لکھنے شروع کیے جب وہ عمرِ عزیز کی تقریباً پچاس منزلیں طے کر چکے تھے اگر نغمہ زار کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ ''بقلم خود'' بھی تشریف لے آتا تو اس وقت حفیظ سامنے آ جاتا۔ اب نغمہ زار کی عمر تو پچیس برس ہے مگر وہ حفیظ جو اپنا تعارف کرا رہا ہے پچاس برس کا ہے۔ پچیس برس کا حفیظ، اپنے کلام، اپنے ماحول، اپنے دوستوں، دشمنوں، عزیزوں کے باب میں کیا رائے رکھتا تھا نیز اس وقت وہ جالندھر اور لاہور کو

کس نظر سے دیکھ رہا تھا۔ یہ باتیں پچاس برس کا حفیظؔ جوں کی توں نہیں بتا سکتا۔ اس وقت کا حفیظؔ آج کے حفیظؔ کی طرح اپنا ناقد نہ ہوتا لہٰذا وہ اپنی ''مرمت'' نہ کر سکتا لیکن یہ مشکل فقط حفیظؔ صاحب ہی کے بارے میں نہیں، اکثر اکابر کے ضمن میں یہی ہوتا ہے کہ وہ بوڑھے ہو کر بچپن اور نوجوانی کی باتیں کرتے ہیں...... اے کاش لوگ بچپن اور نوجوانی میں لکھتے اور پھر بڑے بوڑھے ہو کر اپنے ماضی کی کہانی خود بھی پڑھتے اور مزا لیتے...... دوسرے بھی پڑھتے اور لطف اٹھاتے، مگر ظاہر ہے کہ بات ''اے کاش'' سے آگے نہیں جا سکتی۔

تاہم اپنا تو عندیہ یہ ہے کہ شاعر کا سوانحی پس منظر اور اس کے کلام میں بیان کردہ جذبات وافکار ضروری نہیں کہ ایک ہی خط مستقیم پر یا متوازی خطوط مستقیم پر رواں ہوں کیا وہ ثقہ عالم، ماہر فلکیات ونجوم اور بلند پایہ ریاضی دان...... عمر خیام...... اپنی رباعیوں کے آئینے میں بھی وہی عمر خیام ہیں؟ کئی رند اپنے کلام میں پارسا اور کئی پارسا اپنے کلام میں رند نظر آتے ہیں، جن شعراء کی شخصیت کو محض ان کے کلام کی روشنی میں سمجھنے کی کوششیں کی گئیں۔ ان میں سے اکثر کے بارے میں غلط فہمی در آئی۔ ع

کتنے شاعر ہیں کہ ہیں شعر میں پنہاں اب تک

مثلاً اگر حفیظؔ صاحب یہ نہ بتاتے کہ انھوں نے ''محمد کی کشتی میں ہوں گا سوار'' والا شعر دوسری جماعت میں لکھا تھا نیز اگر وہ اپنے ''بقلم خود'' میں یہ نہ بتاتے کہ جالندھر میں محافل میلاد کثرت سے اور اہتمام کے ساتھ منعقد ہوتی تھیں اور انھوں نے بچپن ہی میں ان محافل میلاد میں ترنم سے نعتیں سنانا شروع کر دی تھیں اور اس اطلاع کے بغیر اگر ہمیں فقط نغمہ زار کی روشنی میں پڑھنا پڑتا تو شاہنامے تک آتے آتے خدا جانے کس بھول بھلیاں میں کھوئے رہتے اور حفیظؔ صاحب کے بدلتے ہوئے رجحانات کو کن کن موثرات کا نتیجہ جانتے۔ اکبر الٰہ آبادی کے بقول ع

''لات دنیا نے جو ماری بن گیا میں دین دار''

ہم تحقیق کرتے رہتے کہ کب حفیظؔ صاحب کو دنیا نے لات ماری اور کس زور سے ماری کہ وہ دین کی طرف راغب ہو پڑے، اس لیے کہ شاہنامے والا اور ''میرا اسلام لے جا'' والا

حفیظ نغمہ زار میں تو نہیں ملتا۔نغمہ زار کی شاعری اللہ کے فضل سے "سیکولر" ہے۔ رائٹرز گلڈ کے منشور کی طرح......

حفیظ صاحب کی سب سے وفادار مگر طناز رفیقۂ سفر حیات ان کی غزل ہے۔ گیت جوانی میں وارد ہوئے اور ادھیڑ عمری میں تشریف لے گئے۔شاہنامہ بھی جوانی میں آیا اور جوانی ہی کے دور زوال کے قریب ترکِ رفاقت کر گیا۔ یہی عالم رومانی نظموں کا ہے...... ان سب اصناف کے مقابل غزل کی مدت رفاقت طویل تر ہے۔خود بقول حفیظ (دیباچہ تلخابۂ شیریں) انھوں نے گیارہ برس کی عمر میں "اپنے ارادے سے" شعر کہنے شروع کیے۔ یعنی بلا ارادہ خدا جانے کب سے کہہ رہے تھے اور یہ شعر جو حفیظ صاحب نے اپنے ارادے سے کہنے شروع کیے غزل کے روپ میں تھے کیونکہ "یہی سکہ رائج الوقت" ان تک پہنچا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ "ابتدا میں مشق کے لیے غزل کہنا ہی مناسب تھا لیکن انتہا میں دیکھا تو یہی غزل سخن کی دشوار ترین صنف پائی......"

......غزل کے بارے میں حفیظ صاحب نے یہ بڑی پتے کی بات کہہ دی ہے، اصناف شاعری میں غزل سب سے زیادہ عشق مشرب صنف ہے اور عشق ہی کی طرح بے خبری میں آسان اور باخبری میں دشوار ہے۔نکتہ دانِ شیراز حضرتِ حافظ نے خوب کہا تھا۔

چو عاشق میشدم گفتم ببردم گوہر مقصود
ندانستم کہ ایں دریا چہ موج بیکراں دارد

حفیظ صاحب نے ہر غزل کو ایک جدا عنوان کے تحت لکھا ہے۔وہ عنوان اسی غزل کے کسی مصرعے کا کوئی ٹکڑا ہے...... مثلاً "دامن ابر بہار میں"...... "کوئی دعویٰ نہیں مجھے"...... "کھا گئی کس کی نظر مجھے"...... "اگر کوئی بے نقاب کر دے"...... "ہائے دوست"...... "اعلان کیوں نہ ہو جائے"...... "رہنما کو چھوڑ آیا ہوں"...... "مرا رہزن کہاں ہے"...... "رات باقی ہے"...... "اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی"...... وعلیٰ ہذا[1]۔اس اعتبار سے حفیظ صاحب نے عرب شعراء کی تقلید کی ہے،مگر تقلید کیوں؟ یہ تو ان کی اُپج معلوم ہوتی ہے۔انھوں نے عربی دیوان کب

[1] یہ عنوانات حذف کر دیے گئے ہیں۔(مرتب)

دیکھے جو مقلداً یہ روش اختیار کرتے؟ گویا یہ ان کی اپنی پسند ہے۔ یہی قدیم عرب شعراء کی پسند تھی...... جدید عرب شعرا بھی اسی طریق پر گامزن ہیں۔ وضاحت اس امر کی یہ ہے کہ عرب، ہر اس شعر پارے کو جس میں مضامین محبت قلمبند ہوئے ہوں صنفی اعتبار سے کہتے غزل ہی ہیں مگر ایسے ہر شعر پارے کا بالکل اسی طرح الگ عنوان قائم کرتے ہیں جس طرح ہم نظم کا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ عشقیہ شاعری کا اجتماعی لقب غزل ہے لیکن یہ نہیں کہ ایرانی اور اردو شاعروں کی طرح عرب شاعر بھی ایسے ہر شعر پارے کا عنوان محض ''غزل'' بنا دیں۔ اہل ایران اور اہل برصغیر پاک و ہند کے پاس تو یہی ایک عنوان عام ہے محبت کے یا محبت کے ہم طرز و ہم آہنگ چند شعر کہے اور اُوپر لکھ دیا ''غزل'' ......اس کے برعکس حفیظؔ صاحب نے تقریباً ہر غزل کا الگ عنوان مقرر کیا ہے محض ''غزل'' نہیں لکھ دیا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اردو کے اور کون کون سے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی تقریباً ہر غزل کو کسی جدا عنوان کے تحت درج کیا ہو۔

حفیظؔ صاحب کی غزل قدیم بھی ہے اور جدید بھی، قدیم ان معنوں میں ہے کہ غیر، رقیب قاصد، دربان، محتسب، واعظ، ناصح، مولوی، خزاں، بہار، بت، بت خانہ وغیرہ جنرک اسماء (GENERIC NAMES) اور ان کے باب میں دہرائے جانے والے مضامین روایتی انداز میں بھی موجود ہیں......اور جدید ان معنوں میں ہے کہ ان کی غزل نئے دور کا بھی ساتھ دے رہی ہے اور ایماء و اشارہ، مجاز و استعارہ اور کنایہ و علامت، جدید احوال اور جدید تقاضوں کے ترجمان ہیں اور انہی کے مطابق معنوی وسعت سے سرمایہ دار ہیں ...... رہنما، ناخدا، ساحل، سفینہ، غبارہ. فرزانہ، رات، رتجگا، جلوۂ صبح، میخانہ اور محتسب، جامِ جم، شمع، پروانہ وغیرہ کو نئی دلالتیں اور نئے معنوی التزام عطا کر دیئے گئے ہیں، روایتی انداز میں یہ فرمایا ہے:

خدا پر دیکھ کر میری نگاہیں! گلے میں ڈال دیں اس بت نے باہیں
خراباتی براتی بن رہے ہیں! یہ شاید دُختِ رَز سے مجھ کو بیاہیں

وہ خوش نصیب تم سے ملاقات کیا کرے
دربان ہی سے جس کی ملاقات ہو گئی

بہشت میں بھی ملا ہے مجھے عذابِ شدید
یہاں بھی مولوی صاحب ہیں میرے ہمسائے

مگر انھوں نے روایت سے ہٹ کر افرادِ معاشرہ کی بڑھتی ہوئی ہوس، اہلِ اقتدار کا غرور اور جاہ پسندی اہلِ اقتدار کے زوال پذیر ہوتے ہی خوشامدیوں اور ''چمچوں'' کے ہجوم کا چھٹ جانا، راہبروں کا اپنے ذاتی زوال کو ملت کی شکست قرار دینا اور یہ احساس دلانا کہ اگر ہم نہیں تو قوم کی لٹیا ڈوب گئی لہٰذا اب گردن ڈال دو، ذرا سے ذاتی فائدے کی خاطر ایمان بیچ دینا، غریبوں کا خون چوس کر کسی کارِ خیر میں برائے نمود حصہ لینا اور ثواب اندوزی کے وہم میں مبتلا ہونا، بے مقصود زندگی کا اعتراف شکست کے برابر ہونا وغیرہ

جمی ہے یہ نظر انجامِ جم پر　　　مرا مطلوب جامِ جم نہیں ہے

بت خانہ سامنے ہو تو لے کر خدا کا نام
ہے کوئی کام جس کو مسلماں نہ کر سکے؟

نچوڑ کر رگِ مزدور جام بھر بھر کر
بہت سے لوگ برائے ثواب پیتے ہیں

ساحل نہیں معلوم تو یہ سیر کہاں تک
کشتی سے بہرحال اُترنا ہی پڑے گا!

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر
ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا،

نوش ہے عنواں نیش نتیجہ ان شیریں افسانوں کا!
تذکرہ ہے انسانوں کا یہ مورومگس کی بات نہیں

صمدم اپنی اپنی راہ لگے　　　شمع کے جاں نثار پروانے!
مسلسل بتوں کی تمنا کیے جا　　　مسلسل خدا کو پکارے چلا چل
بر سرِ ساحلِ مراد یہاں　　　کون اُبھرا ہے ناخدا کے سوا
ایک کعبہ نہ بن سکا ہم سے　　　توڑ ڈالے ہزار بت خانے

یہ نمونے جو آپ کی نظر سے گزرے سارے ''چراغ سحر'' سے لیے گئے ہیں ...... آپ نے ایک بات محسوس کی ہوگی کہ ''تلخی'' میں اضافہ ہے۔ ویسے تلخ مضامین میں سے کوئی دور خالی نہیں لیکن روز افزوں خرابی حالات نے اس تلخی کو بڑھاتے بڑھاتے مردم بیزاری کی منزل تک پہنچا دیا ہے ...... اور انھیں اس امر کا اعتراف بھی ہے۔ اس باب میں ایک لطیفہ سنئے:

میں نے علاء الدین کلیم مرحوم[1] سے حفیظ صاحب کا تعارف کرایا اور حفیظ صاحب نے مرحوم کو بہت پسند فرمایا، اس پسندیدگی کا سبب پوچھا گیا تو حفیظ صاحب نے جواب دیا:

''مجھے کلیم سے مل کر بڑی ہی خوشی ہوئی ہے، وہ مجھ سے بھی زیادہ مردم بیزار ہے۔''

...... پھر یہ بھی دیکھا ہے کہ مردم بیزار لوگ اگر ترک دنیا کے غرق غور و فکر نہ ہو سکیں تو رفتہ رفتہ مردم آزار بن جاتے ہیں۔ حفیظ صاحب نے دنیا ترک نہیں کی لہٰذا کسی مرحلے پر ان کا مردم آزار ہو جانا خلافِ توقع نہ ہونا چاہیے۔ ہاں انھیں اس ارتکاب سے ایک شے تاحال ایک حد تک بچائے ہوئے ہے اور وہ ہے ان کا ذوق گپ، یار باشی، دوستوں کی محفلوں میں (بقول حفیظ صاحب) گپت

حفیظ صاحب کی ''تصویر کا ایک پہلو'' یہ بھی ہے کہ ان کا بچپنا، ان کی رفاقت نہیں چھوڑنا چاہتا، وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں۔ سال، بال اور خد و خال انھیں بوڑھا بنا رہے ہیں۔ عام لوگ انھیں بزرگ اور بزرگوار کہہ کہہ کر زخموں پر نمک چھڑکتے ہیں ...... اب سوچیے، شریر بچہ قد آور سالخوردہ ہو جائے تو کیا وہ بچہ نہیں رہتا؟ بچہ کھیلنا چاہتا ہے۔ تالیاں پیٹنا چاہتا ہے۔ اپنی خواہش کی راہ میں ذرا سی بھی رکاوٹ قبول نہیں کرتا، اگر رکاوٹ سخت ہو تو جھنجلاتا ہے، مارتا ہے چیختا ہے ...... گالی دیتا ہے ...... اس اعتبار سے حفیظ صاحب خاصے قابل رحم ہیں۔ یار انھیں چڑانا چاہیں تو آسان طریقہ یہ ہے کہ گفتگو میں دو چار بار پے بہ پے انھیں بزرگوار یا محترم وغیرہ کے الفاظ سے خطاب کیا جائے، وہ جھنجلا کر کہیں گے۔''

''ہاں مجھے یار نہ بننے دینا، مجھے بزرگ بنا کے پھینک دو، یک طرف تا کہ تنہائی مجھے پھانسی دے دے''۔

میں نے اپنے اس مضمون میں جو ان کے سترویں جنم دن پر پڑھا تھا اور جس کا حوالہ

---

[1] وفات: ۱۹۶۵ء۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد تھے۔ (مرتب)

شروع میں آ چکا ہے، یہ کہنے کی جسارت کی تھی کہ:

''حفیظ صاحب کے عمومی رویئے پر جب بھی غور کیا ہے یہی محسوس کیا ہے کہ اندر سے حفیظ صاحب ستر برس کے نہیں بلکہ ایک سات برس کے لڑکے کی طرح ہیں جو کسی گلزارِ پُر بہار میں اپنے ہم جولیوں کی ٹولی کے ساتھ تتلیوں کے تعاقب میں مصروف ہو اور اچانک شام پڑ جائے۔ شامِ بے ہنگام پر جھنجھلائے غصہ آئے مگر کچھ کر نہ پائے۔'' ساتھ ہی میں نے یہ دعا بھی کی تھی کہ:

''خدا انھیں طویل زندگی عطا کرے اور صحت دیے رکھے اور ایسے حالات مہیا کیے رکھے کہ حفیظ صاحب اپنے آپ کو لڑکپن ہی کی عمر میں سمجھتے رہیں، باغوں میں تالیاں پیٹتے رہیں تتلیوں کا تعاقب کرتے رہیں مگر تعاقب ہی میں رہیں، پکڑ نہ پائیں۔''

راز کی بات یہ ہے کہ ''پکڑ نہ پائیں'' والا فقرہ ضرورۃً بڑھایا گیا تھا۔ حفیظ صاحب سے دشمنی مقصود نہ تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ ان کی بیگم خورشید حفیظ بھی اس جلسے میں موجود تھیں...... بسا اوقات لڑکوں سے کھیلتے کھیلتے یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ کسی ممانعت یا رکاوٹ پر وہ اپنی ہاکی توڑ ڈالیں یا اپنے کسی دوست کو پیٹ ڈالیں...... بہر حال ایک پہلو یہ بھی ہے اور پیش نظر رہنا چاہیے کہ وہ صاحب کیوں جھنجھلاتے ہیں، کیوں بیزار سے رہتے ہیں اور ان کی زبان کبھی کبھی ''کارخانہ دشمن سازی'' کا کردار کیوں ادا کرنے لگ پڑتی ہے۔

ابنِ آدم کو ابنِ آدم سے　　　قبر میں بھی پناہ مشکل ہے

جس روز سے وجودِ بشر کی نمود ہے!!

اس روز سے زمین و زماں سب مزے میں ہیں

حشر کے دن بھی اے حفیظ اگر　　　ہر کوئی بے گناہ بن بیٹھا

یہ خوب کیا ہے یہ زشت کیا ہے جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے!

بڑا مزا ہو تمام چہرے، اگر کوئی بے نقاب کردے

یہاں اظہارِ حق میں کوئی بھی نقصاں نہیں بندے

خدا انساں نہیں بندے یہ عقبیٰ ہے وہ دنیا تھی

حفیظ صاحب نے ایک سے زیادہ مقام پر زبانی اور تحریری یہ اقبال کیا ہے کہ انھیں کلام سے بڑا لگاؤ تھا اور آغازِ شعر گوئی میں داغ ہی سے متاثر تھے۔ انہی کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ بعض اوقات داغ کے شعروں میں اپنے شعر داخل کر کے احباب کو سناتے اور جب احباب ان کے شعروں کو بھی داغ ہی کے سمجھ کر داد دیتے تو وہ خوش ہوتے، مگر بھلا ہو مولانا گرامی کا جنہوں نے یہ کہہ کر انھیں تقلید داغ سے باز رکھا کہ اگر تم داغ کے رنگ میں کمال بھی حاصل کر لو تو اس کمال کی داد داغ ہی کی جھولی میں پڑے گی...... تم اپنی ذات کو اجاگر کرو۔

یہ عجیب بات ہے کہ حفیظ صاحب نے داغ دہلوی کو چن لیا حالانکہ جب انھوں نے شعر کہنے شروع کیے اس وقت حضرت اکبر الہ آبادی بقید حیات تھے۔ مولانا حالی بھی زندہ تھے، کیونکہ مولانا حالی کی وفات کے وقت حفیظ صاحب کی عمر تقریباً ۱۴ برس تھی اور انھوں نے گیارہ برس کی عمر میں اپنے ارادے سے شعر کہنے شروع کیے تھے...... داغ ۱۹۰۵ء میں فوت ہو گئے تھے جبکہ حفیظ صاحب پانچ برس کے تھے...... علامہ اقبال نے بھی داغ ہی کو استاد بنایا اور حضرت اکبر الہ آبادی اور مولانا حالی کی طرف رخ نہ کیا حالانکہ آگے چل کر علامہ اقبال اور حفیظ صاحب دونوں اسی صف میں شامل ہو گئے جو حضرت اکبر اور مولانا حالی کی صف تھی۔

جب بانگ درا چھپی تو علامہ اقبال نے تقریباً وہ ساری غزلیں ترک کر دیں جو داغ کے رنگ میں تھیں۔ اب وہ باقیاتِ اقبال کی زینت ہیں۔ ان کو پڑھ کر داغ کے مضامین وطرز بیان کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بہر حال حفیظ صاحب کو علامہ اقبال سے ایک نسبت داغ کی وساطت سے حاصل تھی اور دوسری نسبت مولانا گرامی کے توسل سے مگر کمال یہ ہے کہ علامہ اقبال کا عقیدت مند اور مداح ہونے کے باوصف حفیظ صاحب نے اپنے کلام کو ان کی مخصوص تراکیب وعلامات سے یکسر بچائے رکھا نہ ان کے لہجے کا پرتو پڑنے دیا اور نہ ان کی خاص پسندیدہ بحور کو اپنایا...... اتنی کامیاب احتیاط اور "تلخابۂ شیریں" کے مصنف کی طرف سے بڑی ہمت کی بات ہے۔

تاہم حفیظ صاحب نے ہمیں کبھی یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے حضرت گرامی سے اپنی غزلوں پر باضابطہ اصلاح کتنی مدت لی، کس عمر میں اصلاح لینے لگے تھے، کس عمر میں اصلاح لینا چھوڑ

دیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مولانا گرامی کی وفات (۱۹۲۷ء) کے وقت حفیظ صاحب ۲۷ برس کے تھے اور ان کا پہلا مجموعۂ کلام "نغمہ زار" شائع ہو چکا تھا۔ اس وقت پورے برعظیم میں حفیظ صاحب کا ایک شاعر باکمال و خوش آہنگ کی حیثیت سے ڈنکا بج رہا تھا...... حفیظ صاحب نے مولانا گرامی کی اصلاح کا کوئی نمونہ کبھی نہیں دکھایا کہ مثال کے طور پر انھوں نے کون سا شعر کس طرح کہا تھا اور مولانا گرامی نے اصلاح دیکر اسے کیسا بنا دیا۔ بہر حال حفیظ صاحب کو بصد فخر یہ اعتراف ہے کہ وہ مولانا گرامی کے شاگرد ہیں۔

اس سخنور سے مجھے فیضِ سخن ہے اے حفیظ
نام نامی ہے گرامی جس جہاں اُستاد کا

جواباً مولانا گرامی نے بھی بھرپور وار کیا یعنی ایک پوری نظم حفیظ صاحب کی شان میں لکھ دی، انھیں داغ سے برتر بتایا اور اس طرح مقدم سے مؤخر کو فروتر کر دکھایا۔

چہ نسبت بود داغ را با حفیظم مؤخر مقدم ، مقدم مؤخر

مولانا گرامی نے بطورِ خاص داغ کے ساتھ یہ مقابلہ اس لیے بھی کیا ہوگا کہ حفیظ صاحب کی خودی بیدار تر ہو۔ اور وہ سچ مچ خود کو داغ سے برتر جاننے لگیں اور اس طرح داغ کی تقلید سے پنڈ چھڑا لیں...... مگر جو فاصلہ علامہ اقبال اور داغ کے مابین پڑ گیا ویسا فاصلہ حفیظ اور داغ کے مابین رونما نہ ہو سکا...... اصل میں حفیظ صاحب شوخی کو داغ کی فطری شوخی کے ساتھ ایک مضبوط نسبت تھی اور وہ باقی رہی چنانچہ حفیظ کے شوخ اشعارِ غزل میں ایک تعداد ایسے اشعار کی ہر دور میں نظر آتی ہے جن کو پڑھ کر ذہن داغ کے طرز بیان کی جانب منتقل ہو جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ غزلِ حفیظ کا ایک پہلو بہر حال "داغی" ہے۔ داغ کا خصوصی لہجہ، معاملہ بندی، تیکھاپن، طنز کسی بھرپور عشق کے بجائے ہلکی پھلکی کھلنڈری سی زکام بھر "عشق" وغیرہ کا پرتو ان اشعار میں صاف جلوہ گر ہے اور یہ چند اشعار نمونے کے طور پر دیئے جا رہے ہیں، ایسے اور بھی بہت سے ہیں۔

مگر انھیں پڑھیے داغ ہی کے طنزیہ اور "فہمائشی" لہجے میں

دز دیدہ نگاہوں سے کدھر دیکھ رہے ہو
کیا بات ہے یہ آج میں کیا دیکھ رہا ہوں

طرف داری نہ کر انصاف کر اے داورِ محشر
سزا دے ان بتوں کو ورنہ ہم فریاد کرتے ہیں

مر جانے کی دھمکی ہوئی تمہید تماشا — میں نے کہا دیکھ اس نے کہا دیکھ رہا ہوں
کہا یہ سن کے ذکر مرگِ دشمن — کسی کی بددعا نے مار ڈالا

اے داورِ حشر اس سے نہ کر پرسش ایماں
انکار کا عادی کہیں انکار نہ کر دے
لگایا اس لیے آئینہ اس نے روزنِ در میں
کہ اپنا منہ تو دیکھیں میری صورت دیکھنے والے

حضرتِ دل کام سے جاؤں گا میں — دل لگی میں آپ کا کیا جائے گا
نظر اور ذوقِ نظر دینے والے — عجب شے بنا دی ہے دنیائے فانی
محبت رو اور نباہو تو پوچھوں — یہ دشواریاں ہیں کہ آسانیاں ہیں

یہ لن ترانیاں ہیں تو اب کون آئے گا!
بیٹھے رہو گے برقِ تجلی لیے ہوئے

تنگ آ کر اے بندہ پرور — بندے کو آزاد کرو گے
حسن کو رسوا کر کے مروں گا — آخر تم کیا یاد کرو گے
بھلائی نہیں جا سکیں گی یہ باتیں! — تمہیں یاد آئیں گے ہم یاد رکھنا

اہل ہوس بھی ہیں بہت خیر نظر نہ آئیے!
یہ تو مگر بتائیے عاشق زار کیا کرے
شیخ کے منہ سے تو نکلی ہیں مزے کی باتیں
ہم نے سمجھا تھا بجز نامِ خدا کیا ہوگا

پری رُخوں کی زباں سے کلام سن کے مرا — بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے
حفیظؔ آخری دور ہے غور کر لے — مری جان! ایمان کیا چاہتا ہے
حشر کے دن بھی اے حفیظؔ اگر! — ہر کوئی بے گناہ بن بیٹھا
مسجد و میکدہ میں وجہ فساد — گاہ میں گاہ میری توبہ ہے

ترنم غزل کی جان ہے جسے حفیظ صاحب نے ہم آہنگ کلمات کے دروبست، اندرونی قافیئے اور تکرارِ خوشگوار کی مدد سے تخلیق کیا ہے۔ حفیظ صاحب نے اس جانِ غزل کی دھن میں کڑیاں جھیلی ہیں۔ خون پسینہ ایک کیا ہے۔ اردو کے غزل گو شعرا کے ہاں یہ اہتمام اور اس باقاعدگی کے ساتھ کمیاب ہے...... عبارت آسان ہے۔ فقرے ثقیل اور پُر پیچ نہیں، سیدھا سا مضمون ''برہنہ گفتن کا کمال'' مگر ایک مہین اور شریری ''مروڑی'' کے ساتھ، ایسی سادگی و پرکاری کہ حفیظ صاحب ہی کا حصہ ہے۔ ''نالہ پابند نے''، حفیظ صاحب کی ''طرزِ خاص''...... کسی غزل پر سے بھی نظر تیرتی ہوئی نہیں گزر سکتی۔ ہر غزل دامن گیر، کسی کو کوئی شعر پکڑ لیتا ہے اور کسی کو کوئی، یہ نہیں کہ اوراق کے ریگ زاروں میں مارے مارے پھریں اور جب ہانپتے کانپتے جاں بلب ہو کر گرنے لگیں تو کوئی ننھا سا نخلستان اچانک دکھائی دے اور پانی اور سائے کی امید یاور ہو، اور اس طرح جیتے مرتے جب وہ ریگ زار عبور کر لیں تو اپنے آپ کو دادِ سخت جانی دیں۔ حفیظ صاحب کی غزلوں کا ایک عنصر شگفتہ طنز یا طنزیہ شگفتگی ہے، کہیں زہر خند، کہیں سرشاری، کہیں مستی، کہیں شکست آرزو کا کرب اور کہیں امید کی سحر کاری، معاشرتی ماحول کا پرتو موجود، عمومی اسلوب سہل مگر ممتنع، آسان مگر کتنی تکلیفوں اور کتنے تکلفوں کا ثمرہ، گہرے فکر کا اثر یہاں وہاں جلوہ گر، کہیں رُومان حقیقت پر حاوی کہیں حقیقت رومان پر مگر ساتھ ساتھ یکجان ...... مجموعی تاثر ایک گلشن پر بہار، جہاں کانٹے پھول دکھائی دیں اور جہاں ہر لب خس گنگناتا نظر آئے...... حفیظ صاحب نے زندگی سے بھاگ کے محبوبۂ غزل کے دامن میں پناہ نہیں لی۔ انھوں نے محبوبۂ غزل کو رسمی تصوف کی خانقاہ میں بھی عافیت تلاش کرنے کی ترغیب کبھی نہیں دی۔ حفیظ صاحب فراری نہیں، وہ زندگی کے شاعر ہیں اور زندہ شاعر ہیں...... ہاں علی الرغم ''آزاد خیالاں'' وہ دین، وطن، قوم اور ملت کی محبت کے باوجود زندگی کے شاعر ہیں اور زندہ شاعر ہیں۔

سارے کلام میں ناہمواری شاذ ہے، غزل میں اور بھی زیادہ احتیاط عمل میں آئی ہے، اس لیے کہ غزل نہایت ہی نازک مزاج صنفِ سخن ہے۔ یہ نہیں کہ ایک شعر بھاری بھرکم ہو اور دوسرا لاغر یا مصرعوں کے ایک حصے کو ورم ہو رہا ہو جیسے سانپ نے دو تین مینڈک کھا رکھے ہوں، ہم

مزاجی کی رُو سے ان کی ہر غزل کے اکثر اشعار آپس میں حقیقی بھائی معلوم ہوتے ہیں...... زہیر بن ابی سلمٰی عہد جاہلیت کا سب سے خوش آہنگ شاعر تھا۔ اس کے فرزند کعب (حضرت کعبؓ) جب شاعر کی حیثیت سے معروف ہو گئے تو زہیر سے کسی نے کہا: اب تمھاری روایت شاعری کعب کے توسط سے باقی رہے گی یعنی تم رحلت بھی کر جاؤ تو شاعری کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس سے درحقیقت کعب کو داد دینا مقصود تھی مگر زہیر نے کہا ''ابھی تک کعب کے شعر ایک دوسرے کے چچیرے بھائی ہوتے ہیں حقیقی بھائی نہیں بنے''...... حفیظ صاحب کے اشعار ایک دوسرے کے حقیقی بھائی زیادہ ہیں اور چچیرے بھائی کم...... غزل ''اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی'' کے اشعار میں یہ چچیرے موجود ہیں ۔

وضو کرتے نمازیں ہم بھی پڑھتے — تو بارانِ تجلیات ہوتی
جہالت محتسب کی بھی نہ ہرگز — دخیل کارِ معقولات ہوتی

میں نے اوپر ایک شریر اور مہین سی ''مروڑی'' کا ذکر کیا ہے...... اگر کوئی پوچھے کہ جہاں غزل میں درد کا صوفیانہ لہجہ درد کی خصوصیت ہے یا لطیف خیال کی سجاوٹ غالب کی خصوصیت ہے وہاں حفیظ کی خصوصیت کیا ہے۔ وہ ادا یا انداز جسے ''حفیظیت'' قرار دیا جائے۔ تو میرا جواب ہوگا ''مروڑی''...... اس فن میں داغ کو بھی ید طولیٰ حاصل ہے لیکن حفیظ صاحب کے یہاں اس فن کو خصوصیت سی حاصل ہو گئی ہے۔ اس مروڑی کی تشریح یہ ہے کہ سیدھی سی بات کو ذرا سا پیچ دے کر اور تیکھا کر کے سحر بنا دینا، اعتماد میں لے کر اچانک وار کر جانا، دلجوئی کرتے کرتے کھری سنا دینا، گلدستہ پکڑانا اور ساتھ ہی کانٹا چبھو دینا، حوصلہ افزا عبارت کے پردے میں صدمہ پہنچا دینا، جلیبی کے ہمراہ کونین کھلانا، چومتے ہی گال کاٹنا، دستگیری کرنا مگر خندۂ استہزاء کے ساتھ، غزل میں یہی شرارت میرے نزدیک ''حفیظیت'' ہے اور اس باب میں پوری اردو شاعری میں انھیں انفرادیت حاصل ہے...... ذرا دیکھیے اعتماد میں لے کر کیسے وار کرتے ہیں:

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی سنتا جا شرماتا جا

آپ پھر پڑھ لیں...... ''سنتا جا'' تک خیریت ہے...... آگے اچانک فرماتے ہیں:
''شرماتا جا''...... ''اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جا''

شعر کا پہلا مصرعہ ہے۔ ''ہر ملاقات میں اک بات نظر آتی ہے'' ..... قاری یا سامع سننے کے لیے بے تاب ہے، کون سی بات؟ جواب ملتا ہے ''صورت ترکِ ملاقات نظر آتی ہے''... بات صورت بن گئی اور ہر ملاقات ترکِ ملاقات کا پیش خیمہ، اس طرح شعر ذیل کے پہلے مصرعے کا لہجہ اور دوسرے کا انداز دیکھیے۔

نظر آتی ہی نہیں صورتِ حالات کوئی
اب یہی صورتِ حالات نظر آتی ہے

مرے ڈوب جانے کا باعث تو پوچھو
کنارے سے ٹکرا تھا سفینہ

تمام زادِ سفر راستے میں لٹ جاتا
خدا نے فضل کیا کوئی رہنما نہ ملا

اتنے فرزانے کار فرما ہیں شہر ویران کیوں نہ ہو جائے

میں تجھے بے وفا نہیں کہتا دشمنوں کا بیان ہے پیارے

کیا ناخدا بغیر کوئی ڈوبتا نہیں
مجھ کو مرے خدا سے پشیماں نہ کیجیے

بت خانہ سامنے ہو تو لے کر خدا کا نام
ہے کوئی کام جس کو مسلماں نہ کر سکے

لہو کے گھونٹ پینا اور جینا مسلسل اک مزا ہے اور میں ہوں

کیسے بند ہوا میخانہ اب معلوم ہوا
پی نہ سکا کم ظرف زمانہ اب معلوم ہوا

ہر میرِ کارواں کے قدم چومتے ہوئے
سب ہیں مثالِ گردِ رواں سب مزے میں ہیں

نظر آتی ہے کسی دوست کی صورت جو کہیں
ایک فہرست عنایات نظر آتی ہے

رہے ان کے بہانے ہی بہانے   بہانے ہی بہانے مار ڈالا
یاروں کی برہمی پہ ہنسی آ گئی حفیظؔ   یہ مجھ سے ایک اور بری بات ہو گئی

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظؔ
ایک عادت ہے خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

نہیں کرتا عزیزوں کی شکایت   عزیزو ہاں بہت مغرور ہوں میں

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لیے ہوئے دامِ وفا کو میں

یہ دامن ہے یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا!

بلا کافی نہ تھی اک زندگی کی!   دوبارہ یاد فرمایا گیا ہوں
ہوا سے الجھتا رہا ناخدا   سفینہ سپردِ خدا ہو گیا
ان کا بہانہ برجستہ گوئی!   میرا تبسم حاضر جوابی
نام اس کا ہے ناصحِ مشفق   یہ مرا مہربان ہے پیارے

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یا رب!
میرا اپنا ہی بھلا ہو، مجھے منظور نہیں!

ترے کردار سکندر، تری رفتار خضر   تو مرا راہنما ہو مجھے منظور نہیں

حفیظؔ صاحب کی اکثر و بیشتر غزلیں سادہ و پرکار ہیں۔ سیدھی اور کھری بات ایک چشمک کے ساتھ ''حرفِ تمنا جسے روبرو'' کہہ دیا جائے۔ پروفیسر نصیر احمد ناصر اپنے مقالے ''حفیظؔ کی غزل'' مشمولہ حفیظؔ نمبر ''افکار'' کراچی میں اس ادا کو ''برہنہ گفتن'' قرار دیتے ہیں۔ ان کے بقول حفیظؔ صاحب کی غزل کے مضامین میں سب سے نمایاں دوستوں کے لیے شاعر کی محبت اور شاعر کے ساتھ دوستوں کی بے مہری کا مضمون ہے۔ یہ مضمون ایک زندہ و بیدار شخصیت ہی کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے جو اپنے ماحول سے ہر وقت باہمی تعامل کے باعث نئے نئے تجربات سے دو چار ہو رہا ہو، بعض دوستوں کی دوستی اسے متاثر کرتی ہے اور ان سے دوری اسے شاق گزرتی ہے۔ بعض دوستوں سے خلافِ توقع غداری دیکھ کر شاعر کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور

چونکہ غم کے تجربات خوشی کے تجربات سے زیادہ گہرے ہوتے ہیں لہٰذا دوستوں کی نادوستی حفیظ کی غزل کا ایک مستقل عنوان بن گیا ہے۔''

ہاں یہ واضح ہے کہ بقول حالی ؎

باتوں سے شکایت کی بو آتی ہے اُلفت کی
گر دل میں جگہ ہوتی لب پر بھی گلا ہوتا

گویا گلا اثبات محبت ہے، رہا دوستوں کی دوری پر غمگین ہونا اوران کی بے وفائی پر دل مسوس کر رہ جانا تو یہ ہر دوست کا دل گداز تجربہ ہے...... البتہ اس سے زار صاحب ایک امر کی جانب باریک سا اشارہ کر گئے ہیں یا یوں کہ لیجیے کہ ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ حفیظ صاحب کے یہاں عشق کا وہ بھرپور تجربہ نظر نہیں آتا جو انھیں میر کی طرح دلگیر بنا دے۔ وہ حسن و جمال کے عاشق ہیں مگر...... مگر حسن و جمالِ بسیط کے...... حسن و جمال صورت و سیرت کے، حسن و جمالِ فطرت کے...... وہ کسی ایک وجود حسین و جمیل کو اپنے عشق کی ابتدا و انتہا نہیں جانتے۔ غالب کی طرح وہ بھی شہد کی مکھی نہیں۔ علامہ اقبال نے بھی تو کبھی اسی طرح کہا تھا ؎

آرزو ہر کیفیت میں اِک نئے جلوے کی ہے
مضطرب ہوں دل سکوں ناآشنا رکھتا ہوں میں
گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر
حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

اسی طرح فارسی میں یوں بیان کیا تھا ؎

چہ کنم کہ فطرتِ من بمقام در نسازد
دلِ بے قرار دارم چوں صبا بہ لالہ زارے
چو دلم قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوبتر نگارے

حسینوں کے اعتبار سے دیکھیں تو یہ عشق ہرجائی ہے حسن کی رو سے غور کریں تو یکجائی اور یکجائی بھی وہ جس کی وسعت کا کوئی جغرافیہ متعین نہیں کیا جا سکتا اور حق یہ ہے کہ ان ''بے وفا وفاداروں'' کے کلام میں رنگارنگی محض ''وفاداروں'' کے کلام کے مقابل بہت زیادہ ہے۔ نت نئے تجربے، نئی امنگیں، نئے داغ اور نئی مایوسیاں...... گویا مرحلہ شوق نظربازی طے ہونے میں نہیں آتا چنانچہ مجموعی تاثر سرشاری و دلسوزی کی ہم آہنگی ہے۔ طربناک فریاد، خورسند درد

مندی، جانساز نالہ...... حسن کے وفاداروں کی نگہ محدود نہیں ہوتی لہٰذا ان کا تخیل اور ان کا جذبہ جوانا مرگی کا محل نہیں بنتا۔

بہرحال چراغ سحر حفیظ صاحب کے دیگر مجموعوں کی طرح رنگارنگی اور خوش آہنگی کا دل آویز منظر پیش کرتا ہے۔ حفیظ صاحب کی مخصوص لے یہاں بھی جادو جگا رہی ہے۔ البتہ لہجے میں انتباہ وسرزنش اور طنز وتعریض کی تلخی قدرے بڑھ گئی ہے۔ اس میں حفیظ صاحب کا اتنا قصور نہیں جتنا اس غافل اور بے درد معاشرے کا قصور ہے جو تقسیم برعظیم کے بعد وجود میں آیا تاہم یہ بات ذہن نشین رہے کہ حفیظ صاحب کی اس تلخی میں حاوی عنصر مایوسی نہیں۔ انھیں کبھی کبھی یاس سے ملتی جلتی کیفیت کا دورہ ضرور پڑتا ہے۔ مگر مایوسی ان کے مزاج کا خاصہ ہرگز نہیں وہ تو بالعموم مرثیے کو بھی رجز بنا دیتے ہیں مثلاً حضرت قائداعظمؒ کا مرثیہ ملاحظہ فرمایئے۔ اہل پاکستان کو بابائے ملت سے جو محبت تھی وہ محتاج بیان نہیں...... پاکستان کو معرض وجود میں آئے فقط تیرہ ماہ ہوئے تھے...... تقریباً ایک کروڑ مہاجرین کا مسئلہ ایک طرف، کشمیر کی جنگ دوسری جانب، لہٰذا ان کی وفات سے اہل پاکستان کے دلوں پر جو سراسیمگی طاری ہوئی، وہ کسی تشریح کی طالب نہیں۔

تیرہ شبی میں دے کے ہمیں جلوۂ صباح ہے عرش پر حفیظ محمد علی جناح
دنیا سے کامیابِ عقبیٰ لیے ہوئے

تھا اتحاد و ضبط و ارادت کا رہنما اس دشتِ کربلا میں شہادت کا رہنما
مظلومئ حسین کا دعویٰ لیے ہوئے

اب ہم ہیں اور ساحلِ مقصود سامنے میدان بھی جہاد بھی موجود سامنے
آؤ بڑھیں خدا کا سہارا لیے ہوئے

آؤ بڑھیں خدا کے سہارے پہ مطمئن تلقینِ مصطفیٰ کے اشارے پہ مطمئن
ذوقِ جمالِ گنبدِ خضریٰ لیے ہوئے

میں دعا کرتا ہوں کہ خدا حفیظ صاحب کو صحت وتندرستی اور عزت، ہر دلعزیزی کی نعمت

سے نوازے رکھے تاکہ ہم ''چراغ سحر'' کے بعد ''طلوعِ سحر'' کا جلوہ بھی دیکھیں ؂

نغمے سے جب پھول کھلیں گے چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے، تو اپنی دُھن میں گاتا جا!

محمد منور

عذرانہ: میری آخری عمر کے اس مجموعۂ گفتار کا مقدمہ میرے افکار کی ڈگمگاتی اور سنبھلتی جاتی رفتار کا مظہر ہے یوں تو دوست نے لگی لپٹی نہیں رکھی لیکن چند خامیوں سے کنی کاٹ جانا خطائے بزرگاں گرفتن خطاست زبان سے نہ کہنے کی خوردانہ شرارت ہے۔ بہرحال ترتیب میں کہیں کہیں بے ربطی ہے، جس کا سبب بے علالت کا عذر بیگنا ہی۔

۶۹ء میں ایمبولینس میں اپنے دماغ کی شکست اور دل کی ''آرام طلبی'' کے ساتھ لدا ہوا ماڈل ٹاؤن لایا گیا تھا۔ راولپنڈی میں ایک کاتب چند غزلیں چند نظمیں غلط نویسی کی اصلاح کیے بغیر پیشگی لے کر غائب ہو چکا تھا۔ داخلی ہنگامہ آرائی اور مشرق میں بھارتی ہاتھ کی صفائی، پھر مغرب پر حملہ آوری اور حملہ آوروں کی روسی یاوری...... پیر پیارے پڑار ہنے والا شاعر تو کبھی تھا نہیں جہاں پہنچ سکا لب کشا ہوا۔ اسی عالم میں چیونٹی نامہ اور اس کے بعد یہ غزلیات اور نظمیات غبار آلود انبار سے نکالیں۔ دماغ کی رگیں پھٹ جانے کے بعد وہ ربط وضبطِ ذہنی ممکن نہ رہا تھا۔ اپنی بیماری کے بنفسِ نفیس تیماردار کا عذر قبول کیجیے۔

کتابت: لاہور میں غلط نویسی کرنے والے تین کاتبوں کے حسنِ کار کا مرقع ہے۔ میں تو اپنی سی کر چکا[1]۔ رہی سہی اصلاح آپ خود کر لیجیے گا۔ اس دنیا سے جاتے ہوئے آخر آپ سے تھوڑی سی معنوی استمداد کا حق تو رکھتا ہوں نا...... ہاں یاد آیا۔ بعض غزلوں پر سال اور مقام درج ہیں۔ بعض کو حوالۂ نسیان ہی رہنے دیا گیا ہے البتہ نظموں کا شانِ نزول مختصراً کتاب کے خاتمے پر درج کرنے کی تمنا ہے۔

حفیظ

---

۱ اشاعتِ اوّل کتابت کے مراحل سے گزری تھی۔ مرتب

دیباچہ

یہ رنگ رنگ کے خاکے نقوش تصویریں
مرے خیال مرے خواب میری تعبیریں
مشاہدات سے ہیں تجربات ہم آہنگ
حیات کے یہ مظاہر صفات شیشہ و سنگ
خطوطِ روشن و تاریک ہر زمانے کے
ہیں شاہکار مرے اس نگار خانے کے
یہ عکس صفحۂ قرطاس پر جو چھایا ہے
سروش تک مری پرواز ہی کا سایا ہے
شکست و بستِ قلم ربط و ضبط کی عامل
قدم قدم ہیں مرے دل کی دھڑکنیں شامل
وہ حسن و عشق جو چشمِ ہوس سے ہیں پنہاں
مرا کرشمۂ اخلاص کر رہا ہے عیاں

حیا و شرم کے انداز میں جلال و جمال!

عطائے مصطفویؐ نے کیے ہیں مالا مال

مجھے یقین ہے اہلِ مذاق و خوش اطوار

کریں گے وردِ زباں ہر زماں مرے اشعار

جو کور ذوق ہیں فرمائیں گے تعلّی ہے

صدائے دیدہ وراں آئے گی، تجلّی ہے

یہ زندگی کے تقاضے کہیں نہ جائیں گے

دلوں کی اجڑی ہوئی بستیاں بسائیں گے

میں چل بسوں گا کہاں یہ مرا خدا جانے!

یہ نقش کیوں نہ مٹیں گے، فن آشنا جانے

غزلیات

○

بده ساقی آں تلخِ شیریں گوار　　که شیریں کند تلخیِ روزگار
بمن ده که دورانِ گیتی مدام　　زدستے به دستے رَوَد ہمچو جام

حمدیہ

مرے دوست مرے یار بتا؟

مجھ سے برتر بھی تو بندوں میں گنہگار بتا؟
کون رحمت کا زیادہ ہے سزاوار بتا؟

جس کا سر میری طرح عرش کی جانب نہ اٹھے؟
ہے کوئی بارِ ندامت سے نگونسار بتا؟

تیر جس رُخ بھی چلے، جان ہدف ہے میری
قَدَر انداز ہے، یا میں ہوں خطا کار بتا؟

تو ہی وابستہ ہے یا میری شکستہ رگِ جاں
میں ہوں یا تو ہے علائق میں گرفتار بتا؟

سکہ ہے کس کا رواں قلب سے تا حبلِ ورید
میرے ہمراز، میرے دوست، مرے یار بتا؟

عفو فرما کہ سزا دے ، مگر اے واحدِ غیب
عیب میرے نہ کسی اور کو زنہار بتا

میں حفیظ اے مرے آقا ترا بندہ ہوں ضرور
ہوں مگر بندۂ مجبور کہ مختار ، بتا؟

ندائے غیب

نہ اشکِ گرم بن کے چل نہ آہِ سرد بن کے چل
چلا ہے راہِ عشق پر حفیظ مرد بن کے چل

○

یہ کیا مقام ہے وہ نظارے کہاں گئے
وہ پھول کیا ہوئے وہ ستارے کہاں گئے

یارانِ بزم ' جرأتِ رِندانہ کیا ہوئی
اُن مست انکھڑیوں کے اشارے کہاں گئے

ایک اور دور کا وہ تقاضا کدھر گیا
اُمڈے ہوئے وہ ہوش کے دھارے کہاں گئے

اُفتاد کیوں ہے لغزشِ مستانہ کیوں نہیں!
وہ عذرِ مے کشی کے سہارے کہاں گئے

دورانِ زلزلہ جو پناہِ نگاہ تھے
لیٹے ہوئے تھے پاؤں پسارے کہاں گئے

باندھا تھا کیا ہوا پہ وہ امید کا طلسم
رنگینیِ نظر کے غبارے کہاں گئے

اُٹھ اُٹھ کے بیٹھ بیٹھ چکی گرد راہ کی
یارو وہ قافلے تھکے ہارے کہاں گئے

ہر میرِ کارواں سے مجھے پوچھنا پڑا
ساتھی ترے کدھر کو سدھارے، کہاں گئے

فرما گئے تھے راہ میں بیٹھ — انتظار کر
آئے نہیں پلٹ کے وہ پیارے کہاں گئے

تم سے بھی جن کا عہد وفا استوار تھا
اے دشمنو! وہ دوست ہمارے کہاں گئے

کشتی نئی بنی کہ اُٹھا لے گیا کوئی؟
تختے جو لگ گئے تھے کنارے کہاں گئے

اب ڈُوبتوں سے پوچھتا پھرتا ہے ناخدا
جن کو لگا چکا ہوں کنارے کہاں گئے

بیتاب تیرے درد سے تھے چارہ گر حفیظؔ
کیا جانیے وہ درد کے مارے کہاں گئے

○

کیا پوچھتے ہو آج سے پہلے کہاں رہے
پوچھو، مکاں ملا بھی تو کیوں لامکاں رہے

ایسا نیاز پیشِ خداوندگانِ ناز
کہیے زمین کیوں نہ تہِ آسماں رہے

مجنوں کو اپنی منزلِ مقصود مل گئی
اُس کی بلا سے ناقۂ لیلیٰ رواں رہے

کعبے سا بتکدہ بھی تو اللہ کا گھر بنا
کیوں سرزمینِ پاک مقامِ بتاں رہے

شیرینیِ بیاں نہ سپر بن سکی حفیظؔ
آماجگاہِ تلخیِ اہلِ زباں رہے

(۱۹۴۸ء)

○

اب تو کچھ اور بھی اندھیرا ہے — یہ مری رات کا سویرا ہے؟
رہزنوں سے تو بھاگ نکلا تھا — اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے
آگے آگے چلو تبر والو — ابھی جنگل بہت گھنیرا ہے
قافلہ کس کی پیروی میں چلے — کون سب سے بڑا لٹیرا ہے؟
سر پہ راہی کے سربراہی نے — کیا صفائی کا ہاتھ پھیرا ہے
سرمہ آلود خشک آنسوؤں نے — نورِ جاں خاک پر بکھیرا ہے
راکھ راکھ استخواں سفید سفید — یہی منزل یہی بسیرا ہے
اے مری جان اپنے جی کے سوا — کون تیرا ہے کون میرا ہے

سو رہو اب حفیظؔ جی تم بھی
یہ نئی زندگی کا ڈیرا ہے

○

کوئی چارا نہیں دُعا کے سوا — کوئی سنتا نہیں خدا کے سوا
مجھ سے کیا ہو سکا وفا کے سوا — مجھ کو ملتا بھی کیا سزا کے سوا
بر سرِ ساحلِ مراد یہاں — کوئی اُبھرا ہے ناخدا کے سوا
کوئی بھی تو دکھاؤ منزل پر — جس کو دیکھا ہو رہنما کے سوا
دِل سبھی کچھ زبان پر لایا — اک فقط عرضِ مدعا کے سوا
کوئی راضی نہ رہ سکا مجھ سے — میرے اللہ تری رضا کے سوا
بت کدے سے چلے ہو کعبے کو — کیا ملے گا تمھیں خدا کے سوا
دوستوں کے یہ مخلصانہ تیر — کچھ نہیں میری ہی خطا کے سوا
مہر و مہ سے بلند ہو کر بھی — نظر آیا نہ کچھ خلا کے سوا

اے حفیظ آہ آہ پر آخر
کیا کہیں دوست واہ وا کے سوا

سمٹ آئے ہیں گھر میں ویرانے
تو کدھر جا رہا ہے دیوانے

کہہ گئے ''الفراق'' یارانے
رہ گئے ناتمام افسانے

دوستی اب گلے کا ہار نہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے

صبح دم اپنی اپنی راہ لگے
شمع کے جاں نثار پروانے

زندگی سے نپٹ رہا ہوں ابھی
موت کیا ہے مری بلا جانے

ساقیا یہ رواروی کا ہے دور
بھر دے بھر دے کچھ اور پیمانے

ماتمِ اہلِ ظرف کے دن ہیں
احتراماً ہیں بند میخانے

کر رہا ہوں تلاش اپنوں کی
جب سے گم ہو گئے ہیں بیگانے

ایک کعبہ نہ بن سکا ہم سے
توڑ ڈالے ہزار بت خانے

ہم نے روکا حفیظ کو ورنہ
اور بھی کچھ لگے تھے فرمانے

دوستی ، دوست ، یار ، یارانے
جب ترانے تھے اب ہیں افسانے

بن پئے بھی تھے مست مستانے
ہائے لاہور کے وہ میخانے

اب زیارتگہِ خرد ہے، جہاں
مل کے بیٹھے تھے چند دیوانے

جو قیامت اُٹھائے پھرتے تھے
سو رہے ہیں وہ لمبیاں تانے

سخنِ رنگ رنگ سے لبریز
آج ٹوٹے پڑے ہیں پیمانے

اُن پر اللہ کو بھی پیار آیا
جن کو چاہا تھا اہل دنیا نے

لاکھ اُڑتی پھرے ہوا پہ ہوس
ہم نہیں اس پری کے دیوانے

تا بکے جستجوئے قاتل میں
سر اُٹھائے لیے پھریں شانے

بڑھ گئی بات عرضِ مطلب پر
مختصر یہ کہ وہ نہیں مانے

اپنی دیوانگی پہ ہنستا ہوں
کیوں برا مانتے ہیں فرزانے

سرخوشی میں جو موجِ دریا تھے
لے لیا اُن کو موجِ دریا نے

تگ و دَو ہے تیرے جلو میں حفیظ
اور کیا چاہتا ہے دیوانے

(مرگِ احیائے قدیم ۱۹۵۴ء)

○

اگر موج ہے بیچ دھارے چلا چل
وگرنہ کنارے کنارے چلا چل

اسی چال سے میرے پیارے چلا چل
گزرتی ہے جیسے گزارے چلا چل

تجھے ساتھ دینا ہے بہروپیوں کا
نئے سے نیا رُوپ دھارے چلا چل

خدا کو نہ تکلیف دے ڈوبنے میں
کسی ناخدا کے سہارے چلا چل

پہنچ جائیں گے قبر میں پاؤں تیرے
پسارے چلا چل پسارے چلا چل

یہ اُوپر کا طبقہ خلا ہی خلا ہے
ہوا و ہوس کے غبارے چلا چل

ڈبویا ہے تو نے حیا کا سفینہ
مرے دوست سینہ اُبھارے چلا چل

مسلسل بتوں کی تمنا کیے جا
مسلسل خدا کو پکارے چلا چل

یہاں تو بہرحال جھکنا پڑے گا
نہیں تو کسی اور ڈوارے چلا چل

تجھے تو ابھی دیر تک کھیلنا ہے
اسی میں تو ہے جیت ہارے چلا چل

نہ دے فرصتِ دم زدن او زمانے
نئے سے نیا تیر مارے چلا چل

شبِ تار ہے تا بہ صبحِ قیامت
مقدر ہے گردش، ستارے چلا چل

کہاں سے چلا تھا، کہاں تک چلے گا
چلا چل مسافت کے مارے چلا چل

بصیرت نہیں ہے تو سیرت بھی کیوں ہو
فقط شکل و صورت سنوارے چلا چل

حفیظ اس نئے دور میں تجھ کو فن کا
نشہ ہے تو پیارے اُتارے چلا چل

(۱۹۵۷ء)

○

عرضِ ہنر بھی وجہِ شکایات ہو گئی
چھوٹا سا منہ تھا مجھ سے بڑی بات ہو گئی

دُشنام کا جواب نہ سوجھا بجز سلام
ظاہر مرے کلام کی اوقات ہو گئی

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

یا ضربتِ خلیل سے بت خانہ چیخ اُٹھا
یا پتھروں کو معرفتِ ذات ہو گئی

یارانِ بے بساط کہ ہر بازیٔ حیات
کھیلے بغیر ہار گئے ، مات ہو گئی

بے رزم دن گزار لیا رتجگا مناؤ
اے اہلِ بزم جاگ اُٹھو رات ہو گئی

نکلے جو میکدے سے تو مسجد تھا ہر مقام
ہر گام پر تلافیِ مافات ہو گئی

حدِ عمل میں تھی تو عمل تھی یہی شراب
ردِ عمل بنی تو مکافات ہو گئی

اب شکر نا قبول ہے شکوہ فضول ہے
جیسے بھی ہو گئی بسر اوقات ہو گئی

وہ خوش نصیب تم سے ملاقات کیوں کرے
دربان ہی سے جس کی مدارات ہو گئی

ہر ایک رہنما سے بچھڑنا پڑا مجھے
ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی گھات ہو گئی

یاروں کی برہمی پہ ہنسی آ گئی حفیظؔ
یہ مجھ سے ایک اور بری بات ہو گئی

(تخلیقِ ترانۂ پاکستان پر ہمعصر شعراء کی داد کا جواب --- ۱۹۵۰ء)

○

جس کو مجھ میں بھی کوئی بات نظر آتی ہے
اے خدا ، ایک تری ذات نظر آتی ہے

ہر ملاقات میں اک بات نظر آتی ہے
صورتِ ترکِ ملاقات نظر آتی ہے

نظر آتی ہی نہیں صورتِ حالات کوئی
اب یہی صورتِ حالات نظر آتی ہے

یہ عجب مرحلۂ عمر ہے یا رب کہ مجھے
ہر بری بات ' بری بات نظر آتی ہے

چلتے پھرتے ہوئے مُردوں سے ملاقاتیں ہیں
زندگی کشف و کرامات نظر آتی ہے

ملک الموت کی بھیجی ہوئی ہر ایک خبر
زندگی کے لیے سوغات نظر آتی ہے

اب جو روتا ہوں جوانی کے دنوں کا رونا
چاندنی رات میں برسات نظر آتی ہے

جس روش پر بھی چلے قافلۂ جرمِ وفا
ساتھ ہی ساتھ مکافات نظر آتی ہے

جلوۂ صبح کا اندھوں میں تو ہے جوش وخروش
آنکھ والوں کو وہی رات نظر آتی ہے

ایک منزل جسے سمجھے تھے تمنائے حیات
اب وہی مرگِ مفاجات نظر آتی ہے

نظر آتی ہے کسی دوست کی صورت جو کہیں
ایک فہرستِ عنایات نظر آتی ہے

یہ نئی فصلِ بہاراں ہے کہ اب مسجد میں
بزمِ رِندانِ خرابات نظر آتی ہے

یہ سیہ نامۂ اعمال تو یا رب مجھ کو
بھولی بسری ہوئی اک رات نظر آتی ہے

نخلِ طوبےٰ کے تلے چشمۂ کوثر کے قریب
کوئی اُتری ہوئی بارات نظر آتی ہے

زندگی میں تو کوئی چیز انوکھی نہ رہی
موت ہی ایک نئی بات نظر آتی ہے

یار تاثیر عجب چال چلی ہے تو نے
بازیِ بزمِ سخن مات نظر آتی ہے

تیرے اُترے ہوئے چہرے پہ بھی یاروں کو حفیظ
سرخیِ حرف و حکایات نظر آتی ہے

(مرگِ تاثیر کے بعد-۱۹۵۰ء)

○

خدا پر دیکھ کر میری نگاہیں
گلے میں ڈال دیں اک بت نے باہیں

اُبل پڑنے لگے پھر گرم آنسو
اُمڈ آنے لگیں پھر سرد آہیں

پلٹ چلنا پڑا منزل بہ منزل
وہی سر ہے وہی پامال راہیں

بچھی جاتی ہیں پھر فرشِ زمیں پر
مرے عرشِ بریں کی سجدہ گاہیں

نکالا تھا جہاں سے محتسب نے
وہیں ملنے لگی ہیں پھر پناہیں

پڑی ہیں سرنگوں پائے جنوں پر
خرد کی اونچی اونچی بارگاہیں

جو تن پر رہ گئے تھے چند پرزے
وہ کانٹوں کے سروں پر ہیں کلاہیں

نصیبہ جاگ اُٹھا پھر میکدوں کا
اُجڑ کر رہ گئیں پھر خانقاہیں

تعلی بن گئی ہے اِک تسلی
خدا چاہے تو بت بھی کیوں نہ چاہیں

خراباتی براتی بن رہے ہیں
یہ شاید دُختِ رز سے مجھ کو بیاہیں

نباہے جا حفیظؔ اس گمرہی سے
نباہے جا، خضر جب تک نباہیں

○

یہ اور دور ہے اب ناور کچھ نہ فرمائے
مگر حفیظ کو یہ بات کون سمجھائے

وفا کا جوش تو کرتا چلا گیا مدہوش
قدم قدم پہ مجھے دوست ہوش میں لائے

پری رُخوں کی زباں سے کلام سن کے مرا
بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

بہشت میں بھی ملا ہے مجھے عذابِ شدید
یہاں بھی مولوی صاحب ہیں میرے ہمسائے

عذابِ قبر سے بدتر سہی حیات، حفیظ
یہ جبر ہے تو بجز صبر کیا کیا جائے

○

اِن تلخ آنسوؤں کو نہ یوں منہ بنا کے پی
یہ مے ہے خود کشید، اسے مسکرا کے پی

اُتریں گے کس کے حلق سے یہ دلخراش گھونٹ
کس کو پیام دُوں کہ مرے ساتھ آ کے پی

مشروبِ جم ہی تلخیِ غم کا علاج ہے
شیرینیِ کلام ذرا سی ملا کے پی

واعظ کی اب نہ مان اگر جان ہے عزیز
اِس دور میں یہ چیز بطور اِک دوا کے پی

بھر لے پیالہ خمکدۂ زیست سے حفیظؔ
خونِ جگر ہے سامنے چل کر خدا کے پی

○

دور یہ ہے کہ دورِ مے بھی نہیں
اور ایسی تو کوئی شے بھی نہیں

یہ عجیب و غریب برزخ ہے
زندگی ہے بھی اور ہے بھی نہیں

میکدے بند ہیں تو مسجد تک
ہم سے ہو گی یہ راہ طے بھی نہیں

نالہ تھا جس کے دم سے نغمہ طراز
سانس کے لب پہ اب وہ نے بھی نہیں

درد کی تھاپ تھی جو دِل پہ حفیظؔ
اب وہ اُکھڑی ہوئی سی لے بھی نہیں

○

غم موجود ہے، آنسو بھی ہیں، کھا تو رہا ہوں، پی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

یارو میں نے اپنا سینہ اپنے ہاتھوں چاک کیا ہے
سچ کہتے ہو لیکن دیکھو، اپنے ہاتھوں سی تو رہا ہوں

خونِ جگر آنکھوں سے نہ ٹپکا، منہ سے شعلہ بن کر لپکا
شعبدہ گر ہوں، مجھ پر ہنسیے، میں بھی ہنستا ہی تو رہا ہوں

سیم و زر سے برتر و بالا شاید کوئی شے پا جاؤ
راکھ ذرا میری بھی کریدو، کیمیا گر میں بھی تو رہا ہوں

ہاں میں حفیظؔ ہوں تیرا بندہ، بت خانے کے اندر اب تک
میری نیت پوچھتا کیا ہے تیری مشیت تھی تو رہا ہوں!

○

آسماں بیداد ہی کرتا رہا
آدمی فریاد ہی کرتا رہا

عشق کی صورت نہ دیکھی پھر کہیں
حسن مجھ کو یاد ہی کرتا رہا

آج تک ہوں تیرے وعدے کا اسیر
تو مجھے آزاد ہی کرتا رہا

دل کی بستی اپنے ہاتھوں سے حفیظؔ
ہر کوئی برباد ہی کرتا رہا

○

آخر مجھے یہ کام بھی کرنا ہی پڑے گا
جینا یہی جینا ہے تو مرنا ہی پڑے گا

اللہ عطا پاش و خطا پاش سہی دوست
اللہ کے بندوں سے تو ڈرنا ہی پڑے گا

اب ہائے نہ کر، ہائے سے اب کچھ نہیں بنتا
ناخن ہی سہی، زخم تو بھرنا ہی پڑے گا

ساحل نہیں معلوم تو یہ سیر کہاں تک!
کشتی سے بہرحال اُترنا ہی پڑے گا

ہے سادگیِ شعر کو نقاد کا دھڑکا
یہ دورِ نمائش ہے سنورنا ہی پڑے گا

○

وابستۂ شجر ہوں اسی انتظار میں
میں برگِ خشک اُڑوں گا ہوائے بہار میں

جن کو یقین آیۂ لَاتَقْنَطُوْا پہ ہے
وہ اب نہیں کسی بھی قطار و شمار میں

ہاں چند باغباں ہیں ابھی تک ڈٹے ہوئے
لیکن اٹے ہوئے ہیں وہ گرد و غبار میں

افرنگ کی یہ بادِ سموم اور اِک شجر
صبر آزما ہے معرکۂ گیر و دار میں

دورِ جنوں کے شعر سناؤ حفیظؔ جی
نغمہ ہو جن کے پیرہن تار تار میں

○

زندگی سے نباہ مشکل ہے — یہ مسلسل گناہ مشکل ہے
ہاں مرے خیر خواہ مشکل ہے — تیرے ہاتھوں پناہ مشکل ہے
دوستی ہی میں دشمنی بھی ہو — یہ نئی رسم و راہ مشکل ہے
ارتکابِ گناہ سہل نہیں — انتخابِ گناہ مشکل ہے
اے مری جان اے مرے ایمان — اَب ہمارا نباہ مشکل ہے
ہم سے اس مسئلے پہ بات نہ کر — فقر اے بادشاہ مشکل ہے
چاہتا کیا ہے دل یہ آگاہی — گاہ آسان گاہ مشکل ہے
طور تو دُور ہے خود اپنے حضور — فرصتِ یک نگاہ مشکل ہے
ابنِ آدم کو ابنِ آدم سے — قبر میں بھی پناہ مشکل ہے
مرتے رہنا مگر جیے جانا — کس قدر بے پناہ مشکل ہے

اُن سے یاری حفیظؔ صاحب جی
یوں بحالِ تباہ مشکل ہے

○

ترے دِل میں بھی ہیں کدورتیں ترے لب پہ بھی ہیں شکایتیں
مرے دوستوں کی نوازشیں مرے دُشمنوں کی عنایتیں

یہ ہے طرفہ برزخِ دوستی کہ نگاہ و دِل ہمہ برف ہیں
نہ وہ حوصلے نہ وہ ظرف ہیں نہ وہ حرف ہیں نہ حکایتیں

یہی ربط و ضبطِ غم و الم تری رائے میں کبھی خوب تھے
وہ یہی تو میرے عیوب تھے جنھیں دی گئی تھیں رعایتیں

مجھے تیرے در سے کہاں کہاں لیے جا رہی ہیں کشاں کشاں
میرے ناصحوں کی ہدایتیں ترے واعظوں کی روایتیں

یہی نام لے کے تو اَے خدا میں صنم کدے سے نکل سکا
رہیں کاش تا درِ مصطفیٰؐ مری رہنما تری آیتیں

(راولپنڈی ۱۹۶۵ء)

○

اِس دلدہی کا مقصد اَے خیر خواہ کیا ہے
یہ تو مجھے بتا دے میرا گناہ کیا ہے؟

کیا ہو گیا ہے مجھ کو ناصح تو ہی بتا دے
یہ اشک گرم کیوں ہیں یہ سرد آہ کیا ہے؟

کیوں چشم ولب ہیں خنداں سینے میں کیا ہے پنہاں
سر کیوں ہے دَرگریباں پیشِ نگاہ کیا ہے؟

ہر بے وفا کے لب پر تاکید ہے وفا کی
اِس تیرِ بے خطا کی آماجگاہ کیا ہے؟

ہے آفتابِ محشر تا شامِ مرگ سر پر
اِس زندگی سے بدتر روزِ سیاہ کیا ہے!

آئینہ سامنے ہے خود مسکرا رہا ہوں
کس سے کہوں وبالِ حالِ تباہ کیا ہے

از ماہ تا بماہی یہ عالمِ تباہی
بندوں کی بادشاہی کیوں اے اِلٰہ کیا ہے

ہم آہ آہ لے کر عرضِ سخن کو آئے
کوئی ہمیں بتائے یہ واہ واہ کیا ہے

عمر اے حفیظؔ ساری جس رنگ سے گزاری
اِس کے سوا ہماری اب رسم و راہ کیا ہے

○

آہ بیداری کو بھی خوابِ پریشاں کر دیا
جاگتے ہی گلشنِ اُمید ویراں کر دیا

لذتِ ذلت کے نشے میں کیا ملت کو غرق
ساقیوں نے واقعی کارِ نمایاں کر دیا

خیر گزری سب تسلی دینے والے اُٹھ گئے
دوستوں نے میرا مرنا مجھ پہ آساں کر دیا

گوہرِ معنی تو ہاتھ آیا ہوا تھا اے حفیظؔ!
تیری آنکھوں نے صدف ہی نذرِ طوفاں کر دیا

○

جھگڑا دانے پانی کا ہے دام و قفس کی بات نہیں
اپنے بس کی بات نہیں صیاد کے بس کی بات نہیں

جان سے پیارے یار ہمارے قیدِ وفا سے چھوٹ گئے
سارے رشتے ٹوٹ گئے اِک تارِ نفس کی بات نہیں

تیرا پھولوں کا بستر بھی راہگزارِ سیل میں ہے
آقا! اب یہ بندے ہی کے خار و خس کی بات نہیں

دونوں ہجر میں رو دیتے ہیں دونوں وصل کے طالب ہیں
حسن بھلا کیسے پہچانے عشق ہوس کی بات نہیں!

سازِ نفیر خواب سے غش ہے قافلۂ آرام طلب
اندازِ خاموشیِ لب آوازِ جرس کی بات نہیں

نوش ہے عنواں، نیش نتیجہ، ان شیریں افسانوں کا
تذکرہ ہے اِنسانوں کا یہ مورومگس کی بات نہیں

کارِ مغاں یہ قند کا شربت بیچنے والے کیا جانیں
تلخی و مستی بھی ہے غزل میں خالی رَس کی بات نہیں

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظؔ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

○

تجھ پہ قربان ہو ایمان یہ ناممکن ہے
اے مری جان میں قربان یہ ناممکن ہے

زُلفِ تقدیر کو تدبیر سے میں سلجھاؤں؟
نہ کرو مجھ کو پریشان یہ ناممکن ہے

لاکھ آتے ہوں اُسے ڈھنگ دغابازی کے
آدمی بن سکے شیطان ، یہ ناممکن ہے

ٹلتی رہتی ہے جو ہر سر سے قیامت یارب
کوئی مانے ترا احسان یہ ناممکن ہے

زندگی دیکھ کے اس آئینہ خانے کی حفیظؔ
موت رہ جائے نہ حیران ، یہ ناممکن ہے

دو آتشہ

ملٹری اکاؤنٹ کے ہیڈ کوارٹر کے عین سامنے مسجد موجود ہے لیکن افسرِ اعلیٰ کو نہ جانے کیوں احاطے کے اندر بھی مسجد کی سوجھی، کلرکوں سے زبردستی چندہ لیا گیا۔ ساتھ ہی مشاعرے کے انعقاد کے ٹکٹ بیچے گئے۔ افسرِ اعلیٰ جید شرابی مشہور تھے۔ یہ اشعار ممدوح کی زیرِ صدارت میری زبان پر آ کر زباں زدِ خاص و عام ہو گئے۔ ان دنوں پنجاب میں شراب ممنوع قرار دے دی گئی تھی مگر وہ مشاعرے کے دوران پئے ہوئے جھوم رہے تھے۔

شکستِ شیشہ و ساغر کا رنج کیا ساقی
مئے سخن تو بہر حال ہے ابھی باقی
نہیں شراب تو ذکرِ شراب ہو جائے
کسی طرح دلِ زاہد کباب ہو جائے
زمینِ شعر میں بھٹی نکالنا ہے مجھے
مشاعرے ہی کو بوتل میں ڈھالنا ہے مجھے
نئے شگوفے ہیں رنگِ سخن کی تصویریں
مشاعروں سے ہیں اب مسجدوں کی تعمیریں
جناب شیخ کے ارشاد پر عمل ہی سہی
اگر شراب نہیں ہے، تو اِک غزل ہی سہی

مشاعرہ ہو تو سب شیخ و شباب پیتے ہیں
دہانِ گوش سے جامِ شراب پیتے ہیں
نچوڑ کر رگِ مزدور جام بھر بھر کر
بہت سے لوگ برائے ثواب پیتے ہیں
سنا ہے وادیٔ پنجاب سے اُدھر کچھ لوگ
خدا کے فضل سے اب تک شراب پیتے ہیں
وہ جن کا محتسبوں سے ملا ہے قارُورہ
وہ بے نیازِ غمِ احتساب پیتے ہیں
محاسبوں کو نہیں احتساب کا دھڑکا
کہ یہ برنگِ حساب و کتاب پیتے ہیں
چڑھی ہوئی ہے اُنھیں اقتدار کی مستی
کچھ ایسی شکل ہے جیسے شراب پیتے ہیں
چھپا چھپا کے رکھی تھی جناب کی خاطر
مرا خیال یہی تھا جناب پیتے ہیں
یہ دَور وہ ہے کہ زِندانِ اہلِ ظرف حفیظ
لہو کے گھونٹ بچشمِ پُرآب پیتے ہیں

(جی ایچ کیو راولپنڈی: ۱۹۵۰ء)

○

محتسب کیفیتِ پیرِ مغاں کھلتی نہیں
دِن نکل آیا مگر اُس کی دُکاں کھلتی نہیں

ہائے کل تک جن کو اُلفت کے سبق دیتا تھا میں
آج اُن کے سامنے میری زباں کھلتی نہیں

کہہ دیا ظالم نے سن سن کر مری رُودادِ شوق
آپ کے منہ پر تو کچھ یہ داستاں کھلتی نہیں

مجھ کو دنیا کی حقیقت کھولنے سے واسطہ
مجھ پر اپنی ہی حقیقت مہرباں کھلتی نہیں

عرش سے دُھتکار کھا کر لوٹ آتی ہے دُعا
فرش کی جانب اثر کی کھڑکیاں کھلتی نہیں

سن کے میرا حالِ دِل خاموش رہ جاتا ہے کیوں
تیرے دل کی بات کیوں اے رازداں کھلتی نہیں

فکرتِ اعجازِ عیسےٰ کا تو کھل جاتا ہے پول
ہاں مگر کیفیتِ دردِ نہاں کھلتی نہیں

اب مجھے شک ہے کہ ہیں اخلاص کے معنی کچھ اور
اب تو کچھ طرزِ تپاکِ دوستاں کھلتی نہیں

دِل پرانے دور ہی کی ایک اُلجھن ہے حفیظؔ
جس کے پیچ و خم کی مجھ سے گھنڈیاں کھلتی نہیں

(شملہ: ۱۹۳۶ء)

○

اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی
ہمیشہ وصل ہی کی رات ہوتی

خوشی کا کھیل ایسا کھیلتے ہم
کسی کی بھی نہ بازی مات ہوتی

یہ بازو چاند کو ہالے میں رکھتے
اُدھر باہر بھری برسات ہوتی

اگرچہ رُوٹھنا منا بھی ہوتا
مگر تعمیلِ ارشادات ہوتی

نہیں کہتے ہوئے تم ہنس بھی دیتے
نفی میں شوخیِ اَثبات ہوتی

گھڑی بھر کو جدا ہوتے نہ ہم تم
یہ وحدت از روئے آیات ہوتی

نگاہوں میں نگاہوں کے نشے سے
شرابوں کی عجب بہتات ہوتی

نہ مرتا شیخ جنت کی ہوس میں
کہ حوروں کی یہیں بارات ہوتی

صدائے مرغِ بے ہنگام و بے کیف
نہ ہرگز قاطعِ لذات ہوتی

ظہورِ صبحِ صادق سے رگوں میں
فزوں بیداریِ جذبات ہوتی

وضو کرتے نمازیں ہم بھی پڑھتے — تو بارانِ تجلیات ہوتی
جہالت محتسب کی بھی نہ ہرگز — دخیلِ کارِ معقولات ہوتی
خدا کی ذات ہوتی مسجدوں میں — ہمارے گھر ہماری ذات ہوتی
عطائے خاصِ خالق جیش در جیش — برائے عیشِ مخلوقات ہوتی
کوئی کچھ بھی کہے لیکن ہماری — اسی صورت بسر اوقات ہوتی
جہاں بھی عاشق و معشوق ہوتے — یہی کچھ صورتِ حالات ہوتی

حفیظؔ ایسا بہت کچھ اور ہوتا
اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی

○

دوستانہ تعلقات کی بات
اِک نظر کی نظر ہے، بات کی بات

موت کے ذِکر پر ہے خندۂ لب
میری بیتی ہوئی حیات کی بات

ہر ستائش نمائش آرائش
ذات کی ظرف کی برات کی بات

نالہ ہے نغمہ ہے خموشی ہے
اپنے اپنے تاثرات کی بات

ظاہری شکل سے حفیؔظ ڈرو
نہ کرو باطنی صفات کی بات

○

توبہ ہے آہ میری توبہ ہے — اے شبِ ماہ میری توبہ ہے
میری توبہ کے بعد ہی یہ سماں — میرے اللہ میری توبہ ہے
سامنے ہے دھری ہوئی وہ شے — اور میں' آہ میری توبہ ہے!
میرے یارو مرا یقین کرو — آج واللہ میری توبہ ہے
مجھ سے منہ پھیرتے ہیں آئینے — وجہ اِکراہ میری توبہ ہے
ذکرِ توبہ پہ واہ واہ کا شور — آہ میں، واہ میری توبہ ہے
قہر کی لہر چشمِ ساقی میں — ہائے اللہ میری توبہ ہے
دوستوں سے بگاڑ کا باعث — میری بدخواہ میری توبہ ہے
در بدر میکدے سے تا مسجد — میرے ہمراہ میری توبہ ہے
کون جانے کہ خود مرے ہی لیے — کتنی جانکاہ میری توبہ ہے
ملتے ہیں کس تپاک سے کم ظرف — سب ہیں آگاہ میری توبہ ہے
مسجد و میکدہ میں وجہِ فساد — گاہ میں گاہ میری توبہ ہے
بات یہ ہے کہ بات کچھ بھی نہیں — مجھ سے آگاہ میری توبہ ہے
کیا کرے گی بروئے موجِ بہار — اِک پرِکاہ میری توبہ ہے

ڈوبتے وقت کہہ رہا تھا حفیظ
اے نئی چاہ میری توبہ ہے

(حیدرآباد: ۱۹۴۷ء)

○

ہے خزاں بھی دم بخود ، رنگِ گلستاں دیکھ کر
گُل کو گریاں دیکھ کر ، بلبل کو خنداں دیکھ کر

شانِ رحمت کو بھی اپنا جائزہ لینا پڑا
آ پڑی مشکل مرا طومارِ عصیاں دیکھ کر

اس مشقت گاہ میں اک گوشۂ راحت بھی ہے
مطمئن ہوں منظرِ گورِ غریباں دیکھ کر

سنگدل سمجھا برہمن شیخ سمجھے بد مذاق
ہنس پڑے دونوں مجھے اب تک مسلماں دیکھ کر

شکوہ فرماتے ہی اُلٹی منتیں کرنی پڑیں
دل پشیماں ہو گیا ، اُن کو پشیماں دیکھ کر

○

قولاً تو ہم بھی مے کے لیے ہاں نہ کر سکے
فعلاً خلافِ مرضیِ رنداں نہ کر سکے

رکھتے تھے اشکِ گرم بھی ہم آہِ سرد بھی
اظہارِ دردِ دل کسی عنواں نہ کر سکے

بت خانہ سامنے ہو تو لے کر خدا کا نام
ہے کوئی کام جس کو مسلماں نہ کر سکے

کچھ اس طرح خلافِ توقع تم آ گئے
ہم گڑ بڑا گئے کوئی ساماں نہ کر سکے

ہستی کا پیرہن نہیں دامانِ یار ہے
دستِ جنوں بھی جس کو گریباں نہ کر سکے

دل خانۂ خدا ہے شکستِ بتاں کے بعد
ویرانہ ہے جسے کوئی ویراں نہ کر سکے

یہ سانس ہی تو وجہِ مرض ہے مگر طبیب
اِتنے سے ایک درد کا درماں نہ کر سکے

اب "شاہکارِ فن" وہی صورت ہے جس کا رنگ
سیرت اگر کسی کی نمایاں نہ کر سکے

احباب نے حفیظؔ تواضع تو کی بہت
لیکن ہماری شان کے شایاں نہ کر سکے

(کراچی: ۱۹۵۳ء)

○

عطا ہوا یہ شَرَف بزمِ دوستاں سے مجھے
کہ ان کو دوست ہی کہنا پڑا زباں سے مجھے

یہ خوف بھی ہے ستمگاریِ بتاں سے مجھے
خدا اُٹھا ہی نہ لے اِن کے درمیاں سے مجھے

خبر نہ تھی کہ غبارے گرا بھی کرتے ہیں
زمیں پہ دیکھ رہے تھے تم آسماں سے مجھے

صنم کدوں میں تو گم ہو چکے ہیں چودہ طبق
گیا حرم سے تو لاؤ گے پھر کہاں سے مجھے

نہیں ہے دام کا محتاج خودسری کا مزاج
اُچک لے اے مرے صیاد آشیاں سے مجھے

۳

یہ رہزنوں کے بھی رہبر ہیں جانتا کیسے؟
کہ حسنِ ظن تھا ہر اِک میرِ کارواں سے مجھے

حفیظؔ اُسی کی عطا ہے مری سرفرازی
یہ ذوقِ سجدہ ملا ہے جس آستاں سے مجھے

○

دل سے ترا خیال نہ جائے تو کیا کروں
میں کیا کروں کوئی نہ بتائے تو کیا کروں

امید دل نشیں سہی دنیا حسیں سہی
تیرے بغیر کچھ بھی نہ بھائے تو کیا کروں

دل کو خدا کی یاد تلے بھی دبا چکا
کم بخت پھر بھی چین نہ پائے تو کیا کروں

دن ہو کہ رات ایک ملاقات کی ہے بات
اِتی سی بات بھی نہ بن آئے تو کیا کروں

جو کچھ بنا دیا ہے ترے انتظار نے!
اب سوچتا ہوں تو اِدھر آئے تو کیا کروں

دِیدہ ورانِ بتکدہ اِک مشورہ تو دو
کعبہ جھلک یہاں بھی دکھائے تو کیا کروں

اپنی نفی تو فلسفی جی قتلِ نفس ہے
کہیے کوئی یہ جرم بجھائے تو کیا کروں

یہ ہائے ہائے مضحکہ انگیز ہے تو ہو
دِل سے اُٹھے، زبان جلائے تو کیا کروں

میں کیا کروں میں کیا کروں، گردان بن گئی
میں کیا کروں، کوئی نہ بتائے تو کیا کروں

اخبار سے مری خبرِ مرگ اے حفیظؔ
میرا ہی دوست پڑھ کے سنائے تو کیا کروں

(بنارس: ۱۹۴۵ء)

○

شگفتن سے فسردن کم نہیں ہے — خوشی کوئی ورائے غم نہیں ہے
خدا ناآشنا ہے دردِ دِل سے — ہمارا کوئی بھی محرم نہیں ہے
تحمل اے مرے زخمِ رگِ جاں — بجز ناخن ترا مرہم نہیں ہے
نقوشِ پا ہیں بیچارے ستارے — کہیں بھی منزلِ آدم نہیں ہے
کھلا کر پھول کو مرجھانے والی — نظر کی آگ ہے شبنم نہیں ہے
نگاہیں اور اتنی سجدہ گاہیں — مرا سر ہے کہ اب تک خم نہیں ہے
جمی ہے یہ نظر انجامِ جم پر — مرا مطلوب جامِ جم نہیں ہے
یہ قبضہ ہے خلافِ حق و انصاف — جہنم وِرثہء آدم نہیں ہے
تجھے کیا ہو گیا چشمِ تمنا — مزاجِ یار کیوں برہم نہیں ہے
یہ بت پتھر نظر آتے ہیں اب تک — مسلماں کے لہو میں نم نہیں ہے

حفیظ اس شہر میں مرگِ وفا پر
کہیں بھی محفلِ ماتم نہیں ہے

(کراچی: ۱۹۶۳ء)

ہوں زمیں پر حیات باقی ہے — کون سی اور بات باقی ہے
خوش نہ ہووے کے جان اے ایماں — حشر کی واردات باقی ہے
شاخِ آہو تو ہو چکی معدوم — عاشقوں کی برات باقی ہے
خانۂ دِل میں اب خدا کے حضور — ایک اپنی ہی ذات باقی ہے
پھر چمک اے ہلال کے خنجر — اِک رگِ سومنات باقی ہے
صبح ہے جلوہ بار اندھوں پر — آنکھ والوں کی رات باقی ہے
آبروئے حیات کی خاطر — آرزوئے حیات باقی ہے
بہرِ گریہ بیادِ تشنہ لباں — آبِ رُودِ فرات باقی ہے
اے خدا تیری کائنات کے ساتھ — میری بھی کائنات باقی ہے
دورِ گردُوں کی بے ثباتی پر — خندۂ حادثات باقی ہے

اے حفیظ اس جہانِ فانی میں
کیوں تمھاری وفات باقی ہے

(کراچی: ۱۹۵۸ء)

○

ہماری طرف اب وہ کم دیکھتے ہیں
نگاہیں نہیں ، جن کو ہم دیکھتے ہیں

خوشی ڈھونڈتے ہیں نہ غم دیکھتے ہیں
وہ اک اور شے ہے جو ہم دیکھتے ہیں

جنھیں محوِ خوابِ عدم دیکھتے ہیں
انہیں کس تسلی سے ہم دیکھتے ہیں

مری بندگی اے خدا دیکھ تو بھی
اسے جس ادا سے صنم دیکھتے ہیں

بتوں کو خبر کیا ، انھیں کس نظر سے
بزرگانِ اہلِ حرم دیکھتے ہیں

سنی تھی کہانی کبھی جامِ جم کی
اب آنکھوں سے انجامِ جم دیکھتے ہیں

ہماری ہی تدبیر سے ہم کو ذلت
دکھاتی ہے تقدیر ہم دیکھتے ہیں

خوشا وضعداری کہ ہر اہلِ دِل کو
مسلسل گرفتارِ غم دیکھتے ہیں

رہِ راست اک زُلف ہے جس میں رہبر
نئے سے نئے پیچ وخم دیکھتے ہیں

بہت تیز رو تھے پلٹ جانے والے
ہم اندازِ نقشِ قدم دیکھتے ہیں

حفیظؔ آ رہی ہے صدا دوستوں کی
مری راہ اہلِ عدم دیکھتے ہیں

(حیدرآباد سندھ ۱۹۶۴ء)

○

میں جو آماجگاہ بن بیٹھا — تیر ترچھی نگاہ بن بیٹھا
سوئے منزل اُٹھا جہاں بھی قدم — راہبر سنگِ راہ بن بیٹھا
خونِ دل اشکِ گرم بن نہ سکا — جم گیا ، سرد آہ بن بیٹھا
فقر نے بوریا دیا مجھ کو — تن کے میں بادشاہ بن بیٹھا
حسن نے جب کہیں پناہ نہ دی — عشق خود بے پناہ بن بیٹھا
کون ہے شہسوار جس کے لیے — آسماں گردِ راہ بن بیٹھا!
تیرے اپنوں کی خیر ہو یارب — غیر بھی خیر خواہ بن بیٹھا
دردِ اُٹھا تھا آہ آہ کے ساتھ — شعر میں واہ واہ بن بیٹھا
لیجیے، کیجیے کچھ اور بھی ضبط — اشک رُکتے ہی آہ بن بیٹھا

حشر کے دن بھی اے حفیظؔ اگر
ہر کوئی بے گناہ بن بیٹھا؟

(ڈھاکہ: ۱۹۶۶ء)

○

یہ ملاقات ملاقات نہیں ہوتی ہے
بات ہوتی ہے مگر بات نہیں ہوتی ہے

باریابی کا برا ہو کہ اب اُن کے در پر
اگلے وقتوں کی مدارات نہیں ہوتی ہے

غم تو گھنگھور گھٹاؤں کی طرح اُٹھتے ہیں
ضبط کا دشت ہے برسات نہیں ہوتی ہے

یہ مرا تجربہ ہے حسن کوئی چال چلے
بازیِ عشق کبھی مات نہیں ہوتی ہے

وصل ہے نام ہم آہنگی و یک رنگی کا
وصل میں کوئی بری بات نہیں ہوتی ہے

ہجر تنہائی ہے، سورج ہے سوا نیزے پر
دن ہی رہتا ہے یہاں رات نہیں ہوتی ہے

ضبطِ گریہ کبھی کرتا ہوں تو فرماتے ہیں
آج کیا بات ہے برسات نہیں ہوتی ہے

مجھے اللہ کی قسم شعر میں تحسینِ بتاں
میں جو کرتا ہوں میری ذات نہیں ہوتی ہے

فکرِ تخلیقِ سخن مسندِ راحت پہ حفیظؔ
باعثِ کشف و کرامات نہیں ہوتی ہے

○

اس نئے دن کو ہوں میں رات سمجھنے والا
ہے کوئی آج مری بات سمجھنے والا

جلوۂ صبحِ قیامت کے لیے ہے بیدار
چاند تاروں کے اشارات سمجھنے والا

منتظر ہے کہ ہو مغرب سے طلوعِ خورشید
اپنے اللہ کی آیات سمجھنے والا

تو سمجھتا ہے جسے رنگِ بہارِ گلبار
میں اُسے خون کی برسات سمجھنے والا

تیرے ہاتھوں ہی نمایاں ہیں وہ فتنے کہ جنھیں
تو ابھی تک ہے ''محالات'' سمجھنے والا

آج کل تو بھی نشے میں ہے تو مجھ سے نہ اُلجھ
میں ہوں کم ظرف کی اوقات سمجھنے والا

دورِ بالغ نظراں اور ہے یہ دور نہیں
ہم بزرگوں کے مقامات سمجھنے والا

میرے بگڑے ہوئے تیور بھی سمجھ لے اے کاش
میرے بگڑے ہوئے حالات سمجھنے والا

درِ زنداں پہ ہے اک طرفہ غضبناک ہجوم
شانِ رندانِ خرابات سمجھنے والا

مجلسِ وعظ میں خاموش جو دیکھا مجھ کو
چل دیا اُٹھ کے مری بات سمجھنے والا

اس خراباتِ جہاں میں ہے بہرحال خراب
میکدے کو بھی خرابات سمجھنے والا

دوست شایانِ ملاقات نہ سمجھیں مجھ کو
میں ہوں اس لطف کو خیرات سمجھنے والا

اب خدا کو ملک الموت ہی شاید بخدا
ہو تو ہو قاضیِ حاجات سمجھنے والا

ارض شاکیِ فلک اور فلک بے چارا
اَرض کو مصدرِ آفات سمجھنے والا

یہ ہے دنیائے خرد، اس میں نہ پاؤ گے کہیں
اب کسی کو بھی کوئی بات سمجھنے والا

اس نئے رنگِ غزل سے ہے پریشان حفیظؔ
شعر کو حرف و حکایات سمجھنے والا

(کراچی-دسمبر ۱۹۵۸ء)

○

پناہِ زندگانی ڈوب مرنے کے سوا کیا تھی
یہ کشتی موجِ دریا تھی ، مگر بیرونِ دریا تھی

مجھے بھی شوق تھا پینے کا جینے کی تمنا تھی
مرا بھی ایک عالم تھا مری بھی ایک دنیا تھی

بتوں کی شوخیِ نقشِ کفِ پا کا میں قایل تھا
مگر سجدہ نہ کرنا میرے سر کی لغزشِ پا تھی

یہاں اظہارِ حق میں کوئی بھی نقصاں نہیں بندے
خدا انساں نہیں بندے یہ عقبےٰ ہے وہ دنیا تھی

فسادِ سیرتِ انساں نمایاں کر رہا تھا میں
نظر ڈالی تو خود اپنی ہی صورت جلوہ آرا تھی

اِدھر کعبہ کہاں ، یہ تو مراحل بتکدوں کے ہیں
کدھر کھینچے لیے جاتے ہیں پھر مجھ کو مرے ساتھی

کلیمی منتشر تھی ، سامریت ہی میں ایکا تھا
جہاں سونے کا بچھڑا تھا وہیں پر خلق یکجا تھی

فراقِ بت کدہ میں شیخ اب مسجد سے نالاں ہیں
یہاں اللہ ہی اللہ ہے وہاں ہر شے مہیا تھی

تم آئے شامت آئی اے مرے ناصح ، مرے بھائی
جدھر دیکھا ملامت ہی ملامت کار فرما تھی

حفیظؔ اللہ سے تو سچ ہی کہہ دینا مناسب ہے
بتا دے اَحْسَنُ الْمَخْلُوْق تیرے دَور میں کیا تھی

(مالیر چھاؤنی - کراچی : ۱۹۵۸ء)

○

جرس کی ہر صدا اَب رائگاں ہے
تباہی کارواں در کارواں ہے

بہر سو اِک ہجومِ رہبراں ہے
کسے پوچھوں مرا رہزن کہاں ہے

لہو کی بو ہے آتش ہے دھواں ہے
مرا ہندوستاں جنت نشاں ہے

معاذ اللہ معراجِ ترقی
زمیں اُوپر ہے نیچے آسمان ہے!

فراقِ دوستاں تھا شاق جس کو
وہ مشتاقِ فراقِ دوستاں ہے

(دہلی: جولائی ۱۹۴۷ء)

○

تلاشِ مدعا ہے اِدّعا کو چھوڑ آیا ہوں
خدا کی راہ پر ہوں ناخدا کو چھوڑ آیا ہوں

تمھیں ہر موڑ پر اِک راہزن سے بچ کے چلنا ہے
کہ میں ہر موڑ پر اِک رہنما کو چھوڑ آیا ہوں

پناہِ خانقاہی کی گھٹن، توبہ مَعاذ اللّٰہ
جنابِ شیخ کے دَارُ البَقا کو چھوڑ آیا ہوں

سزا بت خانے میں تیار تھی، میں نے سزا پائی
صلہ جس کا ملا اب اُس خطا کو چھوڑ آیا ہوں

چلا ہوں جب سے خالی جام لے کر سوئے میخانہ
بہر گام اِک شکست بے صدا کو چھوڑ آیا ہوں

وبالِ دوش و فردا کیوں مسافت میں لیے پھرتا
خیالِ اِبتدا و اِنتہا کو چھوڑ آیا ہوں

نگاہِ واپسیں ایسی بھی ڈال آیا ہوں یاروں پر
کہ جیسے ایک تیرِ بے خطا کو چھوڑ آیا ہوں

بیانِ درد پر تحسین کی "ھُوْ حَقْ" سے شرما کر
میں خود ہی محفلِ درد آشنا کو چھوڑ آیا ہوں

حفیظؔ اِک طنز گفتار و شگفتہ کار شاعر تھا
نہ جانے میں کہاں اُس ہمنوا کو چھوڑ آیا ہوں

(راولپنڈی: ۱۹۵۷ء)

○

ہم جس مقام پر ہیں وہاں سب مزے میں ہیں
سب کر رہے ہیں آہ و فغاں سب مزے میں ہیں

ہم لوگ تشنگی زدگاں سب مزے میں ہیں
تیرے مرید پیرِ مغاں سب مزے میں ہیں

ہر میرِ کارواں کے قدم چومتے ہوئے
ہم ہیں مثالِ گردِ رواں سب مزے میں ہیں

بیچارگانِ راہِ خدا سب ہیں پائمال
آوارگانِ کوئے بتاں سب مزے میں ہیں

یہ بوم و چغد و زاغ و زغن ، پیشہ ور نقیب
نوبت زنِ مزارِ شہاں سب مزے میں ہیں

مجھ کو خبر نہیں کہ یہ ہستی ہے یا عدم
میں تو یہ دیکھتا ہوں یہاں سب مزے میں ہیں

جس روز سے وجودِ بشر کی نمود ہے
اُس روز سے زمین و زماں سب مزے میں ہیں

وہ مطمئن ہیں ، پوچھ کے حالاتِ اہلِ دِل
منہ سے نکل گیا تھا کہ ہاں سب مزے میں ہیں

کیا دُوسرا جہان مزے کا ہے اے حفیظ
لے چل ہمیں بھی ساتھ جہاں سب مزے میں ہیں

○

کیسے بند ہوا ، میخانہ ، اب معلوم ہوا
پی نہ سکا کم ظرف زمانہ ، اب معلوم ہوا

اب ہوش آیا ، حالِ زمانہ اب معلوم ہوا
سب فرزانے ، میں دیوانہ ، اب معلوم ہوا

اللہ اللہ کارگزاری ان فرزانوں کی
یوں تعمیر ہوا ویرانہ اب معلوم ہوا

زندہ مردے ناچ رہے ہیں اپنی قبروں پر
ایک نیا رقصِ مستانہ ، اب معلوم ہوا

خالی شیشے طاق پہ دھرتا جاتا ہے ساقی
بھرتا جاتا ہے پیمانہ ، اب معلوم ہوا

شاد تھے ہم آنکھوں سے رنگیں چشمہ پھوٹا ہے
ٹوٹا ہے دِل کا پیمانہ ، اب معلوم ہوا

جرمِ وفا میں گھر تو گیا تھا، سر بھی جائے گا
ہم پر یہ بھی ہے جرمانہ ، اب معلوم ہوا

دِل نے پلکوں تک آنے میں اِتنا وقت لیا
دُور تھا کعبے سے بتخانہ ، اب معلوم ہوا

محفل خوش کیوں تھی، یہ حقیقت اب محسوس ہوئی
درد بھرا اپنا افسانہ ، اب معلوم ہوا

سر سہلاتا شہرِ سخن سے باہر نکلا ہوں
زور پہ ہے مشقِ طفلانہ ، اب معلوم ہوا

فکرِ شعر حفیظؔ ہے چسکا آنسو پینے کا
جینے کا دلچسپ بہانہ ، اب معلوم ہوا

○

دوست بن جاتے ہیں کیوں اعدائے دوست
تو بھی دے اِس مسئلے میں رائے دوست

مضحکہ خیز اور درد انگیز دُھن
سن بجائے ہائے دِل اب ہائے دوست

کیسۂ زر پر تو ہے دستِ صفا
کاسۂ سر کیوں ہے زیرِ پائے دوست

جانِ شیریں دوست کی اِک شے تو ہے
دوست کا غم تلخ ہے، کیوں کھائے دوست

اے میرے دامِ وفا دانہ بکھیر
گھیر، جونہی پھر پلٹ کر آئے دوست

زیرِ مدفن ہے کفن بھی زیبِ تن
کاش یہ تازہ خبر سن پائے دوست

کر رہا ہوں دوستی کا اختصار!
اے حفیظؔ اب دیکھ کیا فرمائے دوست

○

نہ پوچھو کہ اِنسان کیا چاہتا ہے
سمجھ لو کہ شیطان کیا چاہتا ہے

نہ جینے سے خوش ہے نہ مرنے پہ راضی
بالآخر مسلمان کیا چاہتا ہے

کوئی ایک ارماں کوئی ایک حسرت
یہ دِل ہم سے ہر آن کیا چاہتا ہے

زمیں کا تو پیوند ہوں، اس سے آگے
مرے دوست شیطان کیا چاہتا ہے؟

سمجھ میں نہیں آئیں ناصح کی باتیں
نہ جانے یہ نادان کیا چاہتا ہے

حفیظؔ آخری دور ہے غور کر لے
مری جان، ایمان کیا چاہتا ہے

○

پار اُترا ہوں کس قرینے سے
موج اُٹھا لے گئی سفینے سے

جی ہی جب بھر چکا ہو جینے سے
دوستو کیا بنے گا پینے سے

درد ہے اور نہ دِل مگر اب تک
ہاتھ چمٹا ہوا ہے سینے سے

بڑھتے بڑھتے گھٹا ہے جوشِ حیات
چڑھتے چڑھتے گرا ہوں زینے سے

جی اُٹھوں گا مجھے امید تو ہے
پھر ہوا آئے گی مدینے سے

قلب کو اور بھی کرید حفیظؔ
لال نکلیں گے اس دفینے سے

(فوجی ہسپتال راولپنڈی: ۱۹۶۹ء)

○

سوجھی کیوں تھی پیش و پس کی — بات کہاں تھی اپنے بس کی
آندھی اُٹھی ، سیلاب آیا — قسمت جاگی خار و خس کی
صیادوں کی دل تنگی ہے — وسعت میرے کنجِ قفس کی
حسنِ نظر نے پھیر لیں آنکھیں — عشق میں دیکھی شکل ہوس کی
دستِ قضا سلجھائے تو سلجھے — اُلجھن میرے تارِ نفس کی
مہر بلب رہنے دے ورنہ — پھوٹ بہے گی چھاگل رس کی

شعر حفیظؔ تبھی ٹپکے گا
جان کھنچے گی جب نس نس کی

○

خون بن کر مناسب نہیں دِل بہے
دِل نہیں مانتا ، کون دِل سے کہے

تیری دُنیا میں آئے بہت دن رہے
سکھ یہ پایا کہ ہم نے بہت دُکھ سہے

بلبلیں گل کے آنسو نہیں چاٹتیں
ان کو اپنے ہی مرغوب ہیں چہچہے

عالمِ نزع میں سن رہا ہوں میں کیا
یہ عزیزوں کی چیخیں ہیں یا قہقہے

اس نئے حسن کی بھی اداؤں پہ ہم
مر مٹیں گے بشرطیکہ زندہ رہے

تم حفیظؔ اب گھسٹنے کی منزل میں ہو
دَورِ ایام پہیہ ہے ، غم ہیں پہے

(بسترِ علالت' لاہور: ۳۰ء۱۹۷ء)

○

جان قربان کیوں نہ ہو جائے مشکل آسان کیوں نہ ہو جائے
اتنے فرزانے کار فرما ہیں شہر ویران کیوں نہ ہو جائے
زلف کی برہمی معاذ اللہ! دل پریشاں کیوں نہ ہو جائے
کیا کمی رہ گئی ہے اے شیطان تو بھی اِنسان کیوں نہ ہو جائے
میں اُسے دوست ہی سمجھتا ہوں دوست حیران کیوں نہ ہو جائے
بارِ تن ہے کفن ، اتار ہی لے یہ بھی احسان کیوں نہ ہو جائے
بر سرِ عام زہد و رندی میں جان پہچان کیوں نہ ہو جائے
خود فروشی ہی اب ہے مدِ نظر خواہ نقصان کیوں نہ ہو جائے
بہ تقاضائے رسم و راہِ قدیم تم کو نسیان کیوں نہ ہو جائے
حلق سے ہائے وائے کیوں نکلے در پہ دربان کیوں نہ ہو جائے
ناخدا ہی تو اصل خطرہ ہیں قطرہ طوفان کیوں نہ ہو جائے

جرم ہے اب حفیظؔ عرضِ ہنر!
یہ بھی اعلان کیوں نہ ہو جائے

(جہلم ۱۹۶۸ء)

○

تلخی کا سبب، میری سمجھ میں نہیں آتا
یارانِ طرب، میری سمجھ میں نہیں آتا

آدم ہی کے فرزند سے تیرا یہ توصل
اے بنتِ عنب میری سمجھ میں نہیں آتا

شیشے سے رہا ہوتی ہوئی لال پری کا
یہ جوشِ غضب، میری سمجھ میں نہیں آتا

اِصرار پہ انکار تو آتا ہے سمجھ میں
ہاں خندۂ لب، میری سمجھ میں نہیں آتا

پینے سے بھی پرہیز نہ پینا بھی الم ریز
اپنا ہی ادب ، میری سمجھ میں نہیں آتا

تنہائی میں بیٹھے ہوئے رونے کا تماشا
ہنس دیتا ہوں جب میری سمجھ میں نہیں آتا

یہ دور حفیظؔ اور ترے فن کا وہی طور
سچ یہ ہے کہ اب میری سمجھ میں نہیں آتا

○

شاعر لوگ ہیں کیوں دیوانے یہ فرزانے کیا جانیں
دُھن کا گن دیوانہ جانے ، یہ فرزانے کیا جانیں

فرزانے تو بزم سجانا ، شمع جلانا جانتے ہیں
کیوں جل مرتے ہیں پروانے یہ فرزانے کیا جانیں

ہوش تو خالی خول ہے جسکا ڈھول بجاتے پھرتے ہیں
کیا ہے خول کے اندر خانے یہ فرزانے کیا جانیں

تن من دھن کی گرما گرمی سرد آہوں کے دم سے ہے
فکرِ سخن کے تانے بانے یہ فرزانے کیا جانیں

○

یہ اندھیرا گھر، یہ تنہائی مری
دیدنی ہے بزم آرائی مری

جلوہ گر ہیں بھولی بسری عادتیں
ہے جہاں افروز بینائی مری

اپنی ہی نادانیوں کی فوج سے
معرکہ آرا ہے دانائی مری

زندہ ایسا ہوں کہ میرے "یار مار"
مانتے ہیں سب مسیحائی مری

رُو بدو ہے ذات اپنی ذات سے
بات کرتی ہے پذیرائی مری

ملک و ملت کی زباں ہے اے حفیظؔ
نقش بر دیوار گویائی مری

○

کچھ مزا آنے لگا اب دوستو
ہاں مسلسل نیشِ عقرب دوستو!

جا رہے ہو؟ جاؤ، لیکن لوٹ آؤ
لوٹ آؤ جب ہو مطلب دوستو!

دشمنوں کی شہسواری کے لیے
دوست ہی بنتے ہیں مرکب دوستو

کس قدر اِخلاص رکھتا ہے نفاق
آؤ سوچیں بیٹھ کر سب دوستو

دیکھتے ہیں واہ وا کہتے ہوئے
دوستی کے دوست کرتب دوستو

ہے ادق تازہ بتازہ ہر سبق
اور میں اِک طفلِ مکتب دوستو

دریچے

تجھ کو اگر گنواؤں تجھ سا کہاں سے لاؤں
اے دل تری ادا کا پتلا کہاں سے لاؤں
وہ سادہ سادہ رونا وہ بے ارادہ ہنسنا
آغازِ آرزو کی دنیا کہاں سے لاؤں
طوفان خیز آنکھیں اب خشک ہو چکی ہیں
قطرے کو رو رہا ہوں دریا کہاں سے لاؤں

کیوں ہے پھر شوقِ ملاقات نہیں تم سمجھے
اس میں کیا بات ہے کیا بات نہیں تم سمجھے؟
میرے خاموش سوالات، نہیں تم سمجھے
سچ کہو، ہے نا یہی بات، نہیں تم سمجھے
صورت ایسی ہے تو لازم نہیں سیرت ہو بری
اتفاقاً یہی اک بات نہیں تم سمجھے!

معاذ اللہ ہے میری زباں پر
پلٹ کر بت کدے سے آ رہا ہوں
نرالا مشغلہ ہاتھ آ گیا ہے
نفس گن گن کے جی بہلا رہا ہوں
مرے بالیں سے جاتے ہو تو جاؤ
میں اپنے آپ ہی سے جا رہا ہوں

آویزے

سکونِ زندگی ترکِ عمل کا نام ہے شاید
نہ خوش ہوتا ہوں آساں سے نہ گھبراتا ہوں مشکل سے
جدائی پر بھی حسن و عشق کی وابستگی دیکھو
کہ مجنوں آہ کرتا ہے، دُھواں اُٹھتا ہے محمل سے

حسن کی آنکھ اگر حیا نہ کرے — عشق زندہ رہے خدا نہ کرے
کس قدر بے کسی کا عالم ہے — چاہتا ہوں کوئی دُعا نہ کرے

آیا تھا بزمِ شعر میں عرضِ ہنر کو میں — اب جا رہا ہوں ڈھونڈنے اہلِ نظر کو میں
سر پھوڑنا کمالِ جنوں بھی نہیں رہا — بیٹھا رہوں گا سر میں لیے دردِ سر کو میں

حیران ہو کے منہ مرا تکتے ہیں بار بار — احساں کِیا، یہ گریۂ بے اختیار نے
اغیار سے بھی کرنے لگے وعدہ ہائے حشر — عادت بگاڑ دی ہے مرے اعتبار نے

جئے جاتا ہوں اس شرمندگی میں — مجھے مرنا ہے ایسی زندگی میں
مری صورت کدورت بن رہی ہے — جبینِ یار کی تابندگی میں

آپ ہیں موجود کوثر پر تو خیر — فخرِ موجوداتؐ پی لیتا ہوں میں
کہہ کے بسم اللہ بھر لیتا ہوں جام — پڑھ کے چند آیات پی لیتا ہوں میں

زندگی اور ملے اور ملے اور ملے! — شرط یہ ہے کہ پرانا وہی لاہور ملے
دور ہے تازہ حماقت کا وفا کو مطلوب — ہے کوئی دوست جو آ کر مجھے فی الفور ملے

جو مرے دل میں ہے کہنے دیجیے — یا مجھے خاموش رہنے دیجیے
پھول ہوں کانٹا ہوں جو کچھ ہوں مجھے — آنسوؤں کی رَو میں بہنے دیجے

بات بھی جس سے اب نہیں ممکن! — آؤ اُس بے وفا کی بات کریں!
شیخ صاحب کو لے کے ساتھ چلیں — بت کدے میں خدا کی بات کریں

سامنے دخترِ برہمن ہے — آج اَوسان کا خدا حافظ
جان دینے سے ہچکچاتا ہوں — مرے ایمان کا خدا حافظ

دِن کی صورت نظر آتے ہی مری رات ہوئی — بازی آغاز نہ پائی تھی کہ شہ مات ہوئی
زندگی بھی نہیں سمجھی مرے مر مٹنے کو — موت بھی پوچھتی پھرتی ہے یہ کیا بات ہوئی

اجنبیوں کے شہر میں گم ہوں مگر میں کون ہوں دیدہ ودِل کی ہے تلاش کس کو خبر میں کون ہوں؟
اپنی نگاہ کے سوا کچھ بھی نہیں میں دیکھتا مجھ کو بھی دیکھنا ذرا اہلِ نظر میں کون ہوں

حیاتِ جاوداں ہم کیا کریں گے جہاں تم ہو وہاں ہم کیا کریں گے
کہے گی کیا ہماری بے زبانی بوقتِ امتحاں ہم کیا کریں گے

جو بھی ہے صورتِ حالات کہو چپ نہ رہو رات اگر ہے تو اسے رات کہو چپ نہ رہو
گھیر لایا ہے اندھیروں میں ہمیں کون حفیظؔ آؤ کہنے کی ہے جو بات کہو چپ نہ رہو

ذکر اُستادِ فن کا جانے دے کسی نقادِ فن کا حال سنا
خالقانِ سخن کی فکر نہ کر قاتلانِ سخن کی چال سنا

میرے آقا تجھے بندے کا خیال آ ہی گیا آخرکار مرا یوم وصال آ ہی گیا
بے تکلف اُسے جانا غلطی ہو ہی گئی غلطی ہو ہی گئی لب پہ سوال آ ہی گیا

بت کہتے ہیں مر جا مرجا! حکم خدا ہے اور ٹھہر جا
ہائے کو نعرۂ "ھُو" سے بدل دے یار حفیظؔ یہ کام تو کر جا

اللہ جانے واصل ہے کب سے　　فرزندِ حوا بنتِ عنب سے
شیشے کے اندر ہنس مکھ پری تھی!　　اب ہے خروشاں جوشِ غضب سے

پار اُترا ہوں کس قرینے سے　　موج اُٹھا لے گئی سفینے سے
آنسوؤ کیا بنے گا پینے سے　　جی ہی اُکتا گیا ہے جینے سے

مدفنِ غریباں ہے آؤ فاتحہ پڑھ لیں　　ہمرہو ٹھہر جاؤ دوستوں کی بستی ہے
تھا اُبال مستی کا سربلند ماضی میں　　حال دیکھنا اپنا، انتہا کی پستی ہے

یا خادمِ دیں ہونا یا مظہرِ دیں ہونا　　یا تخت نشیں ہونا یا خاک نشیں ہونا
جب کچھ بھی نہیں کرنا جب کچھ بھی نہیں ہونا　　اس ننگ سے بہتر ہے پیوندِ زمیں ہونا

او حسرتِ وصال نہ دیکھ اس طرح نہ دیکھ　　او بد نظر کہیں وہ مکرر خفا نہ ہو
کیا ہو گیا جو شانِ خدا کہہ دیا تجھے　　اتنی سی بات پر بتِ کافر خفا نہ ہو

آئینے

شفا ملے گی خدا سے دوا کرو نہ کرو　　مجھے وہ جانتا ہے تم دعا کرو نہ کرو

بیاباں ہے کہ دریا ہے بلندی ہے کہ پستی ہے　　یہ دُنیا لٹنے والوں، لوٹنے والوں کی بستی ہے

کاتبِ تقدیر کی تحریر ہوں!　　موت کی کھینچی ہوئی تصویر ہوں

عجز کی تصویر بن جاتا ہوں میں　　اب تو بے رُوٹھے ہی مَن جاتا ہوں میں

مستی تری آنکھوں کی کیا جانئے کیا شے ہے　　مے تو نہیں شیشہ ہے شیشہ تو نہیں مے ہے

حسینوں کے نخرے رقیبوں کے جھگڑے　　مصیبت میں گزرا ہے عہد جوانی!

ہاں آئیں گی بہاریں گلزار بھی کھلیں گے　　اک مرتبہ جو بچھڑے، ہم پھر نہیں ملیں گے

کہہ لے جسے جو چاہے زمانہ وہ کیا کہے　　جو خود ہی بن چکا ہو فسانہ وہ کیا کہے

بابِ نظمیات

اصنافِ نظم — چند وضاحتیں

بہت سی نظمیات اپنی توضیح خود کرتی ہیں۔ بعض کے زیر عنوان نیز کسی نظم کے خاتمے پر توضیح کر دی گئی ہے جو ذرا زیادہ وضاحت چاہتی تھیں ان میں بھی اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے کیوں کہ ان سارے بیانات میں خود اپنی ذات کو مدح سرائی کا مجرم محسوس کرتے ہوئے نادم بھی ہوں۔

اصنافِ نظم وضاحت طلب اس لیے ہیں کہ از سرتا پا یہ نظمیات پاکستان کی تحریک تسخیر و تعمیر کے واقعات و شخصیات سے متعلق ہیں جن کو تخریبیات نہ فقط بھلانے بلکہ قطعاً مٹانے کے در پے ہیں۔ لہٰذا نظموں کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس تحریر پر ضرور توجہ فرمائیے۔ اس لیے کہ اس بابِ درونِ کتاب سے اندرونِ کتاب آپ ترانۂ پاکستان کے زیر سایہ داخل ہوں گے۔ اگرچہ یہ ترانہ اپنی تخلیق سے ترویج کے دن تک چھ سات برس اسی طرح سازشوں کا شکار رہا جس طرح پاک سرزمین۔ یہ سایہ خدائے ذوالجلال ہی ہے کہ پاکستان کا پرچم لہرایا اور ''قوتِ اخوتِ عوام'' نے اسلام کا علم اٹھایا۔

عطیہ نہیں فیصلہ ہے

یہ شانِ نزول طولانی کہانی ہے جو میری سوانح حیات ''خود نوشت خوب و زشت''[۱] کا ایک باب ہے۔ یہاں فقط یہی لکھ دینا کافی ہے کہ ہائی کورٹ پاکستان کے عادلوں نے اپنے جشن صد سالہ پر میری تخلیق میری ہی زبانی دنیا سے آئے ہوئے مہمانوں کو پاکستانی ترانہ سنانے کے

---

۱ یہ کتاب نہ لکھی جا سکی۔ (مرتب)

انعام میں باضابطہ ایک سال کے بعد خوشنودی کا ایک عطیہ چاندی کا ایک قلم دان مجھ پر نچھاور کیا۔ میں نے سنایا کہ یہ انعام تمام اہل قلم کا اعزاز ہے فقط میرا نہیں اس لیے میں اس عطیے کو عدالت عالیہ کا فیصلہ قرار دیتا ہوں۔

معجزہ

اس قرارداد کی یادگار ہے جس کو میرے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نے معجزہ بن کر قائداعظم کی زبانِ صداقت ترجمان سے ہویدا کیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی صبح ساری دنیا کی یورشوں سے گھرے ہوئے ہندوستانی اور دنیا کے اسلامی نمائندوں کے اجتماع لاہور کے درمیان تسخیر پاکستان کا اعلان کیا گیا۔ اس تاریخی مقام پر آج مینار پاکستان اس معجزے کی یادگار ہے اور جس پر ترانہ پاکستان بھی ثبت ہے۔ نظم پڑھنے کے بعد آپ کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ پاکستان کی حفاظت پر کیوں جان، مال، اولاد نچھاور کر دینے چاہییں۔

اے قائداعظمؒ

آغاز ہی کا تاریخی واقعہ ہے۔ لٹے ہوئے زخمی مہاجر، وزیروں، امیروں، کلرکوں اور

محکموں کے دروازوں پر دستکارے ہی نہیں بلکہ گھر ہی کی گولیوں سے مارے بھی جا رہے تھے۔ میں ان کی فریاد لے کر وزراء صاحبان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، داد نہ ملی۔ ایک دن صبح قائداعظمؒ کا حکم آیا کہ ان کی تقریر سے پہلے قرأت کے بعد پانچ چھ لاکھ کے مجمع مہاجرین کو مجھے نظم سے خطاب کرنا ہے۔ نظم کامیاب تھی۔ قائداعظمؒ نے تحسین فرمائی۔

یہی نظم دوسرے ہی مہینے یعنی نومبر میں کراچی کے مشاعرہ ڈان کے بہت بڑے اجتماع کے اندر جب میں نے سنائی تو ۴۷ ہزار روپے کی بارش برس گئی جو قائداعظمؒ مہاجر فنڈ کے لیے تھا۔ میں لیاقت علی خاں کے ساتھ اس روپے کے سلسلے میں حاضر ہوا تو اس رقم کی قبولیت کے بعد فرمایا۔

"YOUR POETRY IS ALLRIGHT. NOW NATION NEEDS ACTION GO TO KASHMIR, STRUGGLE, DO YOUR BIT."

جناب لیاقت علی خاں کو نوٹ لکھوایا کہ افواجِ پاکستان کو جو ابھی برٹش روایات پر چل رہی ہے اسلامی فوج بنانے کے لیے شاہنامۂ اسلام کے مصنف حفیظ کو ڈائریکٹر آف مورالز بنایا جائے تو بہتر ہوگا، مجھے اس نوٹ کا ایک فقرہ یاد ہے۔

BECAUSE HAFIZ IS A NON-PARTY MAN

سلام اور پرنام

۱۹۴۷ء

آرتی مندر سے گونجی اور مسجد سے اذاں
دین و دنیا کی دو رنگی اِک خدا کی ترجماں
میں تھکا ہارا مسافر دیکھتا تھا یہ سماں
پے بہ پے رنگت بدلتے تھے زمین و آسماں

ترانۂ پاکستان

پاک سرزمین شاد باد
کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالیشان
ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سرزمین کا نظام
قوتِ اخوتِ عوام
قوم ملک سلطنت
پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مراد
پرچمِ ستارہ و ہلال
رہبرِ ترقی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال
جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

قومی ترانے کے ساتھ ہی یہ شعر اور چند سطریں نثر میں درج ہیں۔ (مرتب)

رمزِ حیات قائداعظمؒ چہ سادہ گفت
فضل خداست شاملِ حسنِ ارادہ گفت

افسانۂ ترانہ

شاعروں کے لکھے ہوئے سات سو بائیس ترانے چار برس کے دوران ترانہ کمیٹیوں نے رد کیے۔ حفیظؔ کو بلا کر یہ کام سپرد کیا گیا۔ اس نے تخلیق کیا۔ ایک برس تک کمیٹی کی منظوری کے بعد بھی وزیروں امیروں کی سازش کا شکار رہ کر آخر ترانۂ پاکستان فضا پر لہرایا...... انعام کے طور پر حفیظؔ کو نا کام شاعروں اور ان کے صحافی دلالوں نے چھ ماہ تک گالیوں سے گرمایا۔

معجزہ

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

ہر طلوعِ صبح ہے اس معجزے کی یادگار
جو بشکلِ ملکِ پاکستاں ہے عالم آشکار
معجزہ ایمان کا، اِلحاد کے اِس دور میں
میں نے دیکھا اپنی آنکھوں سے اسی لاہور میں
مہرِ عالمتاب سے یا چاند سے تاروں سے پوچھ
یا قریبی مسجدِ شاہی کے میناروں سے پوچھ
آ مقامِ پیرِ ہجویری سے کر کسبِ نگاہ
قلعۂ اورنگ زیب اس معجزے کا ہے گواہ
پوچھ قطب الدین ایبک کی زبانِ حال سے
یا طلب کر یہ حقیقت مرقدِ اقبال سے
ہاں یکے از معجزاتِ رحمتہ للعٰلمیں
معجزہ اِن بخت بیداروں نے دیکھا ہے یہیں

تفرقے کے دشت میں گم کردہ راہ و منتشر
ہم کروڑوں بے وطن تھے سرزمینِ ہند پر

دو بلائیں کر رہی تھیں سعیِ وحدت رائگاں
سایۂ افرنگ اور سرمایۂ ہمسائگاں
پے بہ پے چاروں طرف بے ابتلاؤں کا ہجوم
ہر قدم اک تہلکہ ہر سانس پر بادِ سموم
بت کدوں کی ہاوہو، ناقوس کی چیخوں کا شور
سازش آلودہ نوازِش آزمودہ زر کا زور
مشرق و مغرب کی تقلید اور شیطانی نظام
کر چکے تھے ذہن و فکر و جان و ایماں کو غلام
کام، محتاجی، غلامی، بندگی بے چارگی
ذلتِ ناکارگی میں، لذتِ آوارگی
کون تھا جو دامِ صیادی سے وابستہ نہ تھا
کوئی آزادی کا تھا رستہ، کوئی رستہ نہ تھا
چپ لگی تھی گونگے بہرے تھے ہزیمت خوردہ تھے
چیل کوّے ہم پہ تھے سایہ فگن ہم مردہ تھے

مل گئی کیوں رستگاری گیسوے اصنام سے
ہو گئی وابستگی کیوں غیرتِ اسلام سے

آج کیوں لاکھوں کروڑوں شاد ہیں آباد ہیں
اک وطن کے مالک و مختار ہیں، آزاد ہیں
معجزہ تھی قائدِاعظم کی آوازِ اذاں
سوئے مسجد جس نے کھینچے مرد و زن پیر و جواں
معجزہ مؤمن کے لب پر مصطفیؐ کے نام کا
معجزہ دینِ مبیں کا ' معجزہ اسلام کا
رُوح جسمِ مردگاں میں بھرنے والا معجزہ
کارِ ناممکن کو ممکن کرنے والا معجزہ
فردِ واحد جس کے دل میں نور تھا ایمان کا
کر رہا تھا آج وہ اعلان پاکستان کا
کاش ہم بھی ہوں گل اندر گل بہار اندر بہار
ہو ہماری زندگی اُس معجزے کی یادگار[1]

لاکھوں مسلمان، عوام الناس کا اجتماع، جن میں خال خال انگریز پرست" دوست" خواص الناس منافقین بھی موجود، گلی کوچوں، مکانوں، مسجدوں میں انگریز اور اس کے جلادوں کے ہاتھوں لاہور کی سرزمین پر پکارتا ہوا خاکساروں کا خون..........!
قائدِاعظم محمد علی جناحؒ...... گلشن اقبال...... اُن دِنوں منٹو پارک —— کا چٹیل میدان...... معجزہ...... تسخیر پاکستان کا یہ اعلان۔

---

[1] داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظم قیام پاکستان کے بعد لکھی گئی۔ (مرتب)

نئے دور میں

قائداعظم کے ایماء پر یکم اگست ۱۹۴۷ء میں نظم مکمل ہوئی۔ ۳؍اگست دہلی میں قائداعظم نے لیاقت علی خان اور زاہد حسین کی موجودگی میں سنی، پسند فرمائی۔ ۸؍اگست کو آل انڈیا ریڈیو پر میرے لحن سے ریکارڈ ہوئی۔ ۱۵؍ اگست لاہور ریڈیو اسٹیشن سے قائداعظم کی ریکارڈ شدہ تاریخی تقریر کے بعد فضا میں گونجی۔ اغلباً نوائے وقت میں بھی شائع ہوئی۔

(نئے آئین کی تلقینِ تزئیں)

نئے دور میں، عرش بریں بارانِ کرم برسائے گا
فرشِ زمیں پر چاند ستارے کا پرچم لہرائے گا

زیرِ پرچم پھول کھلیں گے حسن کی رنگا رنگی کے
بچھڑے ہوئے سازوں سے ملیں گے نغمے ہم آہنگی کے

نئے دور میں، فرشِ زمیں پر ایک نیا رنگ آئے گا
دنیا بھر میں امن و اماں انسانیت دکھلائے گا

امن و اماں پابند رہیں گے اک شرطِ بنیادی کے
سینوں میں آئینے ہوں گے آئینِ آزادی کے

نئے دور میں نوعِ بشر کا اصلی جوہر چمکے گا
مٹی میں رُلتا ہوا سونا کندن بن کر دمکے گا

اپنی صورت دیکھنے والا حیرت میں کھو جائے گا
ہر ذرّہ اِک آفتاب ہے یہ ثابت ہو جائے گا

نئے دور میں نشہ اتر جائے گا شخصی قوت کا
بر سرِ بزم عام چلے گا دورِ جام اُخوت کا

قیدِ بشر کی زنجیریں جمہور کے ہاتھوں ٹوٹیں گی
غلبۂ زر کی تقدیریں مزدور کے ہاتھوں پھوٹیں گی

نئے دور میں محنت سرمایہ گردانی جائے گی
مفت خور کی توند نہ عالی پایہ جانی جائے گی

قدرِ ہنر معیارِ نظر ہی سے پہچانی جائے گی
پیسے پر منقوش کوئی بھی رائے نہ مانی جائے گی

نئے دور میں اُجڑے ہوئے گلزار سنوارے جائیں گے
پنجۂ گلچیں دیدۂ بدبیں، سب للکارے جائیں گے

عطر فروشوں کی حسرت پر ہنستی کلیاں مہکیں گی
صیادوں کا خوف نہ ہوگا، اُڑتی چڑیاں چہکیں گی

نئے دور میں پورب پچھّم کرنوں والے اُبھریں گے
اُتر دکھن نئی روشنی نئے اُجالے اُبھریں گے

تاریکی میں ڈوبی ہوئی مخلوق نگاہیں پائے گی
تیز قدم بیداریِ انساں روشن راہیں پائے گی

پوچھنے والے پوچھتے ہیں یہ نیا دور کب آئے گا
میں کہتا ہوں پیارے جب تم لاؤ گے تب آئے گا

اُٹھو صدق و یقیں کے ساتھ بڑھو اصلاحِ حال کرو
نئے دور کا نئے دور کے گھر میں استقبال کرو

نصرتِ پروردگار آ ہی گئی

شملہ-۵ر اگست، قاتلوں سے گھری ہوئی جامع مسجد میں مسلمانوں کا جلسہ مسرتِ آزادی

آسماں سے نصرتِ پروردگار آ ہی گئی
گلشنِ اسلام میں تازہ بہار آ ہی گئی
دستِ ملت میں زمامِ اختیار آ ہی گئی

سبزۂ خوابیدہ جاگا لہلہانے کے لیے
ہو گئیں بیتاب کلیاں مسکرانے کے لیے
زندگی لے کر نسیمِ خوشگوار آ ہی گئی

جاگ اُٹھی راحت تسکیں دلِ بے تاب میں
جوہرِ صبر و قرار آیا رگِ سیماب میں
شمعِ جاں میں روشنی پروانہ وار آ ہی گئی

سینۂ انساں میں جاگ اُٹھا ہے ارمانِ عمل
جلوہ فرما ہو گیا ہے، مہرِ تابانِ عمل
صبحِ نو لے کر موذّن کی پکار آ ہی گئی

آزادی کی اوّلیں عیدالفطر

قاتلوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا۔ شملہ عیدگاہ میں نماز کے بعد قائدِاعظمؒ کی تلقین پر صبر وضبط و امن کی بات حفیظ کہہ رہا تھا:

اے فرزندانِ توحید — تم کو مبارک صبحِ عید!
حاصل ہو گیا پاکستان — آخر بر آئی اُمید
فضلِ خدا لے آیا ہے — آزادی کا روزِ سعید
آزادی کے معنی ہیں — نفس کے اُوپر جبرِ شدید
امن و امان و صلح و صفا — آنحضرتؐ کی ہے تاکید
غیر بھی اپنے بن جائیں — اب وہ دکھاؤ خلقِ حمید
دُنیا بھر میں پھیلاؤ — احکامِ قرآنِ مجید!
منزل تک پہنچائے گی — اللہ والوں کی تقلید
جو مظلوم کا یاور ہو — وہ ہے غازی اور شہید
مایوسی کی دُنیا میں — بن جاؤ صبحِ اُمید!

تم کو مبارک صبحِ عید
اے فرزندانِ توحید!

زِندہ باد پاکستان

ترانہ جو پہلی فرمائش پر دُھن سمیت پیش کیا گیا۔ کمیٹی منظور کر رہی تھی مگر ریڈیو سربراہ نے کہا "کچھ اور بڑے شاعر بھی لکھنا چاہتے ہیں"

اے میرے آباد وطن آزاد پاکستان

زندہ باد پاکستان!

تیرے سمندر، تیرے دریا، کہسار و میدان
سلطنت و سامان خدائے پاک کا ہے احسان
تو ہے پاک امانت جس پر زندگیاں قربان
تجھ پہ نچھاور مال، جان، اولاد پاکستان
زندہ باد پاکستان

چاند ستارا تیرا پرچم "رحمت بار" نشان
اس پرچم کا سایہ ہم پر لایا امن امان!
خلقِ خدا کا فرد فرد ہے شاد پاکستان
زندہ باد پاکستان

عدل مساوات اور اُخوت، قوت ہے ایمان
مشرق مغرب دیدہ و دِل ہیں دونوں ہیں ذیشان
عام رواداری پر قائم جمہوری ایوان!
کلمۂ طیب استوار بنیادِ پاکستان
زندہ باد پاکستان

خطبۂ صدارت

اہل قلم سے پاکستان بنتے وقت اوّلیں خطاب

اس بزم کی بخشی گئی مجھ کو جو صدارت
نوخیز جوانوں کی ہے اک طرفہ شرارت
ہیں اس کے یہ معنی کہ نہیں مجھ میں حرارت
کرسی پہ بٹھایا ہے مجھے بہر زِیارت
یعنی میری خدمات کا انعام ملا ہے
بیٹھا رہوں، دیکھا کروں یہ کام ملا ہے

حالانکہ ابھی میں بھی جواں ہوں مرا دل بھی
لیلائے ترقی کا ہے مجنوں مرا دل بھی
ہر فتنۂ تازہ کا ہے مفتوں مرا دل بھی
ہر حادثۂ نو سے ہے پرخوں مرا دل بھی

پھر میری جوانی پہ نہیں آج یقیں کیوں
یاروں نے بنایا ہے مجھے صدر نشیں کیوں

کچھ آپ سے بہتر تو بہرحال نہیں میں
رُومی نہیں ، سعدی نہیں ، اِقبال نہیں میں
ہے مجھ پہ یہ تہمت کہ جواں سال نہیں میں
تاہم ابھی فرتوت نہیں زال نہیں میں

کرسی جو رفیقوں سے جدا مجھ کو ملی ہے
کس جرم کی آخر یہ سزا مجھ کو ملی ہے

ہاں جبرِ محبت کی ہے لازم مجھے تعظیم
احباب کے ارشاد پہ خم ہے سرِ تسلیم
جس دن سے ہوئی ہاتھ سے بندر کے یہ تقسیم
شمشیر کے ہاتھوں دلِ ہر فرد ہے دو نیم

ہے کون سی وہ قدر جو محفوظ رہی ہے
ترتیبِ مراتب کے ملحوظ رہی ہے

اے اہلِ قلم رنگِ جہاں دیکھ رہے ہو
یہ خون کا سیلابِ رواں دیکھ رہے ہو
ہے خاکِ وطن شعلہ فشاں دیکھ رہے ہو
افلاک پہ آہوں کا دُھواں دیکھ رہے ہو

یہ زہر سیاست ہے کہ ہے قہرِ الٰہی
اے اہلِ قلم دیکھ رہے ہو یہ تباہی

جس نور کو اجسام میں ڈھالا تھا خدا نے
وہ حور جسے گود میں پالا تھا حیا نے
جس حسن کے شاعر کی زباں پر تھے ترانے
جو شکل سجھاتی تھی ادیبوں کو فسانے

آج اس کا برا حال ہے تم دیکھ رہے ہو
راہوں میں وہ پامال ہے تم دیکھ رہے ہو

یہ قافلہ در قافلہ اُجڑے ہوئے دہقاں
سب خستہ و درماندہ و بدحال و پریشاں
کل تک یہ زمیندار تھے باحوصلہ انساں
ریوڑ کی طرح آج ہیں ہانکے ہوئے حیواں

ننگے بھی ہیں بھوکے بھی ہیں چارا بھی نہیں ہے
جینا بھی ہے جینے کا سہارا بھی نہیں ہے

برچھوں پہ چڑھائے ہوئے اجسام کے پرچم
ہر سینہ پہ دوشیزۂ معصومہ کا سرخم
اس جسمِ برہنہ پہ بھی ہر دخترِ آدم
آتی ہے نظر اوڑھے ہوئے چادرِ مریمؑ

خاموش نگاہوں کی حیا دیکھ رہے ہو
کاٹے ہوئے ہاتھوں کی دعا دیکھ رہے ہو

تم دیکھ رہے ہو کہ وہ اطفال تمھارے
تھے لختِ جگر نورِ نظر جان سے پیارے
وہ پھول وہ کلیاں وہی چاند اور ستارے
تھی کشتیِ اُمید رواں جن کے سہارے

جمہوت نے ان سب کو نئے گھاٹ اتارا
سنگِ لبِ ساحل سے پٹخ کر اُنہیں مارا

جاگا ہے نئے رنگ سے یہ فتنۂ شمشیر
اب پُرسشِ فن ہے نہ قلم کی کوئی توقیر
کوئی نہیں آزاد ، نہ تحریر ، نہ تقریر
کیوں اہلِ قلم تم کو گوارا ہے یہ تحقیر

شمشیر صحافت کا گلا کاٹ رہی ہے
شعر و ادب و فن کا لہو چاٹ رہی ہے

انسان کو انسان بنایا تھا قلم نے
تہذیب کا ملبوس پنھایا تھا قلم نے
شمشیر نے کھویا جسے پایا تھا قلم نے
فردوس وہ اُجڑا جو بسایا تھا قلم نے

چولھوں میں جلایا گیا سرمایہ قلم کا
غائب ہوا بن بن کے دُھواں سایہ قلم کا

سب دیکھ رہے ہو یہ سیاست کا تماشا
افرنگ کی ملعون فراست کا تماشا
اک سمت یہ رشوت میں نفاست کا تماشا
اک سمت ہے قانونِ حراست کا تماشا

چپ سادھے ہو تم اہلِ قلم دیکھ رہے ہو
کیا تم بھی یہی راہِ عدم دیکھ رہے ہو

اس طرزِ گزارش کی ملے مجھ کو معافی
تم سب ہو سخن سنج ، ادیب اور صحافی
اے اہل قلم دیکھتے رہنا نہیں کافی
یارو کوئی تجویز کرو نسخۂ شافی

ورنہ مجھے ڈر ہے یہ مرض اور بڑھے گا
یہ خون کا دریائے جنوں اور چڑھے گا

اے اہل قلم ہوش میں آنا ہی پڑے گا
ہاں فرض کا یہ قرض چکانا ہی پڑے گا
زورِ قلم آخر تو دکھانا ہی پڑے گا
شمشیر پرستوں کو دبانا ہی پڑے گا

شمشیر ہے سب اہلِ قلم کے لیے دھمکی
ہم اِس سے نپٹ لیں گے قسم لوح و قلم کی

نشاط زدگان

اِن کی آنکھیں ابھی کھلی ہی نہیں
دل کی آلائشیں دُھلی ہی نہیں

حق و ناحق یہ جانتے ہی نہیں!
یہ خدا کو تو مانتے ہی نہیں!

زیست کیا ہے اِنہیں خبر ہی نہیں
یہ شرارت بھی ہیں شرر ہی نہیں

ناچ جس جس کی بھی ثقافت ہے
کوئی ہو ، دُشمنِ شرافت ہے

روزِ روشن رات کے آغوش میں!

رحلتِ قائداعظمؒ

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء......روزِ سیاہ

اُس کی نگاہ ابر شکن برق پاش تھی سیلاب اشک وآہ میں ساحل تراش تھی
کشتی میں تھا وہ عزم کا دریا لیے ہوئے

موجیں اٹھیں، لپک کے بڑھی فوجِ صد نہنگ وہ دشمنانِ دیں سے لڑا جنگ بے درنگ
اِدراک بے پناہ کا حربا لئے ہوئے

کشتی کو ڈوبنے سے بچاتا ہوا بڑھا ہم سب کے حوصلوں کو بڑھاتا ہوا بڑھا
بڑھتا گیا تعاقبِ اعدا لیے ہوئے

طوفانِ برق وباد کا منہ توڑتا ہوا تختے اُکھڑ چکے تھے اُنھیں جوڑتا ہوا
نکلا بھنور سے قوم کا بیڑا لیے ہوئے

کشتی پہنچ رہی تھی سرِ ساحلِ مراد ہم "داد" دے رہے اُسے کہہ کے زندہ باد
نعروں میں شورِ حوصلہ افزا لیے ہوئے

وہ جانتا تھا ہم میں بہت سے ہیں کام چور اُسکی نگاہ میں تھا ہماری زباں کا زور
وہ دل میں تھا حساب ہمارا لیے ہوئے

وہ ناخدا تھا قائدِ اعظم بھی تھا وہی　　قومِ شکستہ حال کا محرم بھی تھا وہی
آیا تھا بیکسی کا مداوا لیے ہوئے

اُمت کے درد و غم کا مداوا جہاد تھا　　ہم نے بھلا دیا تھا جسے اُسکو یاد تھا
جامِ شفا تھا دستِ مسیحا لیے ہوئے

اس ناخدا کو دستِ خدا نے اُٹھا لیا　　غازی کو بڑھ کے سایۂ رحمت نے چھالیا
رُخصت ہوا شہید کا رتبہ لیے ہوئے

تیرہ شبی میں دے کے ہمیں جلوۂ صباح　　ہے عرش پر حفیظ محمد علی جناح
دنیا سے کامیابیِ عقبیٰ لیے ہوئے

ہم کو نظر بھی درسِ صداقت بھی دے گیا　　پائے طلب بھی دستِ لیاقت بھی دے گیا
ہم ہیں اُسی کے عزم کا ورثہ لیے ہوئے

تھا اتحاد و ضبط و ارادت کا رہنما　　اس دشتِ کربلا میں شہادت کا رہنما
مظلومیِ حسین کا دعویٰ لیے ہوئے

اب ہم ہیں اور ساحلِ مقصود سامنے　　میدان بھی جہاد بھی موجود سامنے
آؤ بڑھیں خدا کا سہارا لیے ہوئے

آؤ بڑھیں خدا کے سہارے پہ مطمئن　　تلقینِ مصطفیٰ کے اشارے پہ مطمئن
ذوقِ جمالِ گنبدِ خضریٰ لیے ہوئے

آؤ خدا کا نام لیں خود ناخدا بنیں　　راہِ بقائے نو کے لیے رہنما بنیں
مردانہ زندگی کی تمنا لیے ہوئے

آب ساحلِ مراد سے پہلے نہیں پناہ
سیلابِ سرخ اُمڈا ہے اور آندھیاں سیاہ
دامن میں صد قیامتِ کبریٰ لیے ہوئے

آؤ دکھائیں بازوئے اسلام ہے قوی
ضربِ قوی ہے قائداعظم کی پیروی
ضربِ قوی مقاصدِ اعلیٰ لیے ہوئے

۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء

مِــنْ رِّبَـاطِ الْـخَـيْـلِ

اگر اللہ پر ہم واقعی ایمان رکھتے ہیں
اگر یہ بھی صداقت ہے کہ ہم قرآن رکھتے ہیں

تو حکم مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ کی تعمیل لازم ہے
فنونِ جنگ کی سامان کی تکمیل لازم ہے

اگر رہوار ہوں تیار ملی جاں نثاروں کے
ارادے پست ہو جائیں گے دشمن کینہ کاروں کے!

اگر ہم نے پیا ہے دُودھ غیرت مند ماؤں کا
تو لازم ہم پہ دفعیہ ہے ان کالی بلاؤں کا

رسولِ پاک میداں میں ہماری لاج رکھیں گے
دو عالم میں ظفر مندوں کے سر پہ تاج رکھیں گے

(خطاب کیڈٹ کالج کاکول۔ ۱۹۴۸ء)

ہاں یہ سب کچھ ہے مگر ہائے ہماری غفلت
اسکو چھوڑا نہیں جاتا کہ یہ "محبوبہ" ہے

دو گھڑی غلبۂ اغیار ہوا تھا ہم پر
بتکدے والوں کے ظلم اہلِ حرم بھول گئے
جان کیا چیز ہے ناموس پہ جو بیت گئی
کس قدر جلد یہ بیتی ہوئی ہم بھول گئے

مطمئن ہیں کہ ہماری نہیں باری آئی
جاگنا حشر سے پہلے نہیں منظور ہمیں
حیدرآباد کہاں اور کہاں پاکستان
یہ قیامت نظر آتی ہے ابھی دور ہمیں

جزیرے

بعدِ غروبِ آفتابِ پاکستان...... فرزندانِ شب، عہدے، مرتبے، اپنا اپنا گھر بھر لینے کی دوڑ، افسروں کی رنگ رلیاں، لیڈروں کی مدح کا اوج، کشتیِ پاکستان داخلی و خارجی طوفان میں، یہ نظم، ہر مقام پر ایک پکار...... (۱۹۴۸ء)

قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا
مطمئن ہیں قافلہ سالار اپنے کام سے
عہدہ و منصب کی بازی جیت کر گھڑ دوڑ میں
تھان پر ہیں درشنی گھوڑے بڑے آرام سے

قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

رہنماؤں کو سجا کر منزلِ مقصود پر
ٹھوکریں کھاتا ہے تاریکی میں اُمت کا جلوس
جن بہشتی مقبروں پر ہو گئے روشن چراغ
ملتِ بیضا یہی تھے چند گنتی کے نفوس

قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

چند تقریروں بیانوں اور تصویروں کے ساتھ
عیش و عشرت ہے بپا ہر قصر ہر ایوان میں
رتبۂ عالی پہ ناچیں کیوں نہ ایسے مومنین
آچکا ہے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ جن کی شان میں

قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

کیوں گروہِ عام کی ذلت کا غم کھائیں خواص
جن کو اس ذلت میں لذت کے ذخیرے مل گئے
کشتیاں گرداب میں چھوڑو خدا حافظ کہو
ناخداؤ خوش رہو تم کو جزیرے مل گئے

قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

میں نومبر ۴۸ء میں افواجِ پاکستان میں مبلغ شجاعتِ اسلامی متعین ہوا تھا۔ دسمبر میں یہ نظم۔ سکندر مرزا نے سول افسروں کے پچاس دستخطوں سے لیاقت علی خاں کے سامنے مجھے مجرم بتایا۔ مجھے بلایا گیا۔ سکندر مرزا موجود تھا۔ میں نے سول افسروں کے چہروں کا نقاب اٹھایا، لیاقت علی خاں نے میری تائید کرتے ہوئے سکندر مرزا سے کہا ہاں اسلامی نظم کو حفیظ درکار ہے۔ سچ نہ کہے تو احساس کیسے ہو۔ سول افسر عدالت میں جا سکتے ہیں۔

فرعونِ بے ساماں

میں ہوں یا آپ بھی؟

یہ صورت ہے کہ اک دریائے بے پایاں ہے اور میں ہوں
ہوائے تند ہے، سیلاب ہے، طوفاں ہے اور میں ہوں
طلب کے ہاتھ ہیں، ہر موج کا داماں ہے اور میں ہوں

بہا جاتا ہوں، بے بس ہوں، سہارا بھی نہیں کوئی
قریب و دور کشتی بھی، کنارا بھی نہیں کوئی
مگر حسرت ہے اور میں ہوں، مگر ارماں ہے اور میں ہوں

تلاطم میں ہوں اک تنکا، کبھی اُبھرا کبھی ڈوبا
یہی محسوس ہوتا ہے، ابھی ڈوبا ابھی ڈوبا
مگر خود رائیِ فرعونِ بے ساماں ہے اور میں ہوں

بھتنوں کا ثقافتی ناچ

(تخریب عام)

بستیوں کے وہی سبھی در و بام مستیاں پستیاں خواص و عوام
زلزلے آگ آندھیاں سیلاب لائے تشریف، چل دیئے ناکام
اب کے امید تھی مگر نہ ہوا کارگر تازیانۂ ایام
عارضی سی شکست و ریخت کے بعد چل رہا ہے وہی قدیم نظام
شجر و شاخ ہے کہ برگ و ثمر اپنے معمول پر ہیں پختہ و خام
وہی گفتار ہے وہی کردار وہی تذلیل ہے وہی اکرام
بعد تخریب پھر وہی تعمیر خودکشی کی طرف نیا اقدام
شور و ہنگامہ نفسی نفسی کا ہے ثبوتِ اُخوت اسلام

یہ ہمارا معاشرہ یہ نظام کیا اسی شے کا ہے ترقی نام
دسترس ہو تو سب حلال حلال جس پہ قابو نہیں حرام حرام
فرش کو عرش کی نہیں پروا پستیاں ہیں بہت بلند مقام
گھٹ گئی ہے تسلیِ محکوم بڑھ گئی ہے تعلیِ حکام
زندہ و مردہ باد کے نعرے وہی جوشِ جنوں وہی سرسام

ہاں ادب کی ترقیِ معکوس ۔۔۔ اِک ذرا ہو گئی ہے تیز خرام
جلوتِ حسن فنِ شعر و سخن ۔۔۔ اب نہ خلوت میں ہے نہ برسرِ عام
موت وارد ہے جب سے قبر فروش ۔۔۔ بن کے بیٹھے ہیں ناقدانِ کرام
علمِ شے پر ہے جہلِ شے غالب ۔۔۔ ہر اناڑی ہے اپنے فن کا امام
اب نہیں ربط' لفظ و معنی میں ۔۔۔ خبط سمجھا گیا وہ حسنِ کلام
ہائے رے فوقِ بد مذاقیِ خاص ۔۔۔ وائے ۔ ذوقِ عوام کالانعام
اب لطافت ہے قہقہوں کی ہدف ۔۔۔ اب کثافت کا ہے ثقافت نام
اب تھرکنے سے داد ملتی ہے ۔۔۔ اب نچنیئے ہیں واجب الاکرام
اب مدارس میں رقص کی تعلیم ۔۔۔ بن رہی ہے روایتِ اسلام
خامیاں پختہ ہوتی جاتی ہیں ۔۔۔ دیرپا بنتے جاتے ہیں اسقام
صورتوں پر جما لیے ہیں رنگ ۔۔۔ سیرتوں کا سڑا بسا ہے قوام
یہ فقط اہلِ زر کی بات نہیں ۔۔۔ طبقۂ مقتدر کی بات نہیں
کیا یہ ہم سب بحال وحد و مقام ۔۔۔ سب کے سب نفس کے نہیں ہیں غلام
اہلِ سرمایہ اور یہ مزدور ۔۔۔ کیا نہیں سب کی نیتوں میں فتور
یہ زمیندار اور یہ دہقان ۔۔۔ کس کو ہے ایک دوسرے سے امان
یہ تجارت کی گرمئی بازار ۔۔۔ وقنا ربنا عذاب النّار
یہ ہوا و ہوس یہ جھوٹ فریب ۔۔۔ بالارادہ ہے یا کوئی آسیب
کیا یہ مختار کیا یہی کردار ۔۔۔ دارالاسلام کے ہیں لیل و نہار

بے تکلف دروغ کو ہے فروغ   کون ہے، کس کو دے کوئی الزام
دوستانِ قدیم ، عہدِ جدید   ہے شرافت کو موت کا پیغام
ساری دنیا میں رُت ہے پت جھڑ کی   اس ہوا میں نہیں حیا کا مقام
اپنی قبروں پہ رقص لاشوں کا   متصور ہے اب حیاتِ دوام
دوستی کے چراغ ہو گئے گل   کر رہی ہیں ہوائیں کام تمام
ایک آغازِ نو کا وقت آیا
دوستو اب قریب ہے انجام

مرگِ تاثیرِ کلام

مرگِ تاثیر دے چکی ہے پیام
ہے خموشی ہی انتہائے کلام
میں ہوں اب تک اسیرِ دانہ و دام
جو رہا ہو چکے ہیں اُن کو سلام

نگہِ واپسیں ہے خون آلود
آفتاب آ چکا ہے برلبِ بام

لیجیے میں چلا خدا حافظ
شاد باد اے ہجومِ خاص و عوام

تکمیلِ نظم: ۱۹۷۳ء

گفتار و کردار

ہم نے کہا: ——————!

یہ کون کہہ رہا ہے فرنگی ہیں کامیاب
کوئی بھی خوش نہیں ہے زبانی صفات پر
کچھ شک نہیں کہ رات بھی ہوتی ہے دلفریب
غالب کیا خدا نے مگر دن کو رات پر
تاروں کی محفلوں کا سماں خوب ہے مگر
رونق ہے مہر ہی سے رُخِ کائنات پر
گزرے ہوؤں کی یاد سے دلبستگی درست
سکہ حیات ہی کا رواں ہے ممات پر
مغرب کا چاند ماند ہوا، صبح ہو گئی
مشرق ہے محوِ جلوہ گری شش جہات پر

ہم نے کیا: ——————!

اعدائے داخلی کے ہیں ''احسان'' حادثات
دنیائے خارجی لگی بیٹھی ہے گھات پر

ہر بو الہوس ہے مستِ مئے نابِ اقتدار
میلا یزیدیوں کا لگا ہے فرات پر
بعدِ وفاتِ قائدِاعظم یہ ''صاحبی''
انگریزیت کا بھوت سرِ باقیات پر
یہ تفرقے یہ کشمکشیں ذاتیات کی
کیڑوں کا ناچ بربطِ ''افرنگیات'' پر
اس کربلا میں مقصدِ ملت شہید ہے
رقصاں ہے آج ہر شمر اپنی صفات پر
''غزنیں'' کو پھاند پھاند اُبھرتے ہیں بت پرست!
چڑھتی ہے بھینٹ بت شکنی، سومنات پر
کس کو سنائیں حالِ وطن اے خدائے پاک
اُمید کا مدار ہے تیری ہی ذات پر

بے اثر ابوالاثر

سروشِ غیب ہے، یا تجھ پہ ہے خدا کی مار

نہ عقل کا تجھے سودا نہ عشق کا آزار
حفیظؔ کیوں نظر آتا ہے تو نحیف و نزار

اُبلتے کیوں ہیں یہ آنکھوں سے گرم گرم آنسو
لرز رہا ہے بدن جیسے آ رہا ہو بخار

جمی ہیں کیوں ترے ہونٹوں پر سرد سرد آہیں
یہ زرد زرد سا چہرہ جنوں کے ہیں آثار

تو آسمان کو تکتا ہے کیوں لجاجت سے
ترے دہن پہ ہے کیوں ہائے ہائے کی تکرار

شراب کا نہیں رسیا ، قمار باز نہیں
سمجھتے ہیں تجھے کیوں اہلِ شہر بداطوار

ترے چلن سے تھے مایوس والدین ترے
تیرے عزیز تری شکل ہی سے تھے بیزار

یہ قافیے یہ ردیفیں ، گھڑنت اور پڑھنت
ملے نہ جن کے عوض تجھ کو دو ٹکے بھی اُدھار

اُدھیڑ بُن یہ خیالی ، مقالِ بدحالی
خزاں رسیدہ چمن میں بہار کے اشعار

یہ جوڑ توڑ ، یہ لفظوں کے مول تول ، یہ بول
یہ سرد مہریِ یاراں میں گرمیٔ گفتار

ترا شباب ہے تاشیب اک مسلسل عیب
سروشِ غیب ہے یا تجھ پہ ہے خدا کی مار

یہ جن کے واسطے لب پر ہے تیرے نعرۂ حق
چڑھائیں گے یہی منصور تجھ کو برِ سر دار

وہ دیکھ تیری تہتر برس کی راہوں کا
ہے محتسب ملک الموت قافلہ سالار

کیا ہوں میں!

یہ خیالاتِ عظیم اے مرے ربِّ کریم!
درمیانِ قعرِ دریا اک یتیم
ایک تنہا درد ہوں یا ایک اشک گرم ہوں
یا ایک آہِ سرد ہوں
خونِ انسانی کے ایسے قلزمِ ذخار میں
تہلکوں میں، زلزلوں میں صاعقوں میں
کوئی بھی سنتا نہیں
میری نوائے بے نوا
اے میرے ربِّ کریم کیا ہے یہ اُمید و بیم
اے خدا...... کیا ہوں میں...... تو ہی بتا

اِرشادِ ہمزاد

یہ بزم آرا تبسم

ترے سینے میں دل بھی ہے ترے لب پر سخن بھی ہے
نشاطِ شب میں روشن تو ہی شمعِ انجمن بھی ہے
خوشی کی اِس ستائش میں نمائش کا ہے غم تجھ کو
دکھائی دے رہا ہے جام میں انجامِ جم تجھ کو

یہ بزم آرا تبسم جو ترے چہرے پہ طاری ہے
اسے میں جانتا ہوں ، یہ تبسم اختیاری ہے
مجھے معلوم ہے اس پردۂ تصویر کے پیچھے
وہی صورت ہے جس کا نام نقشِ سوگواری ہے

یہی صورت ہوا کرتی ہے اکثر باکمالوں کی
رسائی عرش تک ہے جن کے پاکیزہ خیالوں کی
یہ دنیا کو دیا کرتے ہیں تحفے شادمانی کے
مگر دنیا انھیں دیتی ہے سوغاتیں ملالوں کی

انھیں محفل میں دیکھو کس قدر مسرور ہوتے ہیں
جہاں بھر میں ظرافت کے لیے مشہور ہوتے ہیں
کبھی فرصت ملے تو ان سے خلوت میں بھی مل لینا
بہت غمدیدہ ہوتے ہیں، بہت رنجور ہوتے ہیں

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
یہ بلبل پھول کی رنگینیِ ظاہر پہ مرتی ہے
کبھی پوچھو خدارا اے چمن کے روندنے والو
کہ جانِ سینہ چاکانِ چمن پر کیا گزرتی ہے

آفت زدہ ہوں

میں کہ اب در بہ درِ مکدہ و میکدہ ہوں
خانقاہوں کا ستایا ہوا آفت زدہ ہوں
ہوں تو اِک تیرے ہی فرمودۂ کن کا مظہر
خوب یا زشت ہوں آوردہ ہوں یا آمدہ ہوں

سبز گنبد سے اِک صدا آئی

ادائے فرض کے لیے
قدم اُٹھا کے چل
ادائے فرض زندگی ہے اہلِ اَرض کے لیے
خدا کا نام لے کے چل ادائے فرض کے لیے
ادائے فرض کے لیے
قدم اُٹھا کے چل
ہر ایک بندۂ خدا جو دَرد میں ہے مبتلا
کوئی بھی ہو کہیں بھی ہو بن اُسکے درد کی دوا
بن اس کے درد کی دوا
قدم اُٹھا کے چل
اِرادہ تیرا نیک اور پاک ہے ترا چلن
خدا کی راہ میں ہے تو برائے خلق گامزن
برائے خلق گامزن
قدم اُٹھا کے چل

حیاتِ دوجہاں کی راہ پر رواں ہے قافلہ
تو قافلے کے ساتھ رہ اسی میں ہے تری بقا
اسی میں ہے تری بقا
قدم ملا کے چل
جو ساتھ ساتھ چل رہے ہیں تیرے ہم طریق ہیں
جدا نہ ان سے رکھ قدم یہی ترے رفیق ہیں
یہی ترے رفیق ہیں
قدم ملا کے چل
تو عقل مند ، بااصول و مستقل مزاج ہے
تجھے ہے پاس قوم کا وطن کی تجھ کو لاج ہے
وطن کی تجھ کو لاج ہے
قدم ملا کے چل
ادائے فرض کے لیے
قدم اُٹھا کے چل ، قدم ملا کے چل

سبز گنبد کا مکیںؐ

سبز گنبد فرش پر ہے پرتوِ عرشِ بریں
ورنہ تابِ یک نظر موسیٰؑ بھی لا سکتے نہیں

خوابِ راحت میں نہیں ہے سبز گنبد کا مکیں
چارسازِ ہر زماں ہے رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ

اے وجدان

تجھ کو حسنِ خیال میں پایا جستجو نے کمال میں پایا
درد مندانہ آہ میں دیکھا مخلصانہ نگاہ میں دیکھا
حسن کاری کی فکر میں بھی تو ذاتِ باری کے ذکر میں بھی تو
دینِ حق کے حصول میں تو ہے اتباعِ رسولؐ میں تو ہے
تو کوئی نشہ ہے نہ مے وجدان بربط جاں کی تو ہے لے وجدان
نغمہ و نالہ و سرود و فغاں ہے تو ہی جس سے وجد میں ہے جہاں
سوز و ساز و گداز و فہم و شعور تیری آواز سے ہے سب کا ظہور
میرے قلب و نظر کی آزادی کچھ نہیں تو نہ ہو جو امدادی

تو مری جان ، تو مرا ایمان!
ساتھ میرا نہ چھوڑ اے وجدان

اے خدا اِک سوال ہے میرا کون پرسانِ حال ہے میرا؟
کس مپرسی کی مسکراہٹ دیکھ میرے لب پر ملال ہے میرا

ملک الشعراء گرامی نے کس وجود کے بارے میں فرمایا......؟

پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

جس کی یہ تصویر ہے......!

وہ مفکر جس کی یہ تصویر ہے ...... اقبال ہے
جس کا نطق اسلام کی تفسیر ہے...... اقبال ہے
صبح جس کے خواب کی تعبیر ہے...... اقبال ہے
روحِ ملت جس سے پُر تنویر ہے...... اقبال ہے
قوم کیسے جاگ اٹھی اس راز میں...... اقبال ہے
قم باذن اللہ کی آواز میں ...... اقبال ہے
نغمہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰه کا سرور
بہرِ ہر مہجور ہے جس ساز میں ...... اقبال ہے
عاشقِ صادق رسول اللہ کا ...... اقبال ہے
پیکرِ پرسوز اشک و آہ کا ...... اقبال ہے
طالبِ حق پر ہے لازم اتباعِ مصطفیٰ
آج مخبر اس نشانِ راہ کا ...... اقبال ہے
ذہنِ انسانی پہ قرآنی اثر اقبال ہے
باعث ہم رنگیِ قلب و نظر ...... اقبال ہے
رحمۃ للعلمین کے فیضِ نسبت سے حفیظ میں بھی ہوں راہی مرا بھی راہبر...... اقبال ہے

جواں اقبالوں کا اقبال

قیادت کا تمنائی نہ شیدائی تھا مسند کا
مرا اقبال آئینہ تھا آئینِ محمدؐ کا
تم اس کو فلسفے کی موشگافی میں نہ الجھاؤ
وہ سیدھی راہ پر تھا، تم بھی سیدھی راہ پر آؤ
تجدد کی تعلی تھی نہ دعوئ مہدویت کا
مبلغ تھا نظامِ احترامِ آدمیت کا
ابھی اندازہ ہو سکتا نہیں اس کی بلندی کا
ابھی ملت کی آنکھوں پر ہے پردہ فرقہ بندی کا
مگر میرے تصور میں ہیں چہرے اُن جوانوں کے
جنھیں اقبال نے بخشے ہیں بازو قہرمانوں کے
بڑھیں گے یہ جوان اقبال کے پیغام کو لے کر
تو شرق و غرب پر چھا جائیں گے اسلام کو لے کر
نئی تاریخ لکھی جائے گی دنیائے ہستی کی
ہوا ہو جائے گی آلودگی پیکر پرستی کی

حمید نظامی

نوائے وقت کا بانی جس نے اسلامیہ کالج لاہور کی طالب علمی کے زمانے سے اسلام اور پاکستان کے لیے جان و ایمان کی بازی لگا دی تھی۔ اس نے بطورِ نقیب قائداعظمؒ کا ساتھ دیا، جس کا نتیجہ پاکستان اور وہ رُوح ہے جو ہر ایماندار مسلمان کے تن میں رواں دواں ہے۔

یہ جس کی یاد میں برپا ہے بزمِ رنج و الم
جسد تھا اس کا جسے قبر میں رکھ آئے تھے ہم
مجھے خدا کی قسم مجھ کو مصطفیٰؐ کی قسم
یہ فرد زِندہ ہے مانندِ قائداعظم
عظیم رُوح نہیں زیرِ قالبِ خاکی
قلوب پر ہے محیط اَب یہ نورِ افلاکی
حمید مردِ مجاہد ...... حمید فردِ فرید
حمید تیرہ شبی میں نویدِ صبحِ اُمید
حمید صدق و صفا کا مبلغِ توحید
حمید معرکۂ کربلا کا تازہ شہید
شہید مر نہیں جاتے یہ نصِ قرآں ہے
حمید زندہ ہے پائندہ ہے درخشاں ہے

حفیظ دیکھ رہا ہوں یہ کیا میں آئنہ وار
ہر اِک محاذ پہ موجود ہے یہ شاہسوار
جہاں بھی قلب ونظر پر ہے جور کی یلغار
حمید اس کے مقابل ہے برسرِ پیکار
جہاں بھی نظمِ عوامی کو دیکھتا ہوں میں
وہیں حمید نظامی کو دیکھتا ہوں میں

نوائے وقت

ستم فروش ہیں دن، قہر کوش ہیں راتیں　　دکھا رہی ہے پراگندگی کراماتیں!
حمید ہی سے تصور کی ہیں ملاقاتیں　　حفیظ کون سنے تیرے درد کی باتیں

شکست و بست و سرافرازی و نگوں ساری!
نوائے وقت سے ہے چشم و قلب پر جاری

دکھا رہا ہے رفیقوں کو راہِ کوئے حبیب　　حمید قائداعظمؒ کی پیروی کا نقیب
سعادت ابدی ہو چکی ہے اس کو نصیب　　حمید اہل بصارت سے ہر زماں ہے قریب

اندھیری شب میں جھلکتا ہوا ستاروں سے
دکھا رہا ہے طلوعِ سحر اشاروں سے

قریبِ نیرِ اقبال ہے وہ ضوافشاں　　رقیب جس کو سمجھتے ہیں زیرِ خاکِ نہاں
اسی کا لہجہ اسی کی روش اسی کا بیاں　　نوائے وقت ہے صبحِ اُمید اس کی اذاں

بلاغِ گفتۂ اقبالِ دلنشیں ہمہ اوست
بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اے کفر ترا غاشیہ بردوش نہیں میں
اِسلام کا اِحسان فراموش نہیں میں
قرآن نے بخشی ہے مجھے روشنیِ جاں
شب زاد اندھیرے کا سیہ پوش نہیں میں!
ہے نعرۂ تکبیر خروشاں مرے لب پر
گوسالہ پرستو، بتِ خاموش نہیں میں
آوازِ سگاں سن کے نہاں ہو نہیں سکتا
اک شیرِ کہن سال ہوں خرگوش نہیں میں
شیدائے زرِ سرخ نہ مے خوارِ سیہ کار
مے نوش نہیں فیض نہیں جوش نہیں میں

تیرے لیے لے پاکستان

منتخب اہل قلم انشا پردازوں، صحافیوں اور شاعروں کی جماعت تبلیغ مقاصد پاکستان کی مہم پر ہوائی جہاز میں پرواز کر رہی تھی۔ کوہ سینا سے جہاز گزر گیا۔ وادیٔ مصر میں نیل کنارے ایک مقناطیسی ابلیسی ٹیلے نے اسے کھینچا اور اس جہنم زار سے وہ سب بہشت میں داخل ہوئے۔

تیرے کتنے فرزندوں نے
کر دیں زندگیاں قربان
...... تیرے لیے ......

دانش ور ، دانا ، فرزانے — ارضِ پاک ترے دیوانے
نکلے سورج چاند ستارے — تیری روشنیاں پھیلانے
عالی ظرف جو ان کو پایا — سر پہ اُٹھایا موجِ صبا نے
تختِ رواں پر بخت جواں تھے — ایسے کب دیکھے تھے فضا نے
طورِ سینا پر سے گزرے — آہِ سرد بھری موسیٰ نے
ریگِ نیل تھی منتظر اُن کی — دام چھپا رکھا تھا قضا نے
برقِ تجلی دیکھ رہی تھی — کیسے جلتے ہیں پروانے

راہِ وفا میں پاکستانی
یوں چڑھ جاتے ہیں پروان
...... تیرے لیے ......

تیرے لیے اے پاکستان

اہلِ قلم تھے صاحبِ فن تھے
روشنیِ سیمائے وطن تھے
ذکر و فکر کی رنگینی سے
باغ و بہارِ بزمِ سخن تھے
ابرِ کرم تھے کشتِ حق پر
برسرِ باطل برق اُفگن تھے
نامی گرامی تیرے پیامی
اَنوارِ صبحِ روشن تھے
گھرے گئے تھے گلشن گلشن
قاہرہ میں گلخن گلخن تھے
کون بتائے پھول ہمارے
کیوں اس بھٹی کے ایندھن تھے

آگ کے دریا میں جا ڈوبے
نیل کنارے سوختہ جان
تیرے لیے، اے پاکستان
...... تیرے لیے ......

ہے کوئی ؟

آج کس کے ہاتھ میں ہے ملک وملت کا نظام
قبلہ واحد ہے تو کیوں لاکھوں ہزاروں ہیں امام؟

مشرق ومغرب کی وحدت کا نمائندہ ہے کون
برسرِ بامِ سحر خورشیدِ تابندہ ہے کون؟

تفرقے کے دشت میں سرگشتہ ہے کیوں کارواں
کیوں نہیں اک بھی جھلک ایمان کے شایانِ شاں؟

منزلِ مقصود کیا ہے؟ کیوں ہیں اتنے راہبر
ہانکتے ہیں کیوں جتھوں کو اپنی اپنی راہ پر

اس فسادِ داخلی میں کون ہیں یہ محوِ شر؟
ہے کوئی جس کی غنیم خارجی پر ہو نظر

وفاتِ شیخ سر عبدالقادرؒ......!

جن چند بزرگوں کو دوسروں پر احسان ہی کرتے پایا۔ شیخ میرے دورِ حیات میں سب سے نمایاں تھے۔ ایک فرد بھی نظر نہ آیا، جوان سے طالب امداد ہو کر بامراد نہ پلٹا ہو اور میری شعر شاعری کو تو پالنے والے وہی تھے۔ حوصلہ افزائی نہ فرماتے تو نئی طرزِ سخن سرائی کی پاداش مجھے آغاز میں ہی لاش بنا دیتی۔ مجھے تو اب شاید ہی ایسا بے لوث محسن نظر آئے۔

۱۹۵۰ء

ماتمِ مرگِ عزیزاں مرا آغازِ حیات
تا بہ انجام اِسی دھن پہ رہا سازِ حیات
سفرِ زیست کی مدت اِنھی راہوں میں کٹی
عمر آہوں میں کٹی واہ رے اندازِ حیات

میں سمجھتا تھا کہ اب زد سے نکل آیا ہوں
مرگِ احباب کی سرحد سے نکل آیا ہوں
تھی یہ تدبیر، نیا تیر نہ کھاؤں گا کوئی
ہر مقامِ خبرِ بد سے نکل آیا ہوں

تھی اگر میرے مقدر کو مجھی سے پرخاش
ساری دنیا کو مرے ساتھ ملی کیوں پاداش
دامنِ شیخ سے وابستہ میں تنہا تو نہ تھا
موت پتھرائی ہوئی آنکھ نہ ہوتی اے کاش

اے قضا کون سی محفل میں وہ مطلوب نہ تھا
اُس کا اندازِ مروّت کسے مرغوب نہ تھا
مجھ سے پرخاش سہی سارے جہاں سے تو نہ تھی
ایک میرا ہی اکیلے کا وہ محبوب نہ تھا

اس کا دیدار تھا آنکھوں کے لیے صبحِ امید
سرد مہری کے دھندلکے میں طلوعِ خورشید
وہ مدارات و عنایات کہ شایانِ ہنر
وہ ملاقات کہ اربابِ کمالات کی عید

اُس کی رفتار سے مامون رہی مورِ ضعیف
اُس کی گفتار سے پائی نہ کسی نے تکلیف
معتقد جلوتِ انوار کا ہر مردِ خدا
معترف خوبیٔ کردار کا ہر فردِ شریف

خُلق باقی نہ رہا خلقِ خدا روتی ہے
رسمِ اخلاص مٹی چشمِ وفا روتی ہے
ڈھونڈتی پھرتی ہے اک بندۂ تسلیم و رضا
پردۂ راز میں چھپ چھپ کے قضا روتی ہے

دیدہ و دل کے لیے صبر کا یارا نہ رہا
ہم کسی کے نہ رہے کوئی ہمارا نہ رہا
تھا وہی ایک سہارا جو دیا تھا تو نے
اے خدا آج وہی ایک سہارا نہ رہا

شیخ کا مرثیہ کہنے کی مجھے تاب نہیں
درد کو فرصتِ پابندیِ آداب نہیں
غالباً خواب میں ہوں خوابِ پریشاں ہی سہی
دوستو رحم کرو ...... یہ نہ کہو خواب نہیں

میں یہ سمجھا تھا کہ پیمانہ ہے لبریز مرا
دوسروں سے ہے قدم سوئے عدم تیز مرا
آج معلوم ہوا ، سست ہے رفتار مری
بار ہے مجھ پہ وجودِ الم انگیز مرا

آج معلوم ہوا ، راہ ابھی باقی ہے
منزلِ غم مرے اللہ ابھی باقی ہے
باش ، او مرحلۂ جاں سے گزرنے والے
صد نیا صدمۂ جانکاہ ابھی باقی ہے

تیر وہ آ کے لگا ہے جو کماں میں تو نہ تھا
قدر انداز کی چشمِ نگراں میں تو نہ تھا
ہائے یہ رگ تو کہیں دل نے چھپا رکھی تھی
ہائے یہ زخم مرے وہم و گماں میں تو نہ تھا

آہ یہ دور کہ فریاد کی بھی تاب نہیں
آہ یہ جسمِ ضعیف ، آہ میری جانِ حزیں
کوہِ اندوہ کہاں ، یہ تو فلک ٹوٹ پڑا
قصرِ اخلاص و وفا ہو گیا پیوند زمیں

کس اشارے سے یہ فرمان ہوا ہے صادر
چھن لیا کس نے یہی ایک وجودِ نادر
نقشِ کامل سے کیا دیدہ وروں کو محروم
دستِ قدرت ترا شہکار تھا عبدالقادر

ہاں وہ رکھتا تھا مرے حال پہ شفقت کی نگاہ
ہاں وہی میرا مربی تھا ، وہی درد آگاہ
وہی آغوش مرا گوشۂ تسکیں تھا حفیظ
وہی دامن تھا وہی در تھا مری جائے پناہ

محسنِ زبانِ پاکستان

ہاں تجھے جانا ہی تھا اے شیخ اے عالی نہاد
تا بہ کے تو دیکھتا بغض و حسد شر و فساد
تو جہاں میں اہلِ ایماں کا سپہ سالار تھا
عمر بھر تو نے کیا تیغِ تحمل سے جہاد
مسلکِ ہر دوست دشمن پر ترا یہ قول تھا
اپنی اپنی مصلحت ہے اپنا اپنا اعتقاد
اپنی ملت سے تجھے امید تھی توحید کی!
لیکن اس نے تفرقے ہی میں رکھا (ہے)[1] اِتحاد
خدمت و اصلاح میں گزری ہے تیری زندگی
جز خدائے پاک لیکن کون دے سکتا ہے داد
رُوحِ پاکستان جب تک زندہ ہے پائندہ ہے!
دِیدہ و دل میں رہے گی تیرے احسانوں کی یاد
جس زباں کو درسِ قرآں کیلئے آساں کیا
ہے وہ اُردُوئے معلّٰی پاک ملت کی مراد

---

[1] قیاسی اضافہ۔ (مرتب)

عطاء اللہ شاہ بخاری

برطانوی سیاست وثقافت کے خلاف ہم سب مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے والے بے مثال خطیب اور مجاہد سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی آواز ہر آن میرے ایمان میں شامل ہے۔

پرانے لشکرِ اسلام کے بچھڑے ہوئے غازی
ترے دم سے ہے قائم سرفروشی اور سربازی

تیری صورت سے مردانِ خدا کی یاد تازہ ہے
غلامانِ محمد مصطفیٰؐ کی یاد تازہ ہے

تیری سیرت سے عابد اور زاہد یاد آتے ہیں
بصیرت سے مدبر اور مجاہد یاد آتے ہیں

وہ شعلہ جس سے داغِ عشق کی گرمی ہویدا ہے
تری صورت سے ظاہر ہے تری سیرت سے پیدا ہے

صداقت ڈھونڈتا ہوں جب فداکاری کی راہوں میں
تری تصویر پھرتی ہے تصور کی نگاہوں میں

مرے دل میں یہ شمع قوم کا پروانہ زندہ ہے
حسینؓ ابن علیؓ کا اسوۂ مردانہ زندہ ہے

پاکستانی ترانہ اور عدالت عالیہ

''عطیہ'' نہیں فیصلہ ہے

زہے فیصلہ گاہ ، عدلِ وطن کی — ضیا صبحِ انوار ہے انجمن کی
قلمداں عطیہ نہیں ، فیصلہ ہے — ہوئی مستند قدر اہلِ سخن کی
ہوا آج ثابت کہ بدلا زمانہ — ترانے کی تصدیق ہے قدر فن کی
یہ اہلِ قلم یہ ادیب اور شاعر — کہ جنکی نگارش ہے جنت مُدُن کی
یہ فنکار و نقادِ فن ، یہ مصنف — بنا جن کا اقبال ہے اس وطن کی
فلاکت پہ جن کی ہنسے اہلِ ثروت — اُڑیں پھبتیاں جن پہ دیوانہ پن کی
یہ غیرت کے پیکر تھے لوگ ان کو سمجھے — نکمے ، نکھٹو ، سڑی اور سنکی
یہ عالی عدالت کا ہے حرفِ آخر — کہ ان صورتوں میں ہے سیرت ذہن کی
یہی لوگ ہیں جن کے خونِ جگر سے — بہاریں ہیں رنگین صحنِ چمن کی
یہ چاہیں تو بگڑی ہوئی کو بنا دیں — شکستہ کڑی جوڑ دیں جان و تن کی
یہ چاہیں تو آنکھوں سے پردے اٹھا دیں — عیاں شکل ہو رہبر و راہزن کی

زباں سے کہیں اور دلوں پر بٹھا دیں وہ سکہ ضرورت ہے جس کے چلن کی
ذرا احترام ان کا ملحوظ رکھیے ذرا کھلنے دیجے کلی ان کے من کی
مگن ہیں یہ سب حسن کاری کی دُھن میں تمنا نہیں ان کو مال اور دھن کی
یہ بگڑے ہوؤں کی سنواریں گے صورت اُبھاریں گے سیرت شریفانہ پن کی

عدالت میں ہوں ورنہ اس دورِ دُوں میں
کہاں تاب تھی مجھ کو عرضِ سخن کی

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

پچاس برس زندگی گزار لینے کی جوبلی ۱۹۵۰ء، پاکستان کے فوجی اور شہری قدر دانوں نے منائی۔ ایک مدت خود اپنے پرانے طرزِ سخن سے ابا کرتا ہوا شجاعتِ افواج اور ثقافت شہری کو مخاطب کر رہا تھا بریگیڈیر گلزار اور سید ضمیر جعفری کا حکم تھا کہ اپنے پرانے فنِ شعر کا راولپنڈی کے میدان میں امتحان دوں۔ اساتذہ، شعراء حتیٰ کہ جناب سالک و تاثیر جیسے نقادانِ فن ممتحن تھے اور حضرت مشتاق گرمانی ایسے ادیب و سخن فہم منصف، میں نہیں جانتا کہ آج اس وقت کی سخن فہمی ایسی نظم کے فنی خوب و عیوب پر کیا فرمائے؟

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ
سرِ راہ گاتے ہوئے اِک ترانہ
قدم با قدم اور شانہ بشانہ
نہ جانے کہاں سے ہوئے تھے روانہ
کوئی مبتدا تھے خبر کو چلے تھے
کہ حرفِ دُعا تھے اثر کو چلے تھے
فقط سیر تھی یا سفر کو چلے تھے
نہیں جانتے تھے کدھر کو چلے تھے
چلے جا رہے تھے مگر والہانہ
لگاتے ہوئے نعرۂ عاشقانہ

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ
نظر باز تھے اور جلوؤں کے عادی
لیے پھر رہی تھی ہمیں خوش ارادی
جہاں بزم آرا تھے کہسار و وادی

مگر حسنِ فطرت کے رنگیں نظارے　　سخن کی نگاہِ تغافل کے مارے
اُداس اور افسردہ سارے کے سارے　　بڑی دیر سے منتظر تھے ہمارے
ہم آئے تو ان سب نے مل کر صدا دی　　حفیظ اس طرف یہ ہے تصویر خانہ
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ
کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ　　کھلنڈرے تھے خود بھی کھلنڈرا ہی فن تھا
یہ آدم کا گم کردہ باغِ عدن تھا　　کہ حوّا کا فردوسِ طفلانہ پن تھا
ہمیں مل گیا ایک اُستاد کامل　　تصور کہ تھا نقش بندی کا حامل
عمل جب کا سیکھا بنے ہم بھی عامل　　ہوئے اب تو قدرت کے کھیلوں میں شامل
یہی ایک مدت ہمارا چلن تھا　　چلاتے رہے قدرتی کارخانہ
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ
کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ　　بہر رنگ تھے حسنِ فطرت کے شیدا
یہ شب کی سیاہی سحر کا سپیدا　　بیک وقت ہم کر رہے تھے ہویدا
ہنر کار بازارِ صنعت میں گھومے　　خیالوں میں لہرائے خوابوں میں جھومے
بہ فکر "جھولے" بہ وصفِ "ظلومے"　　نہ پوچھو کہ نقشِ قدم کس کے چومے
مگر کر لیا دستِ تخلیق پیدا　　ملا احسن الخالقیں کا خزانہ
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ
کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ　　پرانے گرو "عشق جی" کے تھے چیلے
مگر ہم نے خود بھی نئے کھیل کھیلے　　ندی میں لگائے ستاروں کے میلے

دل و دیدہ پابند آزادیوں کے
گرفتار خوابوں کی شہزادیوں کے

بہت شوخ و بیباک تھیں اپنی چالیں
یہاں عرض ہیں آج چنداک مثالیں

مثالیں کہ منہ بولتی مورتیں ہیں
پرانے جھروکے، نئی صورتیں ہیں

یہ شکلیں ہیں کچھ پیارے پیارے اشارے
ذرا دیکھنا رنگ کیا تھے ہمارے

کہیں خشک پتوں میں جا کر کھڑکنا
کہیں کونپلوں کے دلوں میں دھڑکنا

کہیں کاہ میں مثلِ شعلہ بھڑکنا
کہیں کوہ پر رعد بن کر کڑکنا

کہیں قبضۂ گل میں شمشیر دینا
کہیں پتھروں کے جگر چیر دینا

اگر کوہکن کو جوئے شیر دینا
تو پھر پیر زن کو بھی تزویر دینا

اُجالے گھروں میں اندھیرا دکھانا
ہواؤں کا سایہ گھنیرا بنانا

خلا میں نگاہوں کا ڈیرا لگانا
کھلی دوپہر کو سویرا بتانا

کبھی شاخساروں سے مل جل کے گانا
کبھی اُن کی سارنگیاں توڑ جانا

کبھی ابرِ لطف و کرم بن کے آنا
کبھی برفباری کے طوفاں اُٹھانا

کہیں چھپ کے غنچوں کی خوشبو چرانا
کلی کی طبیعت کہیں گدگدانا

کفِ گل سے شبنم کے موتی گرانا
سرِ برگ تھالی پہ تالی بجانا

فضا پر ہماری عمل داریاں تھیں
فسوں سازیاں شعبدہ کاریاں تھیں

اگر مہرباں تھے تو گلکاریاں تھیں
اگر قہرماں تھے ستم گاریاں تھیں

ہماری یہ ساری ترنگیں تھی سادی
نہ فطرت فسادی نہ ہم تھے فسادی

جہاں ہم نے جو شکل چاہی بنادی
سخن دوست کے گھر میں شادی رچادی

غزل، زمزمہ، گیت، نغمہ ترانہ
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ — یہ سمجھے تھے دنیا اسی راہ پر ہے
بنائے نظر مہر پر ماہ پر ہے — ہنر کہکشاں کی گزرگاہ پر ہے
اچانک کہیں سے کسی نے پکارا — اجی تہ کرو یہ بساطِ نظارا
کہ دریائے غم منتظر ہے تمھارا — کروگے یہاں سے کہاں تک کنارا
بشر کی بقا اشک پر آہ پر ہے — یہ آواز تھی درد کا تازیانہ

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ — چلے اب بلندی سے پستی کی جانب
خراباتِ پندار و مستی کی جانب — زبردستی و زیردستی کی جانب
قدم لڑکھڑاتے ہوئے جا رہے تھے — دہن پریت کے گیت ہی گا رہے تھے
فضا میں دھوئیں تو نظر آ رہے تھے — مگر دل کو یہ کہہ کے بہلا رہے تھے
چلے ہو میاں اپنی بستی کی جانب — وہاں بھی خوشی کے یہ نغمے سنانا

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ — اُتر آئے تھے جب سرِ کوہ سے ہم
نہ تھے آشنا رنج و اندوہ سے ہم — نہ تھے باخبر لوبھ سے موہ سے ہم
اُمیدوں کے گُن ہم کو گانے کی دُھن تھی — غم و رنج و کلفت مٹانے کی دُھن تھی
نئے گیت سب کو سنانے کی دُھن تھی — مشقت کو راحت بنانے کی دُھن تھی
گزرتے گئے ایک انبوہ سے ہم — یہ انبوہ تھا قلزم بے کرانہ

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ نرے اجنبی تھے پرانے جہاں میں
ہمیں شوق یہ تھا کہ دورِ خزاں میں بہار آفرینی کریں گلستاں میں
یہ دعویٰ مرا کوئی مانے نہ مانے زیاں کار سمجھے کہ دیوانہ جانے
بڑھے ہم زمیں پر شگوفے کھلانے ہوا پر اُڑے بادلوں کو سجانے
ستارے چلے ٹانکنے آسماں میں دکھانے لگے معجزے شاعرانہ

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ کڑی منزلوں اور راہوں سے گزرے
فقیروں سے اور بادشاہوں سے گزرے یہ دونوں ہماری نگاہوں سے گزرے
صدا دی سخن آشناؤں کے در پر گدائی کو پہنچے گداؤں کے در پر
اَدب سے جھکے بے نواؤں کے در پر رُکے ہم نہ فرمانرواؤں کے در پر
اکڑتے ہوئے بارگاہوں سے گزرے دکھاتے ہوئے غصۂ باغیانہ

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ سناتے پھرے زندگی کے ترانے
نئے گیت گانے، سہانے سہانے لٹا دی وہ دولت جو دی تھی خدا نے
دلِ بے زباں پر اثر تھا بلا کا جہاں دل نہ تھا، شور تھا واہ وا کا
یہ کیا شور ہے جس گھڑی ہم نے تاکا تو ہم کو نظر آ گیا رُخ ہوا کا
کہ اہلِ زباں اہلِ دل سے ہیں سیانے کہ یہ واہ وا ہے بڑی ناقدانہ

پا بہ زنجیر!

(ریڈیو سٹیشن راولپنڈی کے آغاز پر حفیظ کی افتتاحی آواز)

ہاں بِسْمِ اللّٰہ اَے بادِ صبا، نیرنگِ پرِ پرواز دِکھا
پابندی کی آواز سنا — آزادی کے انداز دِکھا
ہم آدم زادوں نے آخر اِک اور نرالا کام کیا
تو فطرت کی آوارہ پری تھی تجھ کو زیرِ دام کیا
ہاں بیشک آدم زاد سے تیری رَسم و راہ پرانی ہے
افسانہ تیری ہوا خواہی کا ...... اِک دلچسپ کہانی ہے
تو حسن وعشق کے جھگڑوں میں عشاق کی جانبدار رہی
مشاطگی و جاسوسی کی ہر خدمت پر تیار رہی
اس جنگ میں ہجر کے ماروں کی پیغامبری تھا کام ترا
عاشق کے لبوں پر یاد تری شاعر کی زبان پر نام ترا
تو کوئے زُلفِ یار میں اکثر آیا جایا کرتی تھی
آشفتہ مزاجوں کے دِل کی اُلجھن سلجھایا کرتی تھی
جو اپنے دِل سے اپنے دِل کا درد نہیں کہہ سکتا تھا
وہ ہر دلدادہ دُور اُفتادہ تیری راہیں تکتا تھا

اُس دَور میں نالۂ دل کی لے کچھ مدھم مدھم ہوتی تھی
طوفان تو اکثر اُٹھتے تھے ساحل کو خبر کم ہوتی تھی
تو لہراتی تھی کانوں میں دِل جھومتے تھے ارمانوں میں
یوں راز و نیاز پہنچ جاتے تھے ناز کے خلوت خانوں میں
اے بادِ صبا اُس دور میں تیرے ناز اُٹھائے جاتے تھے
سو منت سے تیرے جھونکے ہمراز بنائے جاتے تھے
اَب اور زمانہ آیا ہے - اب عشق و ہوس میں فرق نہیں
ہم بزم ہیں دونوں — پروانے میں اور مگس میں فرق نہیں
اَب حسن کی خلوت جلوت ہے پیغاموں کی بھرماریں ہیں
اب نالہ ہو یا نغمہ ہو پازیبوں کی جھنکاریں ہیں
اب بلبل بھی اور جھینگر بھی اِک ساتھ بٹھائے جاتے ہیں
اب نغمہ ہو یا نوحہ — دونوں ساز پہ گائے جاتے ہیں
اَب جلوہ گاہیں عام نگاہوں سے کچھ ایسی دُور نہیں
اب عشق بھی وہ مجبور نہیں — اب حسن بھی وہ مغرور نہیں
سب چھوٹے بڑے آج مساوی ہیں — اب مور و سلیماں ایک ہوئے
اَب کوئی بھی تفریق نہیں ہے، انساں انساں ایک ہوئے
اے بادِ صبا اَب تیرے لیے اسرافِ سخن کچھ فرض نہیں
اَب تو مقروض ہے یاروں کی تیرا تو کسی پر قرض نہیں

تسخیرِ جنوں پرور نے ہوا کو باندھ لیا زنجیروں میں
تو آلہ کار بنی ہے قومی مصلحتوں تدبیروں میں
اے بادِ صبا اَب موج تری کرتی ہے رَقص اشاروں پر
اَب کوئی بھی احسان نہیں ہے تیرا ہجر کے ماروں پر
آسودگیِ ہجراں کے لیے اَب طرفہ ذریعہ حاصل ہے
اِک ننھے سے صندوق میں دل جب چاہے دِل سے واصل ہے
اَب وقتِ معین پر تجھ کو پردے سے نکالا جاتا ہے
کانوں میں روشنی آتی ہے اور دِل کا اُجالا جاتا ہے
پیرانِ مغاں کی کثرت سے یہ رسم ہے اَب میخانے کی
ہو جنبشِ لب یا موجِ صبا — پابند رہے پیمانے کی
معیارِ سخن ہے خوب یہاں منہ ناپ کے کھولا جاتا ہے
آوازیں تولی جاتی ہیں — اشعار کو رولا جاتا ہے
یہ شیشہ گری کی باتیں ہیں اے بادِ صبا کیوں حیراں ہے
آزادیِ اِنساں کا نغمہ پابندِ مفادِ انساں ہے
ہاں دُشمِ اللہ اَے بادِ صبا ...... نیزنگِ پرِ پرواز دِکھا
پابندی کی آواز سنا — آزادی کے انداز دِکھا

سات تاریخی شیر

مئی ۱۹۵۶ء: جہلم، حفیظ بیمار، چوہان میڈیکل تیمار دار۔ سعید قریشی ڈپٹی کمشنر کی طرف سے ہدیہ عیدِ اضحیٰ سات عدد شکار۔ شکریہ۔ یہ سات اشعار قافیہ دار۔

جہلم کے شہر یار نے بھجوائے سات شیر
ہم قافیہ یہ شیر تھے سب صف شکن بٹیر

بھیجے گئے تھے میری حفاظت کے واسطے
آپس میں لڑتے بھڑتے زبر ہو رہے تھے زیر

یہ سات شیر ذبح ہوئے قتل گاہ میں
شاعر اُٹھا مدد کو مگر ہو چکی تھی دیر

ہنڈیا میں پک رہے تھے بقرعید کے شہید
اضحیٰ کے روز بھی مری دُنیا میں تھا اندھیر

ساتوں جوان دین پہ قربان ہوگئے
دیندار اُن کو کھا کے بھی لیکن ہوئے نہ سیر

مجھ کو بھی اک ملا یہ علالت کو دیکھیے!
ہے سوء ہضم میرے مقدر کا ہیر پھیر

اندھیرے اُجالے

جہلم مرزا آپٹیکل ہسپتال
آنکھ کا آپریشن

جز خدا کوئی نہیں تیمار دار
جز محمدؐ کون ہو پرسانِ حال

یہ جراحت بہرِ بینائی مری
ہے اندھیروں سے اُجالے کا سوال

میری شہرت آج ہے سوئی ہوئی
میں اِسے خود ہی جگاؤں کیا مجال

منتیں کرکے سلایا تھا اِسے
اس پہ بیداری کا طاری تھا وبال

اک جھلنگے پر ہوں اب لیٹا ہوا
یہ ہے میری زندگانی کا مآل

(۱۹۶۸ء)

اِک دن ہم بھی جیتیں گے

ہر گلی کوچے میں اندھا فقیر اور اس کے بچے ڈفلی پر گاتے سنے جا رہے ہیں

اِک دِن ، اِک دِن اِک دِن ، اِک دِن
اِک دن ہم بھی جیتیں گے

ہم ہیں بازی ہارنے والے جان وطن پر وارنے والے
آج تو بیشک جیت گئے ہیں ہم کو بھوکا مارنے والے
لیکن اِک دن
اِک دِن ہم بھی جیتیں گے

جیت کی دنیا رنگ برنگی ہار کی دُنیا بھوکی ننگی
جیت کی توندیں موٹی موٹی ہار نہ پائے سوکھی روٹی
لیکن اِک دن
اِک دن ہم بھی جیتیں گے

شہری لہری زنخے

(برسرِ عام)

ناچ نچائے پیسہ، ہائے پیسہ

گھر میں دیا کیسے جلے کام نہ بن پیسے چلے
کولھے مٹکیں ، بازو جھٹکیں
پاؤں ناچیں، ہاتھوں میں آئے پیسہ

ناچ نچائے پیسہ ، ہائے پیسہ

کوئی جئے ، کوئی مرے ناچ کرے پیٹ بھرے
شرم ورم دُور کرو ناچنا منظور کرو
ہائے پیسہ وائے پیسہ گھنگرو چھن چھنائے پیسہ

ناچ نچائے پیسہ ، ہائے پیسہ

جیتنا بھی ہار گئے! ڈوبی ناؤ پار لگے
پیسے کے ہیں کھیل سارے میلے کا ہے میل پیارے
روٹی دلوائے پیسہ زیور پہنائے پیسہ!

ناچنا سکھلائے پیسہ ، ہائے پیسہ[1]

---

[1] غالباً یہ نظم عروضی آہنگ کی بجائے موسیقی کی دُھن کے لیے موزوں ہے۔ (مرتب)

ہر سخنور تنہا......!!

صورتِ شمعِ انجمن تنہا
ہر سخنور ہے ایک تن' تنہا
درمیانِ ہجومِ مسخرگاں
ایک ہی شعلۂ دہن تنہا
گنبدِ لاجورد کے اندر
ایک ہی فرد نعرہ زن تنہا
عُجب و پندارو ماومن کے خلاف
گونجتا ہے یہی سخن تنہا!
دیکھتا ہے یہی چمن پہ محیط
دامِ صیادِ پُر فتن تنہا!
نگراں ہے کہ ان گنت رہبر
اور اِن سب کا راہزن تنہا
لبِ شیریں بروئے سنگ دِلاں
خامہ در دستِ کوہکن تنہا

ناتمام افسانے

یہ نظم ڈاکٹر تاثیر (پی ایچ ڈی) کا مرثیہ ہی نہیں ایک نابغۂ روزگار کا قصہ ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں مشترکہ دوست کو اس لیے خطاب کیا گیا تھا کہ تاثیر کے بعد اسلامیہ کالج کی پرنسپلی انھی کو ملی تھی —— سنا ہے اب تک تاثیر کی جدائی کا ذکر کر لیتے ہیں۔ تاثیر متعدد زبانوں پر حاوی مانا ہوا منفرد مبصر ادب و سخن، نقادِ فن تھا۔ ایسا نثر نگار کہ ہر موضوعِ حیات پر قادر، نومشقوں کو اپنے آغوشِ ادب میں پالنے، بڑھانے اور ترقی کی راہیں دکھانے والا، لیکن چونکہ ترقی دوست تھا اشترا کی نہ تھا لہٰذا اُسی کی آستین میں کینچلی بدلنے والے سانپوں نے اسے ڈس لیا۔ اور کہا: Just Liguidated

اے رفیقِ شفیق ہم عصراں | میرے پیارے حمید احمد خاں
یاد ہوگا تجھے کہ اک شب و روز | چند احباب تھے ترے مہماں
کرم آباد باغ اور بنگلہ | پر تکلف وسیع دستر خواں
ہم میں تاثیر بھی تھا اور بھی تھے | خوش مذاق اہلِ علم و فن و لساں
میں تو شاعر ہی تھا مگر تاثیر | نقد و حکمت کا بحرِ بے پایاں
مجھ میں اس میں تھے جو بھی راز و نیاز | وہ بہر حال و آئنہ تھے عیاں
ہم میں تھی نسبت عجیب و غریب | وہ ہمہ داں تھا اور میں ہیچ مداں
ہاں وہ گفت و شنید کا سیلاب | ہائے وہ قہقہوں کا اک طوفاں
اُس شب و روز سے کر اندازہ | یہ رفاقت تھی کتنی عالی شاں
اک زمانہ اسی روش پر تھے | ہم علَی الرَّغمِ جورِ دورِ زماں

ہم رہے دونوں ایک رُبع صدی ہمرہی میں دو قالب و یک جاں
یعنی ہر روز روزِ سوز و گداز یعنی ہر شب تھی اک شبِ خنداں
دو نگاہیں تھی ایک حسنِ خیال دو بیانوں میں ایک لطفِ زباں
حوصلے تھے بہت طویل طویل مختصر مختصر مگر ارماں
ایک تصویر میں نمایاں تھے لبِ خندان و دیدۂ گریاں
میں - شکایاتِ بندگانِ خدا وہ - حکایاتِ زلف و خالِ بتاں
زیرِ ترتیب اک فسانہ تھا خواب تھا جو کہ ہو رہا تھا بیاں
وہ فسانہ کہ ناتمام رہا! خواب بِتعبیر جس کی خوابِ گراں
جی رہا ہوں بہ زورِ آہ و فغاں چل رہا ہوں بہ نوکِ تیر و سناں
عمر ان مرحلوں سے گزرے گی بخدا یہ نہیں تھا وہم و گماں
میں اٹھاؤں گا میتِ تاثیر لے کے جاؤں گا سوئے قبرستاں
اپنے ہاتھوں سے یہ خزانہ بھی خاک کے ڈھیر میں کروں گا نہاں
دفن فرما کے لوٹ آؤں گا بہرِ شغل حیات و کارِ جہاں

یہ جنازہ ہے یا ہے عمرِ رواں واہ ری زندگی ترے احساں
سفر زیست کا ہے کیا مقصد کس طرف کو ہے کاروان رواں
مجھ کو اس بحث سے نہیں سروکار مجھ کو اس علم کا نہیں عرفاں
میں تو یہ جانتا ہوں ایک رفیق تھا مرے ساتھ ابھی عنان بہ عناں

عمر کی گھاٹیوں میں جس کے سبب
تھا سفر میں بھی سیر کا ساماں
ہو گیا ہے وہ ایک موڑ پہ گم
اور میں رہ گیا ہوں سرگرداں
راہ کی ہولناک ویرانی
نظر آتی ہے اور بھی ویراں
قافلہ بے نیاز و بے پروا
ہر قدم تیز، ہر نفس جولاں
لغزشِ پا ہے منزلِ مقصود
اک طرف کھائی ایک سمت کنواں!
کس سے پوچھوں کہاں گیا تاثیر
کوئی دیتا نہیں کسی کا نشاں!

کیا سمجھ لوں کہ وہ ہے خلد مکاں
یعنی لے آؤں موت پر ایماں
اور اک مرثیہ بھی لکھ ڈالوں
بہ تقاضائے شرطِ نوحہ گراں
ہاں اگر شرطِ دوستی ہے یہی
جب تو نرخِ وفا نہیں ہے گراں
مجھ کو معلوم ہے میں جانتا ہوں
کہ بظاہر یہی ہے رسمِ جہاں
قدم اپنے جمائے جاتے ہیں
روند کر نقشِ پائے راہرواں
نہ ملے جب سراغِ گم شدگاں
آخر کار کیا کرے انساں

لیکن اے دوست مل رہے ہیں ابھی
اس کی موجودگی کے مجھ کو نشاں
اک معمہ ہے جستجو میری
اس معمے کا حل نہیں آساں
وہ نہیں ہے تو غم کے بادل میں
کون ہے برق کی طرح رقصاں
اس کی بے باک شوخیوں کے رنگ
چشمِ احباب سے نہیں پنہاں

وہ اگر ہے یہیں کہیں تو مجھے — اس کی پھبتی سے پھر پناہ کہاں!
وہ کہے گا مری حماقت پر — بگڑا شاعر بنا ہے مرثیہ خواں!
اب اگرچہ برائے شعر و بیاں — ہے یہ لاہور شہرِ نا پرساں
تاہم اے آبروئے بزمِ کلام — مرگِ تاثیر کا نہ کر اعلاں
جسم اس کا سپردِ خاک سہی — رُوح آزاد پھر رہی ہے یہاں
میں اُسے دیکھتا ہوں چار طرف — اُسی انداز سے رواں و دواں
وہی رفتار ہے وہی گفتار — بے تکلف، شگفتہ و خنداں
کہیں چغتائی سے ہے گرمِ سخن — کہیں اسلم سے لڑ رہی ہے زباں
سالک و تاج سے بخاری سے — نوک جھوک اُس کی ہے بہار فشاں
کبھی حسرت سے چھیڑ خانی ہے — اور کبھی سوئے فیض فیض رساں
بحث میں منطقی دلائل سے — ہے بگردِ سعیدِ فلسفہ داں
چل رہا ہے نذیر کے ہمراہ — سوئے بارود خانہ شعلہ فشاں
کبھی صوفی کے گھر میں شام سے ہے — صبح تک شمعِ محفلِ رنداں
صبح سے شام تک بصورتِ مہر — وقفِ تابانی زمین و زماں
بر سرِ کار و بر سرِ پیکار — جون سی شکل پیش آئے جہاں
ہر کہ و مہ کی باریابی سے — مرکز زندگی ہے اس کا مکاں
ہے وہی اپنی درسگاہ کی روح — طلبہ اور اساتذہ کی جاں
اور کلیہ کی مجالس میں — ہے وہ ملی مفاد کا نگراں

محفلوں، مجلسوں، مشاعروں میں
وہی ممتاز ہے بعزت و شاں

مسندِ علم پر ہے شیخِ علوم
بزمِ رنداں میں ہے وہ پیرِ مغاں

کیا وہ تیرے سخن کا قائل ہے
کوئی پوچھے تو میں کہوں گا ہاں!

قلم اس کا ہے دوستوں کی سپر
دشمنوں کے لیے ہے تیغ و سناں

لکھ رہا ہے نئے نئے مضمون
بہرِ عز و وقارِ پاکستاں

تب و تابِ حیات کی خاطر
ہر زماں ہے وہ سلسلہ جنباں

سن رہا ہوں ہر ایک بیشے میں
گرج اُس کی مثالِ شیرِ ژیاں

اُس کے اہل وعیال اُس کے لیے
ہیں متاعِ سرور و اطمیناں

اُمِ سلمیٰ کا ہے وہ عاشقِ زار
جان صدقے ہے مال وزر قرباں

بخت کے تخت پر بہم دونوں
ہیں جہانگیرِ وقت و نورِ جہاں

اپنے بچوں کا ہے وہ ہم جولی
دِید اُن کی ہے عید کا ساماں

سلمیٰ و مریم اس کی دو آنکھیں
اور نورِ نظر ہے اک سلماں

کم سنوں سے ہے ہم سنی کا شوق
اپنے بچپن کا باندھتا ہے سماں

کھیل میں دھاندلی مچاتا ہے
چھیڑ کر جھوٹ موٹ ہے نالاں

ہم سنوں سے وہ زندگی کا کھیل
کھیلتا ہے بشیوۂ مرداں

وہ کھلاڑی بھی ہے کھلنڈرا بھی
کھیل ہی کا ہے اصل میں خواہاں

ہے ہمارے لیے یہ زیست مہم
اُس کے نزدیک بازیٔ طفلاں

کھیلتا ہے وہ کھیلنے کے لیے
عمل و قول سے بہر میداں

خارجِ از بحث اُس نے رکھی ہے　　فکرِ فتح و شکست و سود و زیاں
دیکھنا مسکرا رہا ہے یہ کون　　سن کے احباب کی چنیں و چناں
وُہی سادہ رخ و کشادہ جبیں　　وسعتِ قلب جن سے ہے تاباں
وہی ملبوس کرتہ و چادر　　وضع ، جیسے پڑھا لکھا دہقاں
وہی صوفے کی نیم مست نشست　　سامنے جس کے پست شانِ شہاں
نیم وا گوشۂ دہن ہے وہی　　پان خوردہ وہی لب و دنداں
زیرِ لب اِک شکن تمسخر کی　　جس میں سو سو شرارتیں پنہاں
وہی آنکھیں وہی شریر نگاہ　　آفتِ جاں بلائے بے درماں

نگراں کون ہے یہ میری طرف
ارے تاثیر ہی تو ہے نگراں

اِشاراتِ فتح خود شکستن

صحن مسجد کو جو پایا ''لہریوں'' کی عیش گاہ!
کفر نے اِسلام پر شبخون کی ڈالی نگاہ
''شہریے'' تھے نشہ میں' فوجی مگر ہشیار تھے
بت کدے پر یہ مجاہد ہی خدا کی مار تھے
غازیوں کا فاتحانہ نعرۂ هَلْ مِنْ مَّزِیْد
تھا اذانِ جَاهِدُوْا سے جلوۂ صبحِ اُمید
ہوش میں لاتی مگر کیوں وحدتِ ملت کی بات
سرخیاں گھیرے ہوئے تھیں لذتِ ذلت کی رات
ایک میلہ لگ رہا تھا لاف زن تھے چغد و بوم
کرگس وزاغ وزغن تھے اس اندھیرے کے نجوم
ارض خاکِ پاکِ مشرق سجدہ گاہِ اہل دیں!
پس رہی ہے دشمنوں کی ایڑیوں سے مہ جبیں

ارضِ مغرب پر ہے اب بخروں[1] کی ایسی دھوم دھام
ناچتے ہیں "واڈ کا" پیتے ہوئے سب خاص و عام
ہیں وہی اپنے جو اپنوں کو دغا دیتے ہیں آج
جن پہ تکیہ ہو وہی پتے ہوا دیتے ہیں آج

لیکن بقولِ اکبر ؎
اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اِتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

---

[1] دہن کی بدبو (مرتب)

بشارات

آیہ لَاتَقْنَطُوْا سے ہے بشارت ایک ذات
جو ہمیں اِن سرخ سانپوں سے دلائے گی نجات
مردِ مومن ، شاعرِ مشرق کا مقصودِ حیات
مصطفیٰؐ کا معجزہ مجموعۂ ذات و صفات
ہاں یہ رُوحِ پاک ، ہاں یہ جان پاکستان کی!
پھر جھلک ہم کو دکھائے گی اسی ایمان کی
قائداعظمؒ ہمارا یہ جواں ہمت یہ پیر
یہ ہمارے دور کا مشکل کشا یہ دستگیر!
برسرِ فرعون و ہاماں ضربِ ایمان قوی!
پھر ہمیں منزل پہ لائے گی اُسی کی پیروی
پھر جہادِ غازیانہ بازوئے اسلام کا
توڑ دے گا اشتراکی حوصلہ اصنام کا

اَرضِ پاکستان اُس منزل کا پہلا مرحلہ
جس کو سر کرنے کا دیتی ہے بشارت حوصلہ
سورۂ کوثر کا نصب العین ہے جس کو ملا
صاحبِ معراج کی راہوں پہ ہے وہ قافلہ
مَطْلَعُ الْاَنْوَارِ حیرت ہیں بشارات اے حفیظ!
دستِ غیرت میں ہیں سارے اختیارات اے حفیظ